ہے؟ حیوانی زندگی میں؟ جماداتی یا انسانی زندگی میں؟ یا مجتمعاً تمام نظام عالم کی زندگی میں یہ ارتقا کارفرما ہے؟ نیز اگر ہر بگاڑ سے ارتقائی اصلاح ظاہر ہوتی ہے تو پھر تو وہی بات ہوئی جو ہیگل نے (Thesis and Antithesis) اور ڈارون نے (Survival of the Fittest) میں پیش کی ہے۔ براہ کرم مدعا کی وضاحت کیجیے۔

جواب: جس ارتقا کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ ہیگل اور ڈارون دونوں کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ ہیگل تو تصورات اور خیالات کی نزاع کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسی نزاع کی بدولت تصورات کا ارتقا ہوتا ہے اور ڈارون حیات کے ارتقا کا ذکر کرتا ہے اور اس کے نزدیک یہ ارتقا تنازع للبقا (Struggle for Existance)، انتخاب طبعی (Natural Selection) اور بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے اصول سہ گانہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف میں نے آپ کی دریافت کردہ عبارت میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ قدرت الٰہی کم تر درجے کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کر کے بتدریج بلند تر درجے کی چیزیں پیدا کرتی رہی ہے۔ مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے، اس کے بعد نباتات، پھر حیوانات، اور حیوانات میں بھی کم تر درجے کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے، یہاں تک کہ بلند ترین نوع یعنی انسان کو پیدا کیا گیا۔ قدرت کا یہی قاعدہ اس عالم پر بحیثیت مجموعی بھی جاری ہونا چاہیے، یعنی موجودہ نظام عالم بحیثیت مجموعی ناقص ہے، لہٰذا اس کے بعد ایک دوسرا نظام عالم ہونا چاہیے جو اس سے کامل تر ہو، اور اسی نظام کا نام عالم آخرت ہے۔ گویا میرے نزدیک موجودہ نظام عالم کے بعد عالم آخرت کا آنا قدرت کے قانون ارتقا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۴ھ، جنوری فروری ۴۵ء)

.....☆☆☆.....

رسائل ومسائل

(اوّل)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۳۔ کورٹ سٹریٹ لوئر مال، لاہور
فون: +92-42-37248676-37320961

فہرست مضامین

عرضِ ناشر	9
دیباچہ	10
تفسیرِ آیات وتاویلِ احادیث	11
حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے متعلق چند سوالات	12
قرآنِ عربی پر غیر عرب کیوں ایمان لائیں؟	15
بعثت سے پہلے انبیا کا تفکر	18
عصمت انبیا	20
ختمِ نبوت	21
علمِ غیب رُسل	24
دہریت و مادہ پرستی اور قرآن	26
لہٗ ما سلف کی تفسیر	28
اتباع علما و صلحا	29
قرآن وحدیث اور سائنٹیفک حقائق	31
تحقیق حدیثِ دجال	33
بہانہ جوئی کے لیے روایات کے سہارے	35
المہدی کی علامات اور نظامِ دین میں اس کی حیثیت	38
مسئلۂ مہدی	41
خلافت کے لیے قرشیت کی شرط	45
حضرت علیؓ کی امیدواریِ خلافت؟	49

فقہی مسائل 54

مہر غیر مؤجل کا حکم 55

بندوق کے شکار کی حلّت وحرمت 61

نظامِ کفر وفسق میں کسبِ معاش کی مشکل 67

رشوت اور خیانت کو حلال کرنے کے بہانے 68

رشوت اور خیانت کے متعلق چند مزید مسائل 72

پیشۂ وکالت اسلامی نقطۂ نظر سے 75

عالمانہ جاہلیت 76

کاسبِ حرام کے ساتھ معاشی تعلقات کے حدود 77

والدین کی مشتبہ جائداد اور کمائی سے استفادہ 77

الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے 78

امانت، قرض اور صلۂ رحمی 80

کنوز کا نصابِ زکوٰۃ 81

دارالکفر میں سود خواری 83

غیر محرم قریبی اعزہ سے پردے کی صورت 86

پردے کے متعلق چند عملی سوالات 87

رسموں کی شریعت 92

لباس اور چہرے کی شرعی وضع 98

ڈاڑھی کے متعلق ایک سوال 99

ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ 102

فوٹو کا مسئلہ 104

نواقضِ وضو 107

آلات کے ذریعے توالد وتناسل 109

مشینی امامت 111

اسلام اور آلاتِ موسیقی 112

عذرِ مجبوری کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت 114

خدا کے حضور دعا میں ہاتھ اٹھانا 115

کرب کا علاج بذریعہ موت 116

سفر میں قصرِ صلوٰۃ 117

ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ 118

جبری امتناع کی صورت میں مباحات کا وجوب 120

تزکیۂ نفس کی حقیقت 121

الکوہل آمیز ادویہ کا استعمال 123

راجا کی غائبانہ سلامی 124

غیر حکیمانہ تبلیغ 125

خلافیات 127

تقلید وعدمِ تقلید 128

وہابی اور وہابیت 129

مذہبِ حنفی اور حدیث 130

حدیث کی تدوینِ جدید 132

کیا ایک فقہی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا گناہ ہے؟ 133

کس قسم کا اجماع حجت ہے؟ 133

فرقہ بندی کے معنی 134

فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کی علیحدگی 135

اختلافی مسائل پر امّت سازی کا فتنہ 138

دو شبہات 145

حدیث اور فقہ 148

تجریحات اسلامی نظامِ جماعت میں آزادی تحقیق 152

احادیث کی تحقیق میں اسناد اور تفقہ کا دخل 154

جزئیاتِ شرع اور مقتضیاتِ دین 159

سنت اور عادت کا اصولی فرق 168

عام مسائل: 173

مفتوح فاتح کی عدالت میں 174

میدانِ جنگ میں قحبہ گری کے انتظامات 176

ایک ہندو دوست کا خط اور اس کا جواب 181

گائے، تناسخ اور گرنتھ صاحب 187

علمِ ظاہر اور علمِ باطن 193

حبش پر مسلمانوں کے حملہ آور نہ ہونے کی وجہ 195

کائناتی ارتقا اور حیاتی ارتقا 195

معاشی مسائل: 197

سرکاری نرخ بندی پر چند سوالات 198

سرکاری نرخ بندی کے سلسلے میں مزید ایک سوال 201

بکری ٹیکس 202

مکانوں کے کرایوں میں بلیک مارکیٹنگ 204

اسلامی اصولوں پر بینکنگ کی ایک اسکیم 206

کاروبار میں اسلامی اصولِ اخلاق کا استعمال 210

چند کاروباری مسائل: 215

سرکاری نرخ پر خرید کر چور بازار میں بیچنا 215

نقد کی قیمت اور، ادھار کی اور 215

محصول سے بچنے کی کوشش 215

رشوت دینے کی مجبوری 216

آڑھت کے بعض ناجائز طریقے 217

زمین داری کے مکروہات 217

گڑیوں کا حکم 219

اشتہاری تصویریں 219

''سیپ'' اور دلّالی 220

تجارت میں ''عرف'' کی حیثیت 221

سیاسی مسائل: 222

اسلامی ریاست میں ذمی رعایا 223

مزید تصریحات 228

مسلم لیگ سے اختلاف کی نوعیت 236

مطالبۂ پاکستان 239

جماعتِ اسلامی اور صوبہ سرحد کا ریفرنڈم 241

حکومتِ الٰہیہ اور پاپائیت کا اصولی فرق 242

نظامِ کفر کی قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ 245

غیر اسلامی اسمبلیوں کی رکنیت اور نظامِ کفر کی ملازمت شرعی نقطۂ نظر سے 248

پُرامن انقلاب کا راستہ 250

ملک کے نظم و امن کی پاس داری 252

غیر اسلامی حکومت کے ذریعے سے زکوٰۃ کی تحصیل 253

جماعتِ اسلامی اوراس کی تحریک سے متعلق: 254

تحریکِ اقامتِ دین کے بارے میں چند سوالات 255

مخالفتیں اور مزاحمتیں 259

جذباتی اور غیر حکیمانہ تبلیغ 268

عملی اسلام سے اجتناب کا مشورہ 271

اسلام بلا جماعت! 273

جماعتِ اسلامی کے متعلق چند شبہات 274

ہمہ گیر ریاست میں تحریکِ اسلامی کا طریق کار 276

وقت کے سیاسی مسائل میں جماعتِ اسلامی کا مسلک 278

مزدوروں کی ہڑتالوں میں جماعت کی پالیسی 281

ملکی فسادات میں ہمارا فرض 282

قضیۂ فلسطین میں جماعت کا رویّہ 285

نظامِ اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب 286

.....☆☆☆.....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی دینی وعلمی بصیرت کا ہر شخص، خواہ وہ موافق ہو یا مخالف، معترف ہے۔ احکامِ اسلامی کو صحیح شکل اور صورت میں جدید حالات پر منطبق کرنے کی جو خداداد صلاحیت آپ کو حاصل ہے، اس کی مثال عصرِ حاضر میں مشکل سے ملے گی۔ اسلام کی روشنی میں زندگی کے نئے اور الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں آپ کا جو ممتاز مقام ہے وہ اہلِ علم ونظر سے مخفی نہیں۔

عالمِ اسلامی کے اس مایۂ ناز عالم کے رشحاتِ قلم کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرنے کا جو شرف ہم کو حاصل ہے، ہم اس پر فخر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں یہ سعادت بخشی ہے۔

زندگی کے مختلف مراحل پر اسلامی احکام کو جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ کتاب ایک بہترین رہنما ثابت ہوگی۔ اس میں ہر سوال کا تسلی اور اطمینان بخش جواب ملے گا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مختصر کتاب قارئین کو اس موضوع پر بہت سی ضخیم کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ اس کتاب کے اب تک ۴ حصے شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے کا یہ پہلا حصہ ہے جو ہم آفسٹ کی حسین طباعت پر اپنے روایتی اعلیٰ معیار پر پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین اس کو پسند فرمائیں گے۔

نیازمند

منیجنگ ڈائریکٹر

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور

لاہور ۹ رصفر ۱۳۸۸ھ

مطابق ۸ رمئی ۱۹۶۸ء

دیباچہ

پچھلے کئی سال میں رسائل ومسائل کے عنوان سے ترجمان القرآن میں لوگوں کے جو سوالات اور میرے جوابات شائع ہوتے رہے ہیں، ان کو اب فائدۂ عام کے لیے یک جا شائع کیا جارہا ہے۔ ان میں مختلف تمدنی، سیاسی، معاشی، علمی اور مذہبی مسائل پر ناظرین کو بکثرت ایسے سوالات کے مختصر اور دوٹوک جوابات مل جائیں گے، جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں کھٹکتے ہیں۔ بعض سوالات اور جوابات اس مجموعے میں ایسے بھی ہیں جو بظاہر قصۂ ماضی معلوم ہوتے ہیں، لیکن بہرحال ان کی ایک تاریخی قدر و قیمت بھی ہے اور علاوہ بریں ان میں بھی بہت سے ایسے اصولی مسائل کی توضیح ہوگئی ہے جن سے کبھی نہ کبھی کسی مسلمان آبادی کو سابقہ پیش آسکتا ہے۔

ہر مضمون کے اختتام پر اس کی تاریخ اشاعت درج کردی گئی ہے تاکہ لوگ اس کے تاریخی پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ لیکن تاریخِ اشاعت درج کرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مجموعے کا ہر مضمون ترجمان القرآن کے اس مضمون کی لفظ بہ لفظ نقل ہے جس کا حوالہ اس کے نیچے درج کیا گیا ہے۔ دراصل میں نے اس مواد کو ترتیب دیتے وقت جگہ جگہ عبارات میں ضروری اصلاحیں، ترمیمیں اور توضیحیں بھی کی ہیں اور بعض مقامات پر اضافے بھی کردیے ہیں۔

ابوالاعلیٰ

۱۱ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ

۲۰ دسمبر ۱۹۵۰ء

تفسیرِ آیات و تاویلِ احادیث

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے متعلق چند سوالات:

سوال: سیاسی کش مکش حصہ سوم میں صفحہ ۹۵ پر آپ لکھتے ہیں: ''پہلا جزیہ ہے کہ انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے، دعوت عام ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق چیزوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔'' کیا دعوتِ توحید کے ساتھ رہائی بنی اسرائیل کا مطالبہ جو حضرت موسیٰ نے کیا، غیر متعلق چیز نہ تھی؟

پھر آپ لکھتے ہیں: ''دوسرا جزیہ ہے کہ جتھا ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان بوجھ کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی واطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں۔'' کیا سب بنی اسرائیل ایسے ہی تھے؟ کیا ان کے اعمال سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے؟ کیا فرعون کے غرق ہونے سے پہلے ان میں سے کسی نے بھی دین موسوی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ حالاں کہ کسی سعی اور کش مکش کا پتا قرآن پاک سے نہیں چلتا جس کی بنا پر بنی اسرائیل کے لکھو کھہا آدمی تمام کے تمام مشرکانہ طاقتوں کے زیر دست رہنے کے باوجود ایک دم ایمان لے آئے ہوں۔ جو برتاؤ یہودیوں نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ کیا، وہی برتاؤ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اس زمانے کے کچھ بنی اسرائیل حکومت کی طاقت کو حرکت میں لا کر کر سکتے تھے اور اگر ان میں کچھ کافر تھے تو وہ فرعون کے ساتھ غرق ہوئے یا نہیں؟

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ۔

[طٰہٰ 94:20]

یہ حضرت ہارونؑ کا مقولہ ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ حالاں کہ حضرت مسیحؑ بنی اسرائیل ہی کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں لڑانے آیا ہوں۔

جواب: قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں میں جو قرآن مجید کے آخری حصے میں ملتی ہیں، یہ ذکر کیا جا چکا تھا کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو خدا کی بندگی قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ مثلاً سورۂ نازعات میں ارشاد ہوتا ہے:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ

فَتَخْشٰی [النازعات79:19-17]

اس میں رہائیِ بنی اسرائیل کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ بعد کی مکی سورتوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصبِ نبوت پر حضرت موسیٰؑ کے تقرر کے دو مقصد تھے: اوّل فرعون اور اس کی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دینا۔ دوسرے اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کرے تو پھر اس مسلمان قوم کو، جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے مسلمان چلی آ رہی تھی اور حضرت یوسفؑ کے بعد چار پانچ صدیوں کے دوران میں کسی وقت کفار سے مغلوب ہو کر رہ گئی تھی، کفار کے تسلّط سے نکالنے کی کوشش کرنا۔ حضرت موسیٰؑ نے پہلے مقصد کی طرف پہلے دعوت دی اور دوسرے مقصد کو بعد میں لیا۔ دوسرے مقصد کو پہلے مقصد سے غیر متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ مجھے نظر نہیں آتی۔ ہر نبی کے مشن کا دوسرا مرحلہ لازماً یہی ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اس کی دعوت کو رد کر دیا ہے، ان کے تسلّط سے اہلِ ایمان کو نکالنے کی کوشش کرے۔

آپ کا سوال کہ کیا سب بنی اسرائیل نے دینِ موسوی قبول کر لیا تھا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے خیال میں بنی اسرائیل غالباً کافر تھے، اور حضرت موسیٰؑ شاید پہلے شخص تھے جنہوں نے ان کو دینِ اسلام کی طرف دعوت دی۔ حالاں کہ فی الواقع صورتِ حال یہ نہ تھی۔ بنی اسرائیل تو تھے ہی پیغمبروں کی اولاد۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ ان کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ حضرت یوسفؑ بھی ان کے بزرگوں میں تھے۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے ان کے آخری نبی (حضرت یوسفؑ) کو گزرے ہوئے چار پانچ سو برس سے زیادہ نہ گزرے تھے۔ اس مدت میں وہ کافر نہیں ہو گئے تھے کہ ان کے کفر سے اسلام میں لانے کا کوئی سوال درپیش ہوتا، نہ ان میں موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا کوئی منکر تھا۔ البتہ ان کے اندر اتنا ضعف آ گیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں فرعون اور اس کی قوم کی طاقت سے تصادم کی جرأت کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے نوجوان تو حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے بڑی حد تک تیار ہو گئے تھے لیکن ان کے سن رسیدہ اور جہاں دیدہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے کے معنی اپنی دنیا کو تباہ کر لینے کے ہیں۔ قرآن مجید کے مطالعے سے اس حالت کا نقشہ بالکل صاف طور پر

سامنے آجاتا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: سورۂ اعراف رکوع ۱۵ و سورۂ یونس، رکوع ۹)۔ اس بات کا قرآن سے کہیں نشان نہیں ملتا کہ ان ضعیف الاعتقاد مسلمانوں میں سے کوئی عملاً فرعون کا ساتھ دے کر حضرت موسیٰؑ کی مخالفت کر رہا تھا[1]۔ بلکہ قرآن اور بائبل دونوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے مسلّم لیڈر بن گئے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر چلے تو ایک اسرائیلی بھی پیچھے نہ رہا۔

حضرت مسیحؑ کے زمانے میں جس تنزل کو بنی اسرائیل پہنچے، اس پر حضرت موسیٰؑ کے ہم عصر بنی اسرائیل کو قیاس کرنا درست نہیں۔ اگر اس وقت وہ اتنے سخت اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے کام کے لیے منتخب ہی نہ فرماتا۔

حضرت ہارونؑ نے جو کچھ حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا، اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے اصل لیڈر اور ان کے جماعتی نظام کے ذمہ دار حضرت موسیٰؑ تھے اور حضرت ہارونؑ ان کے مددگار کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کی غیر موجودگی میں حضرت ہارونؑ کسی غیر معمولی اہمیت رکھنے والے معاملے پر کوئی فیصلہ کن کارروائی کرتے ہوئے اس بنا پر ڈرتے تھے کہ کوئی ایسی بات ان سے نہ ہو جائے جو اصل ذمہ دار شخص کی پالیسی کے خلاف ہو۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے ان کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔

مسیحؑ کا جو قول آپ نے نقل کیا ہے، وہ بالکل دوسرے حالات سے متعلق ہے۔ اس وقت کوئی اسلامی نظامِ جماعت یہودیوں میں موجود نہیں تھا کہ حضرت مسیحؑ کے اس قول کو یہ معنی پہنائے جا سکیں کہ آپ اس نظام جماعت کو درہم برہم کرنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بخلاف اس کے حضرت ہارونؑ کے سامنے ایک مکمل اسلامی نظامِ جماعت موجود تھا اور وہ بجا طور پر اس امر میں احتیاط برت رہے تھے کہ کہیں ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو اس نظامِ جماعت کو درہم برہم کر دے۔ (ترجمان القرآن، رجب و شعبان ۶۲ھ، جولائی و اگست ۴۳ء)

---

[1] صرف ایک قارون اِس سے مستثنیٰ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں فرعون اور ہامان کے ساتھ کیا گیا ہے (المومن رکوع ۳)۔ لیکن اگر بائبل کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ شاید آخر کار اُس نے بھی مصر میں منافقانہ روش اختیار کر لی تھی، کیوں کہ حضرت موسیٰؑ کے خلاف اُس کے جس فتنے کا بائبل ذکر کرتی ہے، وہ مصر سے نکلنے کے بعد کا قصہ ہے۔

قرآنِ عربی پر غیر عرب کیوں ایمان لائیں:

سوال نمبر ۱: وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ [ابراھیم 4:14] پڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ ہماری اور ہمارے آباواجداد کی زبان عربی نہیں تھی۔ پھر قرآن کے عربی ہونے پر ہم کیوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے مکلّف ہیں؟

جواب: آپ کا مطلب غالباً یہ ہے کہ ہر قوم صرف اسی دعوت پر ایمان لانے کی مکلّف ہونی چاہیے جو اس کی اپنی زبان میں دی گئی ہو۔ دوسری کسی زبان میں آئی ہوئی دعوت، اگر چہ وہ حق ہو، اگر چہ وہ من جانب اللہ ہو، اگر چہ وہ ترجموں، تفسیروں، تشریحوں اور عملی نمونوں کے ذریعے سے آپ تک پہنچ جائے، پھر بھی وہ واجب الاتباع نہ ہونی چاہیے، کیوں کہ وہ آپ کی اپنی زبان میں نہیں بھیجی گئی ہے۔ اگر یہی آپ کا مطلب ہے تو یہ محض ایک غلط فہمی ہے جو مذکورۂ بالا آیت کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے پیدا ہوگئی ہے۔ آیت کا مقصد دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب کسی قوم میں کوئی رسول بھیجا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ رسول خاص اسی قوم کے لیے ہو یا تمام دنیا کے لیے، بہر حال اس نے اپنے اوّلین مخاطب لوگوں کو ان کی اپنی زبان ہی میں خطاب کیا ہے، تا کہ وہ اس کی بات کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور ان کو یہ حجت پیش کرنے کا موقع نہ ملے کہ ”زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم“۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر قوم کے لیے لازماً الگ ایک مستقل نبی ہی آنا چاہیے جو اس کو اس کی اپنی زبان ہی میں خطاب کرے۔ اور نہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ایک قوم کو دوسری قوم کے اہلِ ایمان اس کی اپنی زبان میں قابلِ فہم طریقے سے خدائی تعلیم پہنچا دیں، تب بھی وہ محض اس بنا پر اسے ردّ کر دینے میں حق بجانب ہو کہ نبی خود براہِ راست خدا کی کتاب اس کی زبان میں لے کر نہیں آیا ہے۔ یہ بات نہ اس آیت میں کہی گئی ہے اور نہ اس کے الفاظ میں ایسی کوئی گنجایش ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے۔ آخر کون سی معقول وجہ اس بات کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ جس شخص کو قرآن کی تعلیم کا لبِّ لباب اس کی مادری زبان میں واضح طور پر پہنچ گیا ہو، وہ اس پر ایمان نہ لانے میں حق بجانب ہو؟

سوال نمبر ۲: ایک سکھ دوست کو مطالعے کے لیے کچھ لٹریچر دیا گیا ہے۔ مطالعے کے دوران میں موصوف کی طرف سے یہ اعتراض سامنے آیا کہ تم کہتے ہو کہ خدا پیغمبروں سے کلام کرتا ہے اور

اس نے اپنے ان خاص بندوں کے ذریعے سے نوعِ انسانی کے لیے ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی بھیجا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنا اہم نظام ایک ایسی زبان میں کیوں پیش کیا گیا ہے جو ایک خاص خطۂ ارضی میں بولی جاتی ہے؟ کیوں نہ اس خدا نے جو قادرِ مطلق کہلاتا ہے، ایک ہمہ گیر زبان بنادی، تاکہ ہر کوئی اس کے کلام سے یکساں مستفید ہوتا؟ عربی قرآن شریف تو صرف عربوں ہی کے لیے مفید ہے۔

جواب: آپ کے جن سکھ دوست نے یہ اعتراض کیا ہے وہ اگر اپنے تخیل کو تھوڑی حرکت اور دیتے تو اس سے بڑھ کر وہ یہ سوال بھی کر سکتے تھے کہ قرآن کا ایک ایک نسخہ براہِ راست ایک ایک انسان کے پاس خدا نے کیوں نہ بھیجا؟ کیوں کہ جب وہ قادرِ مطلق ہے تو وہ ایسا بھی کر سکتا ہے[1]۔

دراصل یہ لوگ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں فرمایا ہے جس سے دنیا کے اس انتظام کو بدلنے کی ضرورت پیش آئے جو اپنی فطری رفتار پر چل رہا ہے۔ انسانوں میں زبان کا اختلاف اور اس بنا پر نوعِ انسانی میں چھوٹے اور بڑے حلقے بن جانا ایک فطری چیز ہے جو خود اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت کے تحت وجود میں آئی ہے اور اس میں بے شمار مصلحتیں ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اگر قادرِ مطلق ہے تو اس کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی سلطنت کا نظام اٹل قوانین پر چل رہا ہے۔ انھی قوانین کے تحت قوموں کی زبانوں اور ان کی روایات میں تنوع نمودار ہوتا ہے۔ اگر ''اس پرانٹو'' کی قسم کی کوئی زبان اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی جاتی تب بھی وہ نہ تو قوموں کی مادری زبان بن سکتی تھی، نہ اس کے ادب سے قلوب متاثر ہو سکتے تھے اور نہ لوگ اس کی ادبی نزاکتوں کو محسوس (Appreciate) کر سکتے تھے، الّا یہ کہ قوموں کی مادری زبانوں کو اللہ تعالیٰ فوق الفطری طریقے سے مٹا دیتا اور فوق الفطری طریقے ہی سے اس اسپرانٹو کو زبردستی تمام قوموں کی زبان بنا دیتا۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک کام اس کے دوسرے کام کو مٹانے کے لیے نہیں ہوتا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانی زبانوں کے سابق فطری نظام کو برقرار رکھتے ہوئے انسانوں کی ہدایت کا کام انجام دیا ہے۔

---

[1] یہ اعتراض بالکل اسی نوعیت کا ہے جیسے عہدِ قدیم کے کفار و مشرکین کہتے تھے کہ نبی اگر سچا ہے تو اُس کے ساتھ بڑے بڑے خزانے کیوں نہیں ہیں کہ آرام کی زندگی گزارے اور اپنی دعوت کو خوب پھیلا سکے، یا نبی انسان کیوں ہے اور انسانی ضروریات اور کمزوریاں کیوں رکھتا ہے۔ اُسے تو فرشتہ ہونا چاہیے اور فوق الفطری قوتوں سے اپنی تحریک کو پھیلانا چاہیے۔

یہ اعتراض کہ عربی میں قرآن شریف صرف عربوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے، اسی صورت میں صحیح ہوسکتا ہے جب کہ اللہ نے صرف اپنی کتاب نازل کی ہوتی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب کے ساتھ رہنما بھی پیدا کیا۔ اس رہنما نے پہلے انسانوں کی ایک قوم کو جس کی زبان میں کتاب نازل ہوئی تھی، خطاب فرمایا اور اس قوم کو تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعے سے اس نظام کے سانچے میں ڈھال دیا جو کتاب کے منشا کے مطابق تھا۔ پھر اس قوم کے سپرد یہ خدمت کی کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کو نبی کی قائم مقام بن کر اسی طرح خطاب کرے اور اسی طرح تعلیم، تزکیہ، عملی تربیت اور کامل اجتماعی انقلاب کے ذریعے سے اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے جس میں پہلے وہ خود ڈھالی گئی تھی۔ پھر جو جو قومیں اس طریقے سے اس اثر کو قبول کرتی جائیں، وہ دوسری قوموں کے لیے یہی خدمت انجام دیں۔ یہ اس تعلیم کو عام کرنے کی فطری راہ تھی اور دنیا میں جس تحریک نے بھی عالم گیر دعوت کا کام انجام دیا ہے، خواہ وہ خدا پرستانہ ہو یا کسی دوسری نوعیت کی، بہر حال اس نے فطرتاً یہی راہ اختیار کی ہے۔

اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جائے کہ کوئی کتاب صرف اسی قوم کے لیے مفید ہے جس کی زبان میں وہ لکھی گئی ہو تو پھر دنیا کی علمی تاریخ کو غلط تسلیم کرنا پڑے گا۔ پھر تو انسانی تصنیفات کو بھی زبانوں کے لحاظ سے قوموں کے لیے مخصوص کر دینا ہوگا، اور ترجمہ اور بین الاقوامی تبلیغ کے تمام دوسرے ذرائع کے فائدے سے انکار کر دینا ہوگا۔ حالاں کہ یہی چیزیں ہیں جن کے بَل پر بڑی بڑی تحریکوں کی دعوت اور بڑی بڑی انقلابی شخصیتوں کے پیغام دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلتے رہے ہیں۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ کتاب ہی نے کیا قصور کیا ہے کہ محض عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اسے عرب قوم کے لیے مخصوص اور محدود کر دیا جائے۔

اگر کوئی شخص اس چیز سے مطمئن نہ ہو اور برابر اپنے اس اصرار پر قائم رہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے اسی طرح اللہ کو کام کرنا چاہیے تھا، تو اسے اپنی رائے پر جمے رہنے کا اختیار حاصل ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسے ایسے سوالات کو سدِّ راہ بنا کر اگر ایک شخص ایک کتاب یا ایک پیغام سے استفادہ نہیں کرنا چاہتا تو نقصان کس کا ہے؟ یہ رویہ طالبانِ حق وصداقت کا نہیں ہوتا۔ وہ تو جگہ جگہ ٹوہ لگاتے پھرتے ہیں کہ سچائی کی روشنی کہاں ہے اور کہاں سے ملتی ہے۔ اگر آدمی دنیا کی ہر کتاب، ہر پیغام اور ہر تعلیم کے مقابلے میں دل ودماغ پر کسی نہ کسی قسم کا قفل چڑھا لے تو پھر وہ ایک قدم بھی زندگی

کی سیدھی راہ پر نہیں چل سکتا۔ (ترجمان القرآن، رجب، شوال ۶۴ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

بعثت سے پہلے انبیا کا تفکر:

سوال: آپ نے تفہیم القرآن میں سورۂ انعام کے رکوع ۹ سے تعلق رکھنے والے ایک توضیحی نوٹ میں لکھا ہے کہ:

''وہ (حضرت ابراہیمؑ) '' ھٰذَا رَبِّیْ کہنے سے شرک کے مرتکب نہیں ہوئے، کیوں کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھیرتا ہے، اصل اعتبار ان کا نہیں بلکہ اس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے۔''

سوال یہ ہے کہ اگر نبوت وہبی ہوتی تو حضرت ابراہیمؑ کو عام انسانوں کی طرح خدا کے الٰہ ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے میں شک اور تحقیق کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر انھوں نے عام انسانوں کی طرح دماغی کاوشوں اور منطق و فلسفہ ہی سے اللہ کی الوہیت کو پایا تو نبوت ایک کسبی معاملہ ہوا اور ایک فلاسفر اور نبی کے حصولِ علم میں کوئی فرق نہ ہوا۔

جواب: معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے وہبی ہونے کا مطلب نہیں سمجھا گیا، اسی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ نیز آیات الٰہی کے مشاہدے سے حق کی جستجو کرنا اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنا ایک دوسرے کا ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ چیز بھی سائل کے لیے غلط فہمی کی موجب ہوئی ہے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیا علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے، اس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزول وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ [الشوریٰ 52:42] ''تم کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔'' وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى [الضحیٰ 7:93] ''اور اللہ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا، پھر تمھیں راستہ بتایا۔''

اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیا علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے انھی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں، ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے

ہوتے تھے۔ وحی آ کر جو کچھ بھی کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا، اب انہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں، اور انہی صداقتوں کا عینی مشاہدہ کرا دیا جاتا تھا، تاکہ وہ پورے وثوق سے دنیا کے سامنے ان کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورۂ ہود میں بار بار بہ تکرار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے نبیؐ کے متعلق فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ۔ [هود11:17]

''پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے ربّ کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا۔ (یعنی عقلی وفطری ہدایت پر) اس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آ گیا (یعنی قرآن) اور اس سے پہلے موسیٰؑ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر موجود تھی (کیا وہ اس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے؟)''

پھر اس کے بعد یہی مضمون رکوع ۳ میں حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَ اٰتٰنِىْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ [هود11:28]

''اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے ربّ کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر تھا، اور اس کے بعد اس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی ونبوت) سے بھی نوازا، اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آتی، تو اب کیا ہم زبردستی اسے تمہارے سر چپیک دیں؟''

پھر اسی مضمون کو چھٹے رکوع میں حضرت صالحؑ اور آٹھویں رکوع میں حضرت شعیبؑ دہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعے سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیا علیہم السلام مشاہدے اور غور وفکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اوپر کی آیات میں بَيِّنَةٍ مِنَ الرَّبِّ سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید ومعاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے، اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی ہے۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علم وحی عطا کرتا تھا، اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔

یہ مشاہدۂ آثار اور غور وفکر، اور عقلِ عام (Common Sense) کا استعمال ان قیاس آرائیوں اور اس خرص وتخمین (Speculation) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب

فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار کو دیکھو اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ سائل نے اپنے سوال میں جس آیت کی تفسیر کے متعلق اپنے شک کا اظہار کیا ہے خود اسی کے ماقبل و مابعد کا مضمون اگر وہ پڑھیں تو دیکھیں گے کہ وہاں بھی مقصودِ کلام یہی بتانا ہے کہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالب حق کس طرح حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن جلد ۲۵ عدد ۱، ۲، ۳، ۴)

عصمتِ انبیا:

سوال: یہ امر مسلّم ہے کہ نبی معصوم ہوتے ہیں، مگر آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن کے الفاظ صریحاً ثابت کر رہے ہیں کہ آپ نے گناہ کیا اور حکم عدولی کی۔ جیسے لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ [البقرہ 35:2] کی آیت ظاہر کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اپنی تحقیق کے نتائج سے مستفید فرمائیں۔

جواب: نبی کے معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرشتوں کی طرح اس سے بھی خطا کا امکان سلب کر لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ نبی اوّل تو دانستہ نافرمانی نہیں کرتا اور اگر اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا۔

پھر یہ بات بھی لائقِ غور ہے کہ حضرت آدمؑ سے جو نافرمانی سرزد ہوئی تھی، وہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے کی ہے اور قبل نبوت کسی نبی کو وہ عصمت حاصل نہیں ہوتی جو نبی ہونے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ نبی ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا۔ چنانچہ جب فرعون نے ان کو اس فعل پر ملامت کی تو انہوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ [الشعراء 20:26] یعنی یہ فعل مجھ سے اس وقت سرزد ہوا تھا جب راہِ ہدایت مجھ پر کھلی نہ تھی۔

مختصراً یہ بات اصولی طور پر سمجھ لیجیے کہ نبی کی معصومیت فرشتے کی سی معصومیت نہیں ہے کہ اسے خطا اور غلطی اور گناہ کی قدرت ہی حاصل نہ ہو۔ بلکہ وہ اس معنی میں ہے کہ نبوت کے ذمہ دارانہ منصب پر سرفراز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ بطورِ خاص اس کی نگرانی و حفاظت کرتا ہے، اور اسے

غلطیوں سے بچاتا ہے، اور اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش اس سے سرزد ہو جاتی ہے تو وحی کے ذریعے سے فوراً اس کی اصلاح کر دیتا ہے تاکہ اس کی غلطی ایک پوری اُمت کی گمراہی کی موجب نہ بن جائے۔ (ترجمان القرآن، رجب شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

ختم نبوت:

سوال: میرے ایک دوست ہیں جو مجھ سے بحث کیا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے ایک رشتہ دار جو مرزائی ہیں ان کو اپنی جماعت کی دعوت دیتے ہیں، مگر وہ میرے دوست ان کے سوال کا جواب پوری طرح نہیں دے سکتے۔ انہوں نے مجھ سے ذکر کیا۔ میں خود تو جواب نہ دے سکا، البتہ میں نے ایک صاحب علم سے اس کا جواب پوچھا۔ مگر کوئی ایسا جواب نہ ملا جس سے کہ میری اپنی ہی تسلی ہو جاتی۔ اس لیے اب آپ سے پوچھتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ مرزائی حضرات لفظ ''خاتم'' کے معنی نفی کمال کے لیتے ہیں، نفی جنس کے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خاتم کا لفظ کہیں بھی نفی جنس کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ اگر ہوا ہو تو مثال کے طور پر بتایا جائے۔ ان کا چیلنج ہے کہ جو شخص عربی لغت میں خاتم کے معنی نفی جنس کے دکھا دے، اس کو انعام ملے گا۔ نفی کمال کی مثالیں وہ یہ دیتے ہیں کہ مثلاً کسی کو خاتم الاولیاء کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ولایت اس پر ختم ہو گئی، بلکہ حقیقی مطلب یہ ہوتا ہے کہ ولایت کا کمال اس پر ختم ہوا۔ اقبال کے اس فقرے کو بھی وہ نظیر میں پیش کرتے ہیں:

آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جہاں آباد میں اس کے بعد کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا، بلکہ یہ ہے کہ وہ جہاں آباد کا آخری باکمال شاعر تھا۔ اسی قاعدے پر وہ خاتم النّبیین کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے نہ یہ کہ خود نبوت ہی ختم ہو گئی۔

جواب: آپ کا عنایت نامہ مؤرخہ ۳ مارچ ۵۰ء مجھے یہاں یکم اپریل کو ملا۔ جواب میں مزید تاخیر اس لیے ہوئی کہ میرے پاس خط لکھنے کا کاغذ نہ تھا۔ امید ہے کہ میری مجبوری کو پیشِ نظر رکھ کر تاخیرِ جواب سے درگزر فرمائیں گے۔

قرآن مجید کی کسی آیت کے متعلق اگر کوئی سوال پیدا ہو تو سب سے پہلے خود قرآن ہی سے اس کا مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بعد تحقیق کرنا چاہیے کہ کوئی حدیث صحیح

بھی اس کی توضیح کرتی ہے یا نہیں۔ اگر ان دونوں ذرائع سے کوئی جواب نہ ملے (جس کا امکان بہت ہی کم ہے) تو البتہ کسی دوسرے ذریعے کی طرف رجوع کرنا درست ہوسکتا ہے۔

ختم نبوت کا ذکر سورۂ احزاب میں آیا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ عرب میں منہ بولے بیٹے کو بالکل حقیقی بیٹے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ وہ حقیقی بیٹے کی طرح میراث پاتا تھا، منہ بولے باپ کی بیوی اور بیٹیوں سے اسی طرح خلا ملا رکھتا تھا جس طرح ماں بیٹے اور بھائی بہنوں میں ہوا کرتا ہے، اور متبنّٰی بن جانے کے بعد وہ ساری حرمتیں اس کے اور منہ بولے باپ کے درمیان قائم ہوجاتی تھیں جو نسبی رشتے کی بِنا پر قائم ہوا کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس رسم کو توڑنا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے حکم دیا کہ ''منہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے کوئی شخص حقیقی بیٹا نہیں ہوجاتا۔'' (سورہ احزاب، آیت ۴، ۵) لیکن دلوں میں صدیوں کے رواج کی وجہ سے حرمت کا جو تخیل بیٹھا ہوا تھا، وہ آسانی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس رسم کو عملاً توڑ دیا جائے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہ واقعہ پیش آگیا کہ حضرت زیدؓ نے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے) حضرت زینب کو (جو ان کے نکاح میں تھیں) طلاق دے دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ موقع ہے اس سخت قسم کی جاہلی رسم کو توڑنے کا، جب تک آپ خود متبنّٰی کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہ کریں گے، متبنّٰی کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کا جاہلی تخیل نہ مٹ سکے گا۔ لیکن آپ یہ بھی جانتے تھے کہ مدینہ کے منافقین اور اطراف مدینہ کے یہود اور مکہ کے کفار اس فعل پر ایک طوفانِ عظیم برپا کردیں گے اور آپ کو بدنام کرنے اور اسلام کو رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ اس لیے آپ عملی اقدام کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود ہچکچا رہے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا اور آپؐ نے حضرت زینبؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس پر جیسا کہ اندیشہ تھا، اعتراضات اور بہتان طرازی اور افترا پردازی کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور خود مسلمان عوام کے دلوں میں بھی طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ انہی اعتراضات اور وسوسوں کو دور کرنے کے لیے سورہ احزاب کے پانچویں رکوع کی آیات ۳۷-۴۰ نازل ہوئیں۔

ان آیات میں پہلے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یہ نکاح ہمارے حکم سے ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے کہ مومنوں کے لیے اپنے متبنّٰی لڑکوں کی بیوہ اور مطلقہ بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے۔ پھر فرماتا ہے کہ ایک نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کا حکم بجالانے میں وہ کسی کے خوف سے

ہچکچائے۔اس کے بعداس بحث کوختم اس بات پرفرماتا ہے کہ:

''محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النّبیین ہیں۔''

اس موقع پر یہ فقرہ جوارشادفرمایا گیا،اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معترضین کے جواب میں تین دلائل دینا چاہتا ہے:

اوّل یہ کہ یہ نکاح بجائے خود قابل اعتراض نہیں ہے، کیوں کہ جس شخص کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا گیا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا واقعی بیٹا نہ تھا اور آپؐ اس کے حقیقی باپ نہ تھے۔

دوسرے، اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ نکاح جائز ہی سہی مگر اس کا کرنا کیا ضرور تھا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس جائز کام کو کرنا فی الواقع ضروری تھا، کیوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور رسول کو لازم ہے کہ وہ خدا کے قانون کو عملاً جاری کرے اور جو چیزیں بے جا رسم کے طور پر حرام کر دی گئی ہیں، ان کی حرمت توڑ دے۔

تیسرے، یہ کام اس لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض نبی ہی نہیں ہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔اگر اب آپ کے ہاتھوں یہ جاہلانہ رسم نہ ٹوٹی تو پھر قیامت تک نہ ٹوٹ سکے گی۔آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے کہ جو کسر آپ سے چھوٹ جائے، اسے وہ آکر پورا کر دے۔

اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ اس سلسلۂ بیان میں ختم کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔اگر اسے نفی کمال کے معنی میں لیا جائے تو یہاں یہ لفظ بالکل ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔موقع ومحل صاف تقاضا کر رہا ہے کہ یہاں اس کے معنی سلسلۂ نبوت کے قطعی انقطاع ہی کے ہونے چاہییں۔اس سیاق وسباق میں یہ کہنے کا آخر مطلب ہی کیا ہوسکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شادی اس لیے کی ہے کہ نبوت کے کمالات ان پر ختم ہو چکے ہیں۔یہ بات کہی گئی ہوتی تو معترضین فوراً پلٹ کر کہتے کہ خوب ہے یہ کمال نبوت جو ایک عورت سے شادی کرنے کا تقاضا کرتا ہے!

اس کے بعد حدیث کو دیکھیے۔نبیؐ نے خود ختم نبوت کی جو تشریح فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ ''میری اور انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک محل تھا جس کی عمارت بہت حسین بنائی گئی تھی، مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی۔اب وہ جگہ میں نے آکر بھر دی اور عمارت مکمل ہوگئی۔'' یہ بخاری اور مسلم کی

متفق علیہ حدیث ہے۔ آپ کو مشکوٰۃ باب فضائل سیّد المرسلین میں مل جائے گی۔ اس تشریح کی رو سے نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ آخری اینٹ کی جگہ بھی بھر چکی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کوئی نئی اینٹ آ کر کہاں لگے گی؟ عمارت کے اندر یا اس کے باہر؟

اس کے بعد لغت کی طرف آیئے۔ عربی زبان کی کسی مستند لغت کو اُٹھا کر لفظ ختم کے معنی دیکھ لیجیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ جو تاویل میں نے اوپر قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کی ہے، عربی زبان بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ ختم کے اصل معنی مہر لگانے، بند کرنے اور کسی چیز کا سلسلہ منقطع کر دینے کے ہیں۔ ختم الاناء کے معنی ہیں: ''برتن کا منہ بند کر دیا''۔ خَتَمَ الْعَمَلَ کے معنی ہیں: ''کام پورا کر کے اس سے فارغ ہو گیا'' خَتَمَ الْکِتَابَ کے معنی ہیں ''خط پورا کر کے اس پر مہر لگا دی''۔ خود قرآن میں منکرین حق کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ ''خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے'' یعنی ان کے دل قبولِ حق کے لیے بند کر دیئے گئے ہیں، نہ ایمان ان کے اندر جا سکتا ہے، نہ کفر ان میں سے نکل سکتا ہے۔ پس حضورؐ کو خاتم النّبیین کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا سلسلہ مکمل کر کے آپؐ کو اس پر مہر کے طور پر نصب کر دیا ہے۔ اب اس سلسلے میں کوئی نیا نبی داخل نہیں ہو سکتا[1]۔ (نیو سنٹرل جیل ملتان ۱۶ اپریل ۵۰ء)

علمِ غیب رُسل:

سوال: ایک عالم دین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''رسول کو عالم غیب سے وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جن کو اللہ ان کے توسط سے اپنے بندوں کے پاس بھیجنا چاہتا ہے۔'' استدلال میں یہ آیت پیش کی ہے:

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْھِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّھِمْ۔
[الجن 72:28-26]

یعنی ''وہ غیب کا عالم ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس رسول کے جس کو اُس نے چن لیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگران لگا دیتا ہے تا کہ وہ

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں مصنف کا تیسرا بیان۔ نیز مصنف کا رسالہ ''ختم نبوت''۔

جان لے کہ رسولوں نے اپنے ربّ کے پیغامات پہنچا دیے۔"

مصنف کی اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کو غیب کا صرف اتنا ہی علم دیا جاتا ہے جتنا بندوں کو پہنچانا مطلوب ہوتا تھا۔ اس سے زیادہ انہیں کوئی چیز نہ بتائی جاتی تھی۔ کیا یہ بات درست ہے؟ اور کیا وہ آیت جس سے مصنف نے استدلال کیا ہے، اس معاملے میں فیصلہ کن ہے؟

جواب: مصنف نے دراصل عوام الناس کے اس غلط خیال کی تردید کرنی چاہی ہے کہ رسول تمام ما کان وما یکون کو جانتے ہیں اور خدا نے ان کو پورا علم غیب دے دیا ہے، حتیٰ کہ جو کچھ خدا جانتا ہے، وہی اس کا رسول بھی جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ باطل ہے اور اس کی تردید کی حد تک مصنف کی بات درست ہے۔ لیکن اس کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ رسولوں کو بس اتنا ہی علم غیب دیا گیا تھا جتنا بندوں کو پہنچانا مطلوب تھا۔ یہ بات قرآن اور حدیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور خود اس آیت سے بھی نہیں نکلتی جس سے مصنف نے استدلال کیا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوب کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا:

وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ [الاعراف 62:7]

"میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبریں دے دی گئیں۔ مگر انہوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا۔ حضرت نوحؑ کو تو اتنے پہلے عذاب کی خبر دے دی گئی تھی کہ انہوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنالی۔ لیکن انہوں نے اپنی قوم کو یہ نہیں بتایا کہ تم پر پانی کا عذاب آنے والا ہے۔ پھر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی عربیؐ کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپؐ کی اُمت کو نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

یاامة محمد واللّٰه لوتعلمون ما علمت لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرًا۔

(بخاری، باب الصدقہ فی الکسوف)

"اے محمدؐ کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور بہت روتے۔"

ایک اور موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاراکم من ورائی کما اراکم۔ (بخاری باب عظۃ امام الناس)

''میں تم کو پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں۔''

غرض بکثرت آیات اور روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسولوں کو جو علم غیب دیا گیا تھا، وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بندوں تک پہنچا۔ اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔ کیوں کہ بندوں کو تو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقائد ایمانیہ سے ہے۔ لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات حاصل ہونی چاہییں جو فرائض رسالت انجام دینے میں ان کے لیے مددگار ہوں، جس طرح سلطنت کی پالیسی اور اس کے اسرار سے نائب السلطنت اور گورنروں کا ایک خاص حد تک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پہنچ جانا بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہوتا ہے۔ اسی طرح ملکوتِ الٰہی کے بھی بہت سے اسرار ہیں جو خدا کے خاص نمایندے اور اس کے رسول جانتے ہیں اور عام رعیت ان سے بے خبر ہے۔ یہ علم غیب رسولوں کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے، لیکن عام رعایا نہ اس علم کی ضرورت ہی رکھتی ہے اور نہ اس کا تحمل ہی کر سکتی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ مجملاً بس اس قدر ہے کہ نبی کا علم خدا کے علم سے کم اور بندوں کے علم سے زیادہ ہوتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کتنا ہوتا ہے اور کتنا نہیں، تو اس کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ (ترجمان القرآن، جمادی الاولیٰ ۵۳ھ / اگست ۳۴ء)

دہریّت و مادہ پرستی اور قرآن:

سوال: آپ نے اپنی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' میں اصطلاحات اربعہ کے جو معانی بیان کیے ہیں، ان سے جیسا کہ آپ نے خود ذکر فرمایا ہے، یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کی طرف نبی بھیجا گیا ہو اور اس نے اسے خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے یا خدا کو الٰہ و ربّ بمعنی خالق و رازق ماننے کی دعوت دی ہو، کیوں کہ ہر قوم اللہ کے فاطر و خالق ہونے کا اعتقاد رکھتی تھی۔ اِس سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں منکرین خدا یعنی مادّہ پرست ملحدین اور دہریوں کا گروہ ناپید تھا، حالاں کہ بعض آیات سے ان لوگوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً:

مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ۔

[جاثیہ 24:45]

''بس ہماری زندگی تو یہی دنیا کی زندگی ہے کہ مرتے ہیں۔ اور جیتے ہیں اور یہ زمانہ (یعنی نظمِ فطرت) ہی ہمیں ہلاک کرنے والا ہے۔''

نیز موسیٰؑ وفرعون اور نمرود وابراہیمؑ کے مذاکروں میں بعض آیات اس امر پر صریح الدلالت ہیں کہ یہ دونوں مادّہ پرست دہریہ تھے۔ مثلاً:

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ [ابراھیم 10:14]

''کیا خدا کے وجود میں بھی کوئی شک وشبہ ہے جو موجدِ ارض وسما ہے؟''

پھر دوسری آیت ہے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۔ [طور 35:52]

''کیا وہ بدوں کسی خالق کے آپ سے آپ پیدا ہو گئے یا وہ خود خالق ہیں؟''

آپ نے دوسری آیات سے استدلال کرتے ہوئے ان آیتوں کی جو توجیہ کی ہے، اس میں اختلاف کی گنجایش ہے، کیوں کہ ان آیاتِ متمسک بہا کی دوسری توجیہیں ہو سکتی ہیں۔

جواب: میں نے جہاں تک قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے اور جس حد تک تاریخی معلومات میرے سامنے ہیں، ان دونوں سے یہ بات مجھے قریب بہ یقین معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں کبھی کوئی قوم یا کوئی ہیئتِ اجتماعی (Community) ایسی نہیں گزری ہے جو بحیثیت مجموعی خدا کی منکر اور دہریہ رہی ہو۔ افراد اور چھوٹے چھوٹے فلسفیانہ گروہ ایسے ضرور ہیں، لیکن وہ اتنے قابل لحاظ نہ تھے کہ براہِ راست ان کو خطاب کرنے کے لیے کوئی نبی بھیجا جاتا یا کتاب نازل کی جاتی۔ اسی لیے قرآن مجید میں ایسے گروہوں کے متعلق کہیں کہیں مختصر اشارات تو ضرور کیے گئے ہیں لیکن دعوت کا براہِ راست خطاب مشرکین ہی کی طرف رہا ہے اور عموماً توحید پر جو دلائل دیے گئے ہیں وہ اس انداز سے دیے گئے ہیں کہ شرک کے ابطال کے ساتھ دہریت کا ابطال بھی انہی سے ہو جاتا ہے، اس کے خلاف الگ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

فرعون اور نمرود کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ محض قیاس سے لکھا ہے۔ معتبر معلومات اس کے خلاف ہیں۔ آج ارضِ بابل اور ارضِ مصر دونوں کے متعلق آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے نہایت مفصل معلومات حاصل ہو چکی ہیں اور ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فراعنہ اور فرماں روایانِ بابل دونوں ہی پروہت راجا (Priest Kings) تھے۔ جن الٰہوں کی پرستش ان کی قوم میں ہوتی

تھی، ان کو یہ دونوں نہ صرف یہ کہ معبود مانتے تھے بلکہ یہی فرماں روا ان کے مہا پجاری (Chief Priests) ہوتے تھے اور انہیں ان آلہہ کے نمایندے ہونے کی حیثیت سے مانا جاتا تھا۔ اسی کی تصدیق قرآن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ اور یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اس معنی میں دہریے نہیں تھے جس معنی میں آج کل یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الثانی ۶۵ھ، مارچ ۴۶ء)

لہٗ ما سلف کی تفسیر:

سوال: تفہیم القرآن میں حرمتِ سود والی آیت: فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ [البقرہ 275:2] پر حاشیہ لکھتے ہوئے جناب نے جو استدلال فرمایا ہے، اس پر مجھے اطمینان نہیں ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ ''وہ شخص جو پہلے کے کمائے ہوئے مال سے بدستور لطف اٹھاتا رہا ہے تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پا کر رہے۔''

سوال یہ ہے کہ سود کے حرام ہونے پر صحابہ کرامؓ نے کیا عمل فرمایا؟ اگر انہوں نے اخلاقی حیثیت کی بِنا پر مستحقین کو مال واپس کیا ہے تو آپ کا استدلال صحیح ہوسکتا ہے، نیز اگر صحابہؓ کا عمل ایسا ثابت ہے تو آپ کو تفہیم القرآن میں اس کا حوالہ دینا چاہیے۔

جواب: اس معاملے میں قرآن کے الفاظ پر شاید آپ نے توجہ نہیں کی۔ ''فَلَهٗ مَا سَلَفَ'' کہنے کے بعد ''وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ'' جو فرمایا گیا ہے اس کا آخر مطلب کیا ہوسکتا ہے؟ اس کے معنی یہی تو ہوسکتے ہیں کہ جہاں تک دنیوی عدالت کا تعلق ہے، حرمتِ سود کا حکم نازل ہونے سے پہلے کے مقدمات اس میں پیش نہیں کیے جائیں گے، مگر جہاں تک اخروی عدالت کا تعلق ہے، اللہ نے کھائے ہوئے سود کی معافی کا اعلان نہیں کر دیا ہے، بلکہ اس کے مقدمے کو زیرِ تجویز رکھا ہے۔ اگر وہ اپنی سود سے جمع کی ہوئی دولت کو اپنے لیے عیش و راحت اور شان و شوکت کا ذریعہ بنائے تو اس کی حیثیت ایسے شخص کی سی ہوگی جو اپنے پچھلے گناہوں پر کوئی ندامت نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اس شخص سے مختلف ہوگا جو اپنے پچھلے گناہوں پر نادم ہو اور اپنی ظلم و جور سے کمائی ہوئی دولت کو اپنے عیش پر خرچ کرنے کے بجائے خلق اللہ کی خدمت پر صرف کرے، تاکہ اس کے اس جرم کی کسی حد تک تلافی ہوجائے جو وہ حالت جاہلیت میں کرتا رہا ہے۔ اس

معاملے کے متعلق اگر کوئی نظائر ہمیں تاریخ میں نہ بھی ملیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکم کے منشا کی طرف جو صریح اشارہ قرآن شریف کر رہا ہے، اس سے ہم آنکھیں بند کر لیں۔

(ترجمان القرآن، محرم، صفر ۶۴ھ، جنوری، فروری ۴۵ء)

اتّباع علما وصلحا:

سوال: ایک عالم دین اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ ''شرک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ علما اور صلحا کو امام اور ہادی مان کر ان کے اقوال کو اللہ کے قول کی طرح بلا سند تسلیم کیا جائے۔'' پھر فرماتے ہیں کہ ائمۂ سلف اور بزرگانِ دین کے علوم اور حالات سے علمی اور تاریخی فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن ان کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے دین ماننا شرک ہے۔'' لیکن ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ''کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے۔'' آگے چل کر پھر فرماتے ہیں کہ ''رسول اور امیر کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں ہے بلکہ ممانعت ہے۔'' آخر میں ایک مقام پر ان کا ارشاد ہے: ''بلکہ عام طور پر انسانوں کی اطاعت کو قرآن خطرناک قرار دیتا ہے۔'' مصنف کی یہ باتیں کہاں تک درست ہیں؟

جواب: ان اقوال میں صحیح اور غلط دونوں طرح کی باتیں ملی جلی ہیں۔ فی الجملہ صاحب موصوف نے حق بات کہنے کے ساتھ ایک طرح کے بے جا تشدّد سے کام لیا ہے۔ مسلمانوں میں جاہل پیروں اور علمائے سوء کی اندھی تقلید اور جاہلانہ اطاعت کے جو آثار نظر آتے ہیں، ان پر جتنا بھی اظہار غضب کیا جائے، جائز اور بجا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مؤلف نے اصلاح کے جوش میں علمائے حق اور صلحائے اُمت اور ائمۂ ہداۃ کی اطاعت اور پیروی کو بھی گمراہی قرار دے دیا ہے، اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو شرک تک کہہ دیا۔ حالاں کہ اگر وہ انہی آیاتِ قرآنی پر غور فرماتے جن کو انہوں نے استدلال میں پیش کیا ہے تو انہیں خود احساس ہو جاتا کہ وہ حق سے بہت کچھ تجاوز کر گئے ہیں۔ شرک جس چیز کا نام ہے وہ تو بغیر اس کے متحقق نہیں ہو سکتی کہ کوئی شخص خدا کے سوا کسی دوسرے کو حقیقی معنوں میں حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار قرار دے یا خدا کے امر و نہی کے مقابلے میں یا اس کے برابر کسی اور کے امر و نہی کو واجب الاطاعت سمجھے۔ لیکن یہ مخفی نہیں ہے، اور غالباً جناب مولف خود بھی جانتے ہوں گے کہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی ایسا اعتقاد نہیں رکھتا۔ لہٰذا

اس معاملے میں شرک کا حکم لگا دینا زیادتی ہے۔ جو شخص کسی بزرگ کے متعلق یہ سمجھتا ہو کہ وہ راہ راست پر ہیں اور خدا کی شریعت اور اس کے احکام کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر جانتے ہیں اور اس بنا پر وہ ان کی پیروی یہ سمجھتے ہوئے کرتا ہو کہ ان کی پیروی رضائے الٰہی کی پیروی ہے، ایسے شخص کو آخر شرک کا الزام کیسے دیا جا سکتا ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ کس کا اتباع کرنا جائز ہے، اور کس کا اتباع گمراہی ہے، تو قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ:

﴿لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ﴾[احزاب1:33] ﴿وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا [الکھف28:18] ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴾[القلم8:68] ﴿وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴾[الدھر24:76]

یعنی کافروں اور منافقوں کی، خدا کو بھول جانے والوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرنے والوں کی، افراط پسندوں اور حق کو جھٹلانے والوں اور گناہ گار ناشکروں کی پیروی نہ کرو۔ یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ صالحین اور اہل علم کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ قرآن تو کہتا ہے کہ:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾[النحل43:16] اور ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [انعام90:6]

یعنی اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو اور جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے ان کے راستے کی پیروی کرو۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، مؤلف نے صحیح اور غلط کو خلط ملط کر دیا ہے۔ وہ افراط وتفریط میں پڑ گئے ہیں۔ علما اور صلحائے کرام کو ہادی ماننا کوئی گناہ نہیں ہے، بلکہ غیر عالم اور غیر صالح کو لازم ہے کہ ان کی بات مانے اور ان کے پیچھے چلے۔ البتہ ان کے قول کو اللہ کے قول کی طرح سمجھنا ضرور گناہ ہے۔ اسی طرح یہ درست ہے کہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے۔ لیکن جو شخص یہ سمجھ کر بزرگوں کی پیروی کرے کہ وہ خود کتاب اللہ کا علم نہیں رکھتا اور بزرگانِ سلف نے جو طریقے اختیار کیے ہیں، وہ کتاب اللہ کے مطابق ہیں، وہ ہرگز کسی جرم یا گناہ کا مرتکب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے پیروی کے

لیے جن بزرگوں کو چن لیا ہے، ان کا انتخاب درست نہیں ہے۔

آپ تقلیدِ جامد اور اندھی پیروی کی جتنی چاہیں برائی کر سکتے ہیں۔ سب بجا اور درست۔ آپ یہ کہنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ ولایت، امامت، اجتہاد اور علم وفضیلت بزرگوں پر ختم نہیں ہوگئیں۔ آج بھی یہ سب مرتبے حاصل ہو سکتے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن تقلید کی مخالفت اور اجتہاد کا شوق اگر اس حد تک پہنچ جائے کہ بزرگان سلف کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو جائے، اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کو خواہ مخوہ ڈھا دینا ہی ضروری سمجھ لیا جائے، اور محض نئی بات پیدا کرنے کی خاطر جدت طرازیاں کی جائیں، اور لوگ اہلیت کے بغیر اجتہاد شروع کر دیں اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کو بازیچۂ اطفال بنالیں، تو حق یہ ہے کہ یہ گمراہی اندھی تقلید کی گمراہی سے بدرجہا زیادہ سخت اور دین کے حق میں بدرجہا زیادہ نقصان دہ ہے۔ مقلدین تو صرف اتنا ہی کرتے ہیں کہ جو دیواریں ان کے اسلاف اُٹھا گئے ہیں، ان پر زمانے کی ضروریات کے مطابق کسی مزید تعمیر کا اضافہ نہیں کرتے۔ لیکن وہ پچھلی عمارت کو جوں کا توں قائم تو رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ جدت پسند حضرات پچھلی دیواروں کو بھی ڈھا دیتے ہیں اور خود اپنے من مانے طرز پر نئی عمارت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ذہنیت اگر فروغ پا جائے تو اندیشہ ہے کہ پورا دین ہی مسخ ہو جائے گا اور نہ معلوم اس کی شکل کیا سے کیا بنا کر رکھ دی جائے گی۔

(ترجمان القرآن، جمادی الاولیٰ ۵۳ھ، اگست ۳۴ء)

قرآن وحدیث اور سائنٹفک حقائق:

سوال: قرآن وحدیث میں بہت سے ایسے اُمور بیان ہوئے ہیں جنہیں زمانۂ حال کی تحقیقات غلط قرار دیتی ہیں۔ اس صورت میں ہم قرآن وحدیث کو مانیں یا علمی تحقیق کو؟ مثلاً:

ا: قرآن کہتا ہے کہ نوع انسانی آدمؑ سے پیدا ہوئی، بخلاف اس کے علمائے دورِ حاضر کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کے کنبے سے تعلق رکھتا ہے اور بندروں اور بن مانسوں سے ترقی کرتے کرتے آدمی بنا ہے۔

ب: قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ آفتاب حرکت کرتا ہے مگر سائنس کہتی ہے کہ نہیں، آفتاب ساکن ہے۔

ج: اسی طرح بادلوں میں جو کڑک اور چمک ہوتی ہے، اس کے متعلق اسلام کی رائے یہ ہے

کہ یہ بادلوں کو ہنکاتے ہوئے فرشتوں کے کوڑے چمکتے اور آواز نکالتے ہیں، حالاں کہ زمانۂ حال کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ رعد اور برق کا ظہور بادلوں کے ٹکرانے سے ہوتا ہے۔

د: ''کانا دجال'' کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے، تو آخر وہ کون سی جگہ ہے؟ آج تو دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے، پھر کیوں کانے دجال کا پتا نہیں چلتا؟

جواب: مجھے تو اپنی پچیس سالہ علمی تحقیق و تفتیش کے دوران میں آج تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ سائنٹفک طریقے سے انسان نے کوئی حقیقت ایسی دریافت کی ہو جو قرآن کے خلاف ہو۔ البتہ سائنس دانوں یا فلسفیوں نے قیاس سے جو نظریے قائم کیے ہیں، ان میں سے متعدد ایسے ہیں جو قرآن کے بیانات سے ٹکراتے ہیں۔ لیکن قیاسی نظریات کی تاریخ خود اس بات پر شاہد ہے کہ ایک وقت جن نظریات کو حقیقت سمجھ کر ان پر ایمان لایا گیا، دوسرے وقت خود وہی نظریات ٹوٹ گئے اور آدمی ان کے بجائے کسی دوسری چیز کو حقیقت سمجھنے لگا۔ ایسی ناپائدار چیزوں کو ہم یہ مرتبہ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے بیانات سے ان کی پہلی ٹکر ہوتے ہی قرآن کو چھوڑ کر ان پر ایمان لے آئیں۔ ہمارا ایمان اگر متزلزل ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ کسی ثابت شدہ حقیقت سے، یعنی ایسی چیز سے جو تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہو، قرآن کا کوئی بیان غلط قرار پائے۔ مگر جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں، ایسی کوئی چیز آج تک میرے علم میں نہیں آئی ہے۔

اب فرداً فرداً ان چیزوں کے متعلق کچھ عرض کر دوں جنہیں آپ نے مثال میں پیش کیا ہے:

ا: ڈارون کا نظریۂ ارتقا اس وقت تک محض نظریہ ہے، ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ علی گڑھ، جہاں سے آپ یہ خط لکھ رہے ہیں، ایک علمی مرکز ہے۔ وہاں اس نظریے پر ایمان لانے والوں کی اچھی خاصی تعداد آپ کو ملے گی۔ آپ خود انہی سے پوچھ لیجیے کہ یہ نظریہ (Theory) ہے یا واقعہ (Fact)؟ اگر ان میں سے کوئی صاحب اسے واقعہ قرار دیں تو ذرا ان کا اسم گرامی مجھے بھی لکھ بھیجیے۔

ب: علی گڑھ میں فلکیات (Astronomy) جاننے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ذرا ان لوگوں سے پوچھیے کہ کیا واقعی آفتاب ساکن ہے؟ اگر ایسے کوئی صاحب مل سکیں تو ان کے نام نامی سے بھی علمی دنیا کو ضرور مطلع کرنا چاہیے۔ غالباً آپ ابھی تک انیسویں صدی کے سائنس کو سائنس سمجھ رہے ہیں جب کہ آفتاب متحرک نہ تھا۔ موجودہ سائنس کا آفتاب تو اچھی خاصی تیزی کے

ساتھ حرکت کررہا ہے۔

ج: قرآن مجید کی کوئی آیت میرے علم میں ایسی نہیں ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ بادلوں میں چمک اور کڑک بجلی کے بجائے فرشتوں کے کوڑے برسانے سے ہوتی ہے۔اس کے برعکس قرآن مجید میں بارش کا جو عمل (Process) بیان کیا گیا ہے، وہ بالکل ٹھیک ٹھیک موجودہ زمانے کی سائنٹفک تحقیقات کے مطابق ہے اور اتنا جدید (Up to Date) ہے کہ پچھلی صدی کے وسط تک جو معلومات انسان کے پاس بارش کے متعلق تھیں، ان کی بنا پر بعض لوگوں کو ان آیات کی تفسیر میں سخت پریشانی پیش آتی تھی جن میں بارش کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

د: یہ ''کانا دجال'' وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ان چیزوں کو تلاش کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت بھی نہیں۔عوام میں اس قسم کی جو باتیں مشہور ہوں، ان کی کوئی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے، اور ان میں سے کوئی چیز اگر غلط ثابت ہو جائے تو اس سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ (ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۶۴ھ، ستمبر، اکتوبر ۴۵ء)

تحقیق حدیثِ دجال:

سوال: ترجمان القرآن میں کسی صاحب نے سوال کیا تھا کہ ''کانے دجال کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہیں مقید ہے، تو آخر وہ کون سی جگہ ہے؟ آج دنیا کا کونہ کونہ انسان نے چھان مارا ہے، پھر کیوں کانے دجال کا پتا نہیں چلتا؟'' اس کا جواب آپ کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ ''کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔'' لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، کم از کم تیس روایات میں دجال کا تذکرہ موجود ہے، جس کی تصدیق بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، شرح السنہ بیہقی کے ملاحظہ سے کی جاسکتی ہے۔پھر آپ کا جواب کس سند پر مبنی ہے؟

جواب: میں نے جس چیز کو افسانہ قرار دیا ہے وہ یہ خیال ہے کہ دجال کہیں مقید ہے۔باقی رہا یہ امر کہ ایک بڑا فتنہ پرور (الدجال) ظاہر ہونے والا ہے، تو اس کے متعلق احادیث میں جو خبر دی گئی ہے، میں اس کا قائل ہوں اور ہمیشہ اپنی نماز میں وہ دعائے ماثورہ پڑھا کرتا ہوں جس میں من جملہ دوسرے تعوذات کے ایک یہ بھی ہے کہ '' اعوذ بك من فتنة المسيح الدجال ''۔

دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کے مضمون پر مجموعی

نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہوجاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے اس معاملے میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجال ظاہر ہونے والا ہے، اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی اور وہ ان ان خصوصیات کا حامل ہوگا۔ لیکن یہ آپؐ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا، اور یہ کہ آیا وہ آپؐ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپؐ کے بعد کسی بعید زمانے میں پیدا ہونے والا ہے۔

ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضورؐ سے احادیث میں منقول ہیں، ان کا اختلاف مضمون خود بھی یہ ظاہر کرتا ہے اور حضورؐ کے طرزِ کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آپ نے بربنائے وحی نہیں بلکہ بربنائے ظن وقیاس ارشاد فرمائی ہیں۔ کبھی آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجال خراسان سے اُٹھے گا، کبھی یہ کہ اصفہان سے، اور کبھی یہ کہ شام وعراق کے درمیانی علاقے سے۔ پھر کبھی آپؐ نے ابنِ صیاد نامی اس یہودی بچے پر جو مدینہ میں (غالباً ۲ یا ۳ ہجری میں) پیدا ہوا تھا، یہ شبہ کیا کہ شاید یہی دجال ہو، اور آخری روایت یہ ہے کہ ۹ ہجری میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپؐ کو یہ قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحرِ روم یا بحرِ عرب میں) سفر کرتے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور وہاں ان کی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اس نے انہیں بتایا کہ وہ خود ہی دجال ہے، تو آپؐ نے ان کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ سمجھی، البتہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمایا کہ اس بیان کی رو سے دجال بحرِ روم یا بحرِ عرب میں ہے، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

ان مختلف روایات پر جو شخص بھی مجموعی نظر ڈالے گا، وہ اگر علمِ حدیث اور اصولِ دین سے کچھ بھی واقف ہو تو اسے یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اس معاملے میں حضورؐ کے ارشادات دو اجزا پر مشتمل ہیں:

جزوِ اوّل یہ کہ دجال آئے گا، ان صفات کا حامل ہوگا اور یہ فتنے برپا کرے گا۔ یہ بالکل یقینی خبریں ہیں جو آپؐ نے اللہ کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں کوئی روایت دوسری روایت سے مختلف نہیں ہے۔

جزوِ دوم یہ کہ دجال کب اور کہاں ظاہر ہوگا اور وہ کون شخص ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ روایات مختلف ہیں بلکہ اکثر روایات میں شک اور شبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی

مروی ہیں۔ مثلاً ابنِ صیاد کے متعلق آپؐ کا حضرت عمرؓ سے یہ فرمانا کہ ''اگر دجال یہی ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک معاہد کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' یا مثلاً ایک حدیث میں آپؐ کا یہ ارشاد کہ ''اگر وہ میری زندگی میں آ گیا تو میں حجت سے اس کا مقابلہ کروں گا، ورنہ میرے بعد میرا ربّ تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی۔''

اس دوسرے جز کی دینی اور اصولی حیثیت ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جز کی ہے۔ جو شخص اس کی بھی تمام تفصیلات کو اسلامی عقائد میں شمار کرتا ہے، وہ غلطی کرتا ہے۔ بلکہ اس کے ہر حصے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ابن صیاد پر آپؐ کو شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی دجال ہو، اور حضرت عمرؓ نے تو قسم بھی کھالی تھی کہ یہی دجال ہے، مگر بعد میں وہ مسلمان ہوا، حرمین میں رہا، حالت اسلام میں مرا اور اس کی نمازِ جنازہ مسلمانوں نے پڑھی۔ اب اس کی کیا گنجایش باقی رہ گئی کہ آج تک ابن صیاد پر دجال ہونے کا شبہ کیا جاتا رہے؟ تمیم داری کے بیان کو حضورؐ نے اس وقت تقریباً صحیح سمجھا تھا، مگر کیا ساڑھے تیرہ سو برس تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیم نے جزیرے میں محبوس دیکھا تھا، یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنے دجال ہونے کی جو خبر حضرت تمیم کو دی تھی، وہ صحیح نہ تھی؟ حضورؐ کو اپنے زمانے میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپؐ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپؐ کے بعد کسی قریبی زمانے میں ظاہر ہو، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک دجال نہیں آیا ہے؟ اب ان چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں، نہ تو اسلام کی صحیح نمایندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گمان یا اندیشے کے مطابق ظاہر نہ ہو تو یہ اس کے منصب نبوت میں ہرگز قادح نہیں ہے، نہ اس سے عصمت انبیا کے عقیدے پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ایسی چیزوں پر ایمان لانے کے لیے شریعت نے ہم کو مکلّف کیا ہے۔ اس اصولی حقیقت کو تابیرِ نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود واضح فرما چکے ہیں۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل ۴۵ھ، فروری ۴۶ء)

بہانہ جوئی کے لیے روایات کے سہارے:

سوال: میں نے اپنے بعض اعزّہ اور بزرگوں کی خدمت میں فریضۂ اقامت دین کی اہمیت

واضح کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے۔اس سلسلے میں میرا تبادلۂ خیال ایک ایسے رشتہ دار سے ہوا جو اصطلاحی علم بھی رکھتے ہیں۔اقامت دین کے فرض کی اہمیت کے بھی منکر نہیں۔مگر ادائے فرض کے لیے آمادہ ہوجانے کے بجائے جہلا کے سے عذرات پیش کرتے ہیں۔ان کے پیشِ نظر یہ حدیث ہے: اذارأیت شحًا مطاعًا وھویً متبعًا واعجاب کل ذی رأی برایہٖ فعلیك بخویصه نفسك[1]۔

اس سے استدلال کر کے وہ اپنے آپ کو ادائے فرض سے بری کرتے ہیں اور اس کو اتنی وسیع اور وزنی دلیل سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں ان کے نزدیک پورے قرآن اور سارے ذخیرۂ حدیث کی حجت بھی غیر اہم ہے۔مثلاً میں نے حدیث شریف ''من رأی منکم منکرًا فلیغیرہ.....الخ''اور''لتاخذن یدالمسئ'' الحدیث اور ''من احیا سنتی'' الحدیث اور اسی طرح آیت: ﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ.....الخ﴾ اور ﴿وَلْتَکُنْ مِنْکُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ.....الخ﴾ اور بالخصوص ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَاتُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ.....الخ﴾ سب ہی کو ان کے اطمینان کے لیے پیش کر دیا اور یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُس حدیث کا محمل یہ نہیں ہے کہ آپ فریضۂ اقامت دین سے سبک دوش ہو گئے ہیں! آمرین بالمعروف اور ناہین عن المنکر کی تمام تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ ''شحِّ مطاع'' اور ''ہوائے مُتبِع'' ان سب کے زمانوں میں برسرِ عمل تھی مگر انہوں نے مایوسی کو گناہ سمجھا اور سعی کی، تو کیا العیاذ باللہ وہ غلطی کے مرتکب تھے؟ اب میں آپ سے اس حدیث کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جواب: یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کسی پوری قوم میں یا ساری کی ساری دنیا میں ''شح مطاع'' اور ''ہوائے متبع'' کے سوا اب کچھ نہیں رہا، تجربے کی ضرورت ہے نہ کہ اپنی جگہ سمجھ بیٹھنے کی۔اگر کوئی شخص حق کی طرف لوگوں کو دعوت دے اور تبلیغ کا جو حق ہے وہ ادا کرے اور پھر تجربے سے ثابت ہو کہ کوئی بھی اپنی ہوائے نفس کی پیروی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے اور سب کے سب باطل پرستی پر مصر ہیں، تب اس حدیث کے منشا کے مطابق آدمی کے لیے یہ درست ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑے اور صرف اپنی نجات سے غرض رکھے۔لیکن عملاً کوشش کیے بغیر پہلے ہی سے یہ

---

[1] یعنی جب تو دیکھے کہ لوگ اپنی تنگ دلی کے غلام اور خواہشات نفس کے پیرو بن گئے ہیں اور ہر شخص خود رائی میں مبتلا ہے، تو پھر تجھے چاہیے کہ بس اپنی نجات کی فکر کرے۔

سمجھ لینا کہ دعوت اور تبلیغ اور تذکیر سے کچھ حاصل نہیں ہے، محض ادائے فرض سے جی چرانے کا ایک بہانہ ہے۔ نبیؐ پر اس کی ذمہ داری ڈالنا بڑی جسارت اور سخت زیادتی ہے۔ آج اگر ہم اس حدیث کو حجت بنا کر اپنا وہ فرض ادا کرنے کی کوشش نہ کریں جو مومن ہونے کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتا ہے، تو دنیا میں ہم اپنے نفس کو مطمئن کر سکتے ہیں، لیکن قیامت کے روز اگر ہم نے اللہ تعالیٰ کی باز پرس کے جواب میں یہ حدیث معذرت کے طور پر پیش کی اور نبیؐ نے اسی وقت ہمارے منہ پر اس کی تردید کر دی کہ میرا مدعا یہ نہ تھا اور ان لوگوں نے میری حدیث سے غلط معنی نکال کر محض حیلہ بازی کی تھی تو بتایئے کہ ہمارے پاس جواب دہی کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟

دراصل اس حدیث کا یہ منشا ہی نہیں کہ بحیثیت مجموعی کسی پوری آبادی کے متعلق یہ قیاس کر لیا جائے کہ اس میں شحِ مطاع اور ہوائے متبع کے سوا کچھ نہیں ہے لہٰذا نصیحت اور تذکیر سے کچھ حاصل نہیں، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ ایسا ہو جس کے سامنے دعوتِ حق کو ٹھیک ٹھیک طریقے سے پیش کیا جائے اور پھر اس کے رویے سے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنی ہوائے نفس کا بندہ بنا ہوا ہے تب اس کے اوپر تذکیر میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ آئی ہے کہ ﴿اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾[1] اور ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى﴾[2]

سوال: ایک صاحب جو علم دین سے بخوبی واقف ہیں، خطبۂ جمعہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر کہ ”میرے بعد ۳۰ سال خلافت ہوگی، بعد میں شاہی دور شروع ہوگا اور آخر میں امام مہدی صاحب جن کا حسب نسب یہ ہوگا، تشریف لائیں گے اور خلافت قائم کریں گے“ یوں حاشیہ آرائی کی کہ جو لوگ ظہور امام مہدی سے پہلے خلافت کے لیے جدوجہد کرتے ہیں وہ محض ڈھونگ رچاتے اور دکان داری چلاتے ہیں۔ اس حاشیہ آرائی کے متعلق رائے گرامی کیا ہے؟

جواب: اس طرح کے استدلال جو لوگ حدیث سے کرتے ہیں وہ معلوم ہوتا ہے کہ علم سے بھی بے بہرہ ہیں اور خدا کا خوف بھی ان کے دلوں میں نہیں رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں سے اگر اسی طرح کا استدلال کیا جانے لگے تو انسان گمراہی کی آخری حد تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں حضورؐ نے یہ پیشین گوئی فرمائی ہے کہ مسلمان آخرکار

---

۱ [illegible] اتر آئیں ان کے پیچھے نہ پڑو۔ ۲ نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو۔

یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل پڑیں گے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے یہ بھی قدم رکھیں گے، حتیٰ کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے زنا کی ہو تو مسلمانوں میں بھی کوئی شخص اُٹھے گا جو اس فعل کا ارتکاب کرے گا۔ اب اگر اس پیشین گوئی سے استدلال کر کے کوئی شخص یہود و نصاریٰ کی پیروی شروع کر دے اور کہے کہ حضورؐ خود یہ فرما گئے ہیں، لہٰذا آپ کا یہ قول تو بہر حال ہم پر صادق آنا ہی ہے، تو ایسے شخص کے جاہل اور خوفِ خدا سے عاری اور گمراہ ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ حضورؐ نے آنے والے بدتر حالات کی جتنی خبریں بھی دی ہیں، ان سے آپؐ کا مدعا یہ نہ تھا کہ لوگ ان حالات پر قانع ہو کر اصلاح کی کوشش چھوڑ دیں، بلکہ اصل مدعا یہ تھا کہ لوگ پہلے سے متنبہ رہیں اور اصلاح کی فکر کریں۔

سوال: آپ فرقہ پرستی کے مخالف ہیں مگر اس کی ابتدا تو ایک حدیث سے ہوتی ہے کہ عن قریب میری اُمت ۷۲ فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا، جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کرے گا'' (بلکہ شیعہ حضرات تو ''اصحاب'' کی جگہ ''اہل بیت'' کو لیتے ہیں) اب غور فرمایئے کہ جتنے فرقے موجود ہیں، سب اپنے آپ کو ناجی سمجھتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ۔ پھر ان کو ایک پلیٹ فارم پر کیسے جمع کیا جا سکتا ہے؟ جب ایسا ممکن نہیں تو ظاہر ہے کہ یہ حدیث حاکمیت غیر اللہ کے بقا کی گارنٹی ہے۔ بہت سے لوگ اسی وجہ سے فرقہ بندی کو مٹانے کے خلاف ہیں کہ اس سے حدیث نبوی کا ابطال ہوتا ہے۔

جواب: جس قسم کا سوال آپ نے کیا ہے اس پر اگر آپ خود اپنی جگہ غور کر لیتے تو آپ کو آسانی سے اس کا جواب مل سکتا تھا۔ احادیث میں مسلمانوں کے اندر بہت سے فتنے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے، جس سے مقصود اہل ایمان کو فتنوں پر متنبہ کرنا اور ان سے بچنے کے لیے تاکید کرنا تھا، لیکن وہ شخص کس قدر گمراہ ہوگا جو صرف اس لیے فتنہ برپا کرنا یا فتنوں میں مبتلا رہنا ضروری سمجھے کہ احادیث میں جو خبر دی گئی ہے اس کا مصداق بننا ضروری ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن میں کہا گیا ہے کہ بہت سے انسان جہنمی ہیں۔ تو کیا اب کچھ لوگ جان بوجھ کر اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بنائیں تاکہ یہ خبر ان کے حق میں سچی نکلے؟ (ترجمان القرآن۔ ربیع الثانی ۶۵ھ/مارچ ۴۶ء)

المہدی کی علامات اور نظام دین میں اس کی حیثیت:

سوال: ظہور مہدی کے متعلق آپ نے رسالہ ''تجدید و احیائے دین'' میں جو کچھ لکھا ہے، اس

میں اختلاف کا پہلو یہ ہے کہ آپ مہدی موعود کے لیے کوئی امتیازی واختصاصی علامات تسلیم نہیں کرتے، حالاں کہ احادیث میں واضح طور پر علامات مہدی کا تذکرہ موجود ہے۔ آخر اس سلسلۂ روایات سے چشم پوشی کیسے کی جاسکتی ہے؟

جواب: ظہور مہدی کے متعلق جو روایات ہیں، ان کے متعلق ناقدین حدیث نے اس قدر تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اسماء الرجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے اکثر رواۃ شیعہ ہیں۔ تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی ومذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے اور اپنے کسی آدمی پر ان کی مندرجہ علامات کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان وجوہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نفس ظہور مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں، لیکن تفصیلی علامات کا بیش تر بیان غالباً وضعی ہے اور اہل غرض نے شاید بعد میں ان چیزوں کو اصل ارشاد نبویؐ پر اضافہ کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدی موعود ہونے کے جھوٹے دعوے کیے ہیں، ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انہی روایات نے بہم پہنچایا ہے۔

میں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں پر غور کیا ہے، ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات وتفصیلات اس طریقے سے کبھی آپؐ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہور مہدی کی احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ آپ بڑی بڑی اصولی علامات تو ضرور بیان فرمادیا کرتے تھے لیکن جزوی تفصیلات بیان کرنا آپؐ کا طریقہ نہ تھا۔

سوال: ضرورت بعثت مہدی کو ''تجدید واحیائے دین'' میں تسلیم کرلیا گیا ہے، لیکن مہدی کا کیا کام ہوگا، اس مسئلے کو نقلی تائید کے بغیر محض اپنے لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ احادیث شریفہ کی روشنی میں اس کی تفصیل کی جائے تو مناسب ہے۔ نیز مہدیِ موعود کے مراتب وخصوصیات اور اطاعتِ مہدی وغیرہ پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ عام مجددین میں شمار کردیا گیا ہے۔ اگر چہ مجدّد کامل اور مجدد ناقص کی تقسیم سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ غالباً یہاں ''مجدّد'' کا لفظ بر بنائے لغت استعمال ہوا ہے، اصطلاحاً نہیں۔ تاہم جب کہ مجدّد معصوم عن الخطا نہیں ہوتا اور مہدی موعود کا معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے تو پھر اس بیّن فرق کے ہوتے ہوئے مہدی موعود کو مجدّد کی فہرست میں کیسے شمار کیا جاسکتا ہے؟

جواب: اوّل تو خود لفظ ''مہدی'' پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے مہدی کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی ہیں ہدایت یافتہ کے، ''ہادی'' کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ مہدی ہر وہ سردار، لیڈر اور امیر ہوسکتا ہے جو راہ راست پر ہو۔ ''المہدی'' زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہوگا جس سے آنے والے کی کسی خاص امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے۔ اور وہ امتیازی شان حدیث میں اس طرح بیان کردی گئی ہے کہ آنے والا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام درہم برہم ہوجانے اور ظلم وجور سے زمین کے بھر جانے کے بعد از سر نو خلافت کو منہاج نبوت پر قائم کرے گا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ بس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو مختص وممتاز کرنے کے لیے ''مہدی'' پر ''ال'' داخل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم کیا گیا ہے جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیا پر ایمان لانا، اور اس کی اطاعت بھی شرطِ نجات اور شرطِ اسلام وایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ مہدی کوئی امام معصوم ہوگا۔ دراصل یہ معصومیتِ غیر انبیا کا تخیل ایک خالص شیعی تخیل ہے جس کی کوئی سند کتاب وسنت میں موجود نہیں ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر کفر واسلام کا مدار ہے، اور جن اُمور پر انسان کی نجات موقوف ہے، انہیں بیان کرنے کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ وہ سب قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور قرآن میں بھی ان کو کچھ اشارۃً ''وکنایتاً'' بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ ان کو کھول دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى﴾۔ لہٰذا جو مسئلہ بھی دین میں یہ نوعیت رکھتا ہو، اس کا ثبوت لازماً قرآن ہی سے ملنا چاہیے۔ مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جاسکتی جسے مدار کفر وایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمانِ صحت ہے نہ کہ علمِ یقین اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اِس خطرے میں ڈالنا ہرگز پسند نہیں کرسکتا کہ جو اُمور اس کے دین میں اتنے اہم ہوں کہ ان سے کفر وایمان کا فرق واقع ہوتا ہو، انہیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کردیا جائے، ایسے اُمور کی نوعیت ہی اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صاف صاف اپنی کتاب میں بیان فرمائے، اللہ کا رسول انہیں اپنے

پیغمبرانہ مشن کا اصل کام سمجھتے ہوئے اُن کی تبلیغ عام کرے اور وہ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے ہر ہر مسلمان تک پہنچا دیے گئے ہوں۔

اب ''مہدی'' کے متعلق خواہ کتنی ہی کھینچ تان کی جائے، بہرحال ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اسلام میں اس کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ اس کے جاننے اور ماننے پر کسی کے مسلمان ہونے اور نجات پانے کا انحصار ہو۔ یہ حیثیت اگر اس کی ہوتی تو قرآن میں پوری صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور نبیؐ بھی دو چار آدمیوں سے اس کو بیان کر دینے پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ پوری اُمت تک اسے پہنچانے کی سعی بلیغ فرماتے اور اس کی تبلیغ میں آپ کی سعی کا عالم وہی ہوتا جو ہمیں توحید اور آخرت کی تبلیغ کے معاملے میں نظر آتا ہے۔ درحقیقت جو شخص علوم دینی میں کچھ بھی نظر اور بصیرت رکھتا ہو، وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جس مسئلے کی دین میں اتنی بڑی اہمیت ہو اسے محض اخبار احاد پر چھوڑا جا سکتا تھا، اور اخبار احاد بھی اس درجے کی کہ امام مالکؒ اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے محدثین نے اپنے حدیث کے مجموعوں میں سرے سے ان کا لینا ہی پسند نہ کیا ہو۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل، جمادی الاخری ۶۴ھ / مارچ، جون ۴۵ء)

مسئلۂ مہدی:

سوال: چند حضرات نے جو نہایت دین دار اور مخلص ہیں، تجدید و احیائے دین کی ان سطور کے متعلق جو آپ نے امام مہدی کے متعلق تحریر فرمائی ہیں، احادیث کی روشنی میں اعتراضات پیش فرمائے ہیں، جنہیں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ میں اس احساس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ دعوت اقامت دین کے پورے کام میں شریعت کی پابندی ضروری ہے، پس لازم ہے کہ ہر وہ چیز جو آپ کے قلم سے نکلے، عین شریعت کے مطابق ہو اور اگر کبھی کوئی غلط رائے تحریر میں آئے تو اس سے رجوع کرنے میں کوئی تامل نہ ہونے پائے۔

(۱) امام مہدی کے متعلق جو سطور آپ نے صفحہ ۳۱ تا ۳۳ تحریر فرمائی ہیں، وہ ہمارے فہم کے مطابق احادیث کے خلاف ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے ترمذی اور ابوداؤد کی تمام روایات کا مطالعہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایات کے راوی نمرود، خارجی یا شیعہ ہیں، لیکن ابوداؤد، ترمذی وغیرہ کے ہاں ایسی صحیح احادیث بھی موجود ہیں جن کے راوی ثقہ اور صدوق ہیں اور

وہ آپ کی رائے کی تصدیق نہیں بلکہ تردید کرتی ہیں۔ مثلاً ابوداؤد کی روایت ملاحظہ ہو:

حد ثنا محمد بن المثنٰی ..... عن ام سلمة زوج النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال یکون اختلاف عند موت خلیفة فیخرج رجل من اهل المدینة هاربا الٰی مکة فیاتیه ناس من اهل مکة فیخرجونه وهو کارہ فیبایعونه بین الرکن والمقام .....(کتاب المہدی)

اس روایت سے لے کر اخیر روایت تک ملاحظہ ہو، تمام راوی ثقہ ہیں۔ نیز بیہقی کی بھی ایک روایت مشکوٰۃ کی کتاب الفتن میں تحریر ہے:

عن ثوبان قال اذارأیتم الرأیات السود قد جاء ت من قبل خراسان فاتوها فان فیها خلیفة اللّٰه المهدی۔

مندرجۂ بالا احادیث سے آپ کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ المہدی کو اپنے موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی۔ خصوصاً یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

وجب علٰی کل مومن نصرہ اوقال اجابته۔

نیز ترمذی کی ایک روایت کے یہ الفاظ بھی دیکھیے:

قال فیجئ الیه الرجل فیقول یا مهدی!اعطنی اعطنی!قال فیحثی له فی ثوبه ما استطاع ان یحمله۔

(۲) جناب نے فرمایا ہے کہ مہدی موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا.....وغیرہ! آپ کے ان الفاظ کی کوئی سند احادیث میں نہیں ہے۔ اگر ہو تو تحریر فرمائیں۔ جو لوگ آپ کے برعکس خیالات رکھتے ہیں، ان کی واقعاتی دلیل یہ ہے کہ اب تک جتنے مجددانِ امت گزرے ہیں، وہ عموماً صوفیائے کرام کے طبقے میں ہوئے ہیں۔

(۳) جناب کی ان سطور سے کہ وہ جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ آپ خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔

(۴) کتاب ''علامات قیامت'' (مولفہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب و مترجمہ مولوی نور محمد صاحب) میں امام مہدی کے متعلق مسلم و بخاری کے حوالے سے چند روایات درج ہیں، لیکن تحقیق کرنے پر مسلم و بخاری میں مجھے اس قسم کی کوئی حدیث نہ مل سکی۔ اسی کتاب میں ایک روایت

یہ بھی درج ہے کہ بیعت مہدی کے وقت آسمان سے یہ ندا آئے گی کہ ''هذا خليفة الله المهدى فاستمعوا له واطيعوا'' اس روایت کے متعلق آپ کی تحقیق کیا ہے؟

سوال: (۱) امام مہدی کے متعلق جو احادیث مختلف کتب حدیث میں مروی ہیں، ان کے متعلق میں اپنی تحقیق کا خلاصہ اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ جو لوگ امام مہدی کے متعلق کسی روایت کو ماننے کے لیے اتنی بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ وہ حدیث کی کسی کتاب میں درج ہے یا تحقیق کا حق ادا کرنے کے لیے صرف اس مرحلے تک پہنچ سکتے ہیں کہ راویوں کے متعلق یہ معلوم کر لیں کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں، ان کے لیے یہ درست ہے کہ اپنا وہی عقیدہ رکھیں جو انہوں نے روایات میں پایا ہے۔ لیکن جو لوگ ان روایات کو جمع کر کے ان کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں اور ان میں بکثرت تعارضات پاتے ہیں، نیز جن کے سامنے بنی فاطمہ اور بنی عباس اور بنی امیہ کی کش مکش کی پوری تاریخ ہے اور وہ صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ اس کش مکش کے فریقوں میں سے ہر ایک کے حق میں متعدد روایات موجود ہیں اور راویوں میں سے بھی اکثر و بیش تر وہ لوگ ہیں جن کا ایک نہ ایک فریق سے کھلا ہوا تعلق تھا، ان کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ ان روایات کی ساری تفصیلات کو صحیح تسلیم کر لیں۔ خود آپ نے جو احادیث نقل کی ہیں، ان کے اندر بھی ''رأيات السود'' یعنی کالے جھنڈوں کا ذکر موجود ہے، اور تاریخ سے معلوم ہے کہ کالے جھنڈے بنی عباس کا شعار تھے۔ نیز یہ بھی تاریخ سے معلوم ہے کہ اس قسم کی احادیث کو پیش کر کر کے خلیفہ مہدی عباسی کو مہدیِ موعود ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اب اگر کسی کو ان چیزوں کے ماننے پر اصرار ہے تو وہ مانے اور ''تجدید واحیائے دین'' میں جس رائے کا میں نے اظہار کیا ہے، اس کو ردّ کر دے۔ کچھ ضروری نہیں ہے کہ ہر تاریخی، علمی اور فقہی مسئلے میں میری ایک بات سب لوگوں کے لیے قابل تسلیم ہو۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ان مسائل میں میری کوئی تحقیق کسی کو پسند نہ آئے تو اصل دین کی سعی اقامت میں بھی میرے ساتھ تعاون کرنا اس کے لیے حرام ہو جائے۔ آخر یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے کہ حدیث، تفسیر، فقہ وغیرہ علوم میں اہلِ علم کی رائیں مختلف ہوئی ہیں۔

(۲) میں نے یہ بات جو کہی ہے کہ مہدی موعود جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ڈاڑھی منڈوائے گا، کوٹ پتلون پہنے گا، اور اپ ٹو ڈیٹ فیشن میں رہے گا۔ بلکہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ جس زمانے میں بھی پیدا ہوگا، اس زمانے کے علوم سے، حالات سے

اورضروریات سے پوری طرح واقف ہوگا، اپنے زمانے کے مطابق عملی تدابیر اختیار کرے گا اور ان تمام آلات ووسائل سے کام لے گا جو اس کے دور میں سائنٹفک تحقیقات سے دریافت ہوئے ہوں۔ یہ تو ایک صریح عقلی بات ہے جس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر نبیؐ اپنے زمانے کی تدابیر مثلاً خندق، دبابہ، منجنیق وغیرہ استعمال فرماتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ آیندہ کسی دَور میں جو شخص حضورؐ کی جانشینی کا حق ادا کرنے اُٹھے گا وہ ٹینک اور ہوائی جہاز سے، سائنٹفک معلومات سے اور اپنے زمانے کے احوال ومعاملات سے بے تعلق ہوکر کام کرے گا۔ کسی جماعت کے حصول مقصد اور کسی تحریک کے غلبے کا فطری راستہ ہی یہی ہے کہ وہ قوت کے تمام جدید ترین وسائل کو قابو میں لائے اور اپنا اثر پھیلانے کے لیے جدید ترین علوم وفنون اور طریقہ ہائے کار کو استعمال کرے۔

(۳) یہ ارشاد کہ اس سے شبہ کیا جارہا ہے کہ ''تو خود امام مہدی ہونے کا دعویٰ کرے گا'' اس کے جواب میں بجز اس کے میں کچھ عرض نہیں کرسکتا کہ اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہوسکتا جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ ﴿اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾۔[الحجرات 12:49] جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کرکے بندگان خدا کو جماعتِ اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرمارہے ہیں، میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہیں کرسکیں گے، اور وہ سزا یہ ہے کہ ان شاءاللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کرکر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں؟

(۴) کتاب علامات قیامت میں جس روایت کا ذکر ہے، اس کے متعلق میں نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ صحیح ہے اور فی الواقع حضورؐ نے یہ خبر دی ہے کہ مہدی کی بیعت کے وقت آسمان سے ندا آئے گی کہ ''هذا خليفة الله المهدى فاستمعوا له واطيعوا'' تو یقیناً میری وہ رائے غلط ہے جو تجدید واحیائے دین میں میں نے ظاہر کی ہے۔ لیکن مجھے یہ توقع نہیں ہے کہ حضورؐ نے یہ بات فرمائی ہوگی۔ قرآن مجید کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نبی کی آمد پر بھی آسمان سے ایسی ندا نہیں آئی۔ خود نبی کریمؐ، جو آخری نبی تھے اور نوعِ انسانی کے لیے جن کے بعد کفر

وایمان کے فیصلے کا کوئی دوسرا موقع آنے والا نہ تھا، آپؐ کی آمد پر بھی ایسی کوئی ندا آسمان سے نہ سنی گئی۔ مشرکین مکہ مطالبہ کرتے ہی رہے کہ آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ ہونا چاہیے جو ہمیں خبردار کرے کہ آپ خدا کے نبی ہیں، یا اور کوئی صریح بات ایسی ہونی چاہیے جس سے یقینی اور غیر مشتبہ طور پر ہمیں آپ کا نبی ہونا معلوم ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سارے مطالبوں کو ردّ فرما دیا اور انہیں قبول نہ کرنے کی یہ وجہ بھی متعدد مقامات پر قرآن میں ظاہر کر دی کہ حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دینا جس سے عقلی آزمایش وامتحان کا کوئی موقع باقی نہ رہے، حکمت خداوندی کے خلاف ہے۔ اب یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس سنت کو صرف امام مہدی کے معاملے ہی میں بدل دے گا اور ان کی بیعت کے وقت آسمان سے منادی کرائے گا کہ لوگو! یہ ہمارا خلیفہ مہدی ہے، اس کی سنو اور اطاعت کرو![1]'' (ترجمان القرآن رجب ۶۵ھ/جون ۴۶ء)

خلافت کے لیے قرشیّت کی شرط:

سوال: اسلام تمام دنیا کو پیغام دیتا ہے کہ سب انسان بحیثیت انسان ہونے کے برابر ہیں، گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، اسلام کے حرم میں داخل ہوتے ہی سب اونچ نیچ برابر ہو جاتی ہے، اگر کوئی فرق رہتا ہے تو وہ بس ﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ کے اصول پر رہتا ہے۔ پھر اس حدیث کا کیا مطلب ہے جس کا مفہوم یہ یا اس کے قریب ہے کہ خلافت قریش میں رہنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے تو پھر ہٹلر ہی نے کیا بُرا کیا اگر اپنی قوم کو تمام دنیا کی قوموں پر فائق اور سرداری کا حق دار ٹھہرایا؟ اور پھر اگر ایک قریشی کے لیے یہ حق ہے کہ قریش کو نہ صرف عجم پر بلکہ خود اہل عرب پر بھی فوقیت دے تو آخر مغربی اقوام ہی دوسری قوموں کو کم تر ٹھہرانے میں کیوں حق بجانب نہیں؟ اسلام کی اس دعوت کو حدیث کی اس روایت کے ساتھ کیوں کر منطبق کیا جا سکتا ہے؟

جواب: بسا اوقات آدمی ایک خاص ماحول میں خاص موقع ومحل پر ایک بات کہتا ہے جو اپنی جگہ بالکل صحیح ہوتی ہے، لیکن جب وہی بات اپنے محل سے الگ کر کے نقل کی جاتی ہے تو اس کی شکل کچھ اور ہی بن جاتی ہے اور اس سے ایسے معنی نکل آتے ہیں جو خود قائل کے منشا کے بالکل خلاف ہوتے

---

[1] اِس سلسلے میں مزید توضیحات کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ تجدید واحیائے دین طبع پنجم

ہیں۔ایسا ہی معاملہ اُس معنی کی احادیث کے ساتھ بھی پیش آیا ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔حتیٰ کہ اسی غلط فہمی میں پڑ کر فقہائے اسلام کے ایک بڑے گروہ نے خلافت کے لیے من جملہ اور شرائط کے قرشیت کو بھی ایک قانونی شرط قرار دے لیا۔حالاں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا کچھ اور تھا۔

اصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف اسلام کے اصولوں کی دعوت وتبلیغ بالکل بے لاگ طریقے سے فرماتے تھے، تو دوسری طرف ایک بالغ النظر مدبّر کی حیثیت سے وقت اور سوسائٹی اور ماحول کے واقعی حالات پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے اور ایسی تدابیر عمل میں لانے سے پرہیز فرماتے تھے جو چاہے اصولاً اپنی جگہ صحیح ہوں مگر واقعی حالات کا لحاظ کیے بغیر ان کو عملی جامہ پہنا دینے سے عظیم تر فتنہ رونما ہونے کا اندیشہ ہو۔آپ نے اس وقت کے عرب کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھا تھا، اور بالکل ٹھیک سمجھا تھا کہ قریش کا قبیلہ اپنے مردان کار کی قابلیت اور اپنے ان اثرات کی بِنا پر جو اسے صدیوں سے ملک میں حاصل تھے، اتنا طاقت ور قبیلہ ہے کہ اگر اس کی موجودگی میں آپ کے بعد کسی غیر قرشی کو امیر بنا دیا گیا تو وہ کام یاب نہ ہو سکے گا۔اسلام کی جو جمہوری روح آپ نے لوگوں میں پھونک دی تھی، اس کی بِنا پر عین ممکن تھا کہ مسلمان اس روح کا مظاہرہ کرنے کے لیے آپ کے بعد کسی آزاد کردہ غلام کو خلیفہ بنا لیتے، یا کسی بے اثر قبیلے کے شیخ کو منتخب کر لیتے۔لیکن اس وقت ملک کا اجتماعی نظام عملاً جس طرح کا تھا اس کو دیکھتے ہوئے یہ نہایت غلط تدبیر ہوتی۔اسی وجہ سے آپ نے لوگوں کو سمجھا دیا کہ آپ کا جانشین کوئی قریشی ہونا چاہیے۔

حضورؐ کا یہ اندازہ اس قدر صحیح تھا کہ تاریخ آپ کے بعد صدیوں تک اس کی صحت کا ثبوت دیتی رہی ہے۔قریش کے قبیلے کی زبردست مردم خیزی کا حال یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے دور میں چاروں خلیفہ اسی نے فراہم کیے، اور معلوم ہے کہ ان چاروں کی ٹکر کا کوئی آدمی فی الواقع اس وقت عرب میں نہ تھا۔پھر اسی قبیلے نے عظیم الشان اُموی سلطنت قائم کی، اسی نے عباسی سلطنت کو جنم دیا، اِسی نے اسپین میں ایک زبردست حکومت کھڑی کر دی، اور اسی نے مصر میں دولت فاطمیہ کی تاسیس کی۔ایسی زبردست قابلیتوں اور اثرات کے مالک قبیلے کی موجودگی میں اگر عملی سیاست کو نظر انداز کر کے محض نظری سیاست کا مظاہرہ کیا جاتا تو نتیجہ خلافت کی ناکامی کی صورت میں نکلتا۔ پس نبیؐ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ قانونی حیثیت سے نہ تھا کہ از روئے شرع خلیفہ کو قرشی ہونا چاہیے اور غیر قرشی کو خلافت کا حق ہی نہیں ہے، بلکہ وہ عملی سیاست کے لحاظ سے ایک ہدایت تھی اور ساتھ ہی

آپ نے یہ پیشین گوئی بھی کردی تھی کہ جب تک قریش اپنے اخلاق بلند رکھیں گے اور فی الجملہ دین کی علم برداری کرتے رہیں گے اوران میں دو آدمی بھی مردان کار پائے جائیں گے۔ ریاست انہی کو حاصل رہے گی۔

یہ جو کچھ عرض کررہا ہوں، احادیث کے تتبع سے اس کی پوری وضاحت ہوسکتی ہے۔

مسند احمد میں عمروؓ بن عاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: ''قریش قادۃ الناس'' ''قریش اہل عرب کے لیڈر ہیں۔'' بیہقی میں حضرت علیؓ کی روایت اس معنی پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ ''کان ھذا الامر فی حمیر فنزعه اللّٰه منهم وجعله فی قریش'' ''پہلے عرب کی سرداری حمیر[1] والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ نے ان سے چھین کر قریش کو دے دی۔'' دوسری روایت میں اس مضمون کی اور زیادہ تشریح ملتی ہے، مثلاً ''الناس تبع القریش فی الخیر والشر ..... بھلائی ہو یا برائی، دونوں راستوں میں اہل عرب قریش ہی کے پیچھے چلتے ہیں۔'' (مسلم عن جابرؓ)، ''بر الناس تبع البرھم وفاجر ھم تبع الفاجر ھم ..... اچھے لوگ قریش کے اچھوں کی اور بدکار لوگ قریش کے بدکاروں کی پیروی کرتے ہیں۔'' (مسند احمد عن ابی بکرؓ)، ''الناس تبع لقریش فی ھذا الشان مسلمھم لمسلمھم و کافرھم لکافرھم''..... ''اہل عرب سرداری قریش ہی کی مانتے ہیں، مسلمان، قریش کے مسلمانوں کی پیروی کرتے ہیں اور کافر، قریش کے کافروں کی۔'' (مسلم عن ابی ہریرہؓ)

اسی مضمون کو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنی سقیفۂ بنی ساعدہ والی تقریر میں بیان فرمایا کہ

''فاما العرب فلن تعرف ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش''..... ''اہل عرب تو قبیلۂ قریش کے سوا کسی اور کی سرداری سے آشنا ہی نہیں ہیں۔''

یہ سب کچھ بیان واقعہ ہے۔ جو کچھ اس وقت عرب کے واقعی حالات تھے اور صدیوں کی تاریخ نے جو حقیقی صورت حال پیدا کردی تھی، وہی ان روایات میں بیان کردی گئی ہے۔ ان میں کہیں بھی کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ معنی نکلتے ہوں کہ نبیؐ کی خواہش یہ تھی کہ قریش سردار ہوں۔ بلکہ اس واقعے کو بطور ایک واقعے کے بیان کیا گیا ہے کہ قریش ملک کے سردار ہیں۔ یہ واقعہ نبیؐ کی تشریف آوری سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔ ساری قوم کے نفسیات پر یہی لوگ

---

[1] حمیر یمن کا مشہور قبیلہ۔

چھائے ہوئے تھے۔ زندگی کے ہر پہلو میں یہ آگے تھے اور قوم ان کے پیچھے چلتی تھی۔ پھر جب کہ کفر کی طرح اسلام میں بھی یہی پیش پیش رہے اور اِنہی کے اثر سے اہل عرب نے اس دین کو قبول کیا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی اس واقعی اور تاریخی سرداری کے خلاف جنگ کرنے اور اسے بدلنے کی کوشش میں خواہ مخواہ قوت ضائع کی جاتی۔ اس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو ہدایت فرمائی کہ اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے زمانۂ اسلام میں بھی قریش کو سرداری کے مرتبے پر قائم رہنے دو:

''قد مواقریشا ولاتقدموھا''..... ''قریش کو آگے رکھو، ان کے مقابلے میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔'' (بیہقی وطبرانی)

پھر آپؐ نے متعدد مواقع پر اس بات کی بھی صراحت فرمادی کہ قریش اس مرتبہ پر اس وقت تک سرفراز ہوں گے جب تک ان میں سرداری کی صلاحیت رہے گی اور جب تک وہ اس دین کو قائم رکھیں گے:

ان ھذا الامر فی قریش لایعادیھم احد الاکبہ اللّٰہ علی وجھہ ماقاموا الدین۔

''یہ سرداری قریش میں باقی رہے گی اور جو ان کا مقابلہ کرے گا، اللہ اس کو منہ کے بل گرا دے گا، جب تک وہ اس دین کو قائم کرتے رہیں گے۔'' (بخاری، باب الامراء من قریش)

الائمۃ من قریش ما اذا حکموا فعدلوا و وعدوا فوفواو استرحموا۔

''سردار قریش ہی سے ہوتے رہیں گے، جب تک وہ اپنے حکم میں انصاف اور اپنے وعدوں کو وفا اور خلق اللہ پر رحم کرتے رہیں گے۔''

(ابوداؤد طیالسی، احمد، ابویعلیٰ طبرانی، بزار، نسائی، حاکم)

لایزال ھذا الامر فی قریش مابقی منھم اثنان۔

''یہ سرداری قریش میں رہے گی جب تک ان میں دو مردان کار بھی باقی رہیں گے۔''

(بخاری ومسلم)

ان ارشادات میں صریح طور پر یہ بات متضمن ہے کہ جب قریش اپنی اس اہلیت کو کھو دیں گے تو سرداری ان سے نکل جائے گی اور غیر قرشی بلکہ غیر اہل عرب تک سردار وپیشوا بن جائیں گے۔ اگر اسلامی شریعت میں از روئے ضابطہ خلافت صرف قریش ہی کا حق ہوتی اور غیر قرشی کو کسی صورت میں یہ حق پہنچتا ہی نہیں تو یہ بات آخر کیسے کہی جاسکتی تھی۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولی ۶۵ھ۔ اپریل ۴۶ء)

حضرت علیؓ کی امیدواری خلافت:

سوال: جماعتِ اسلامی کے ارکان بالعموم موجودہ زمانے کے جمہوری طریقوں پر جو تنقیدیں کرتے ہیں، ان میں من جملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ جو شخص خود کسی منصب یا عہدے کا امیدوار ہو یا اس کا دعوے دار بنے، اسلام کی رُو سے وہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے منتخب کیا جائے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علی جو خلافت کے اُمیدوار یا دعوے دار تھے، اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

جواب: حضرت علیؓ کی اُمیدواری و دعوے داری کا قصّہ دراصل ایک بڑے قصے کا جزو ہے، جس کی بِنا بعض مخصوص روایات پر قائم ہے۔ اس جز کو کل سے الگ کر کے تنہا اسی پر بحث کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اگر آپ اس جز کو مانتے ہیں تو اس پورے قصے کو ماننا پڑے گا جس کا جز یہ ہے اور پھر اس پر بحث کرنی ہوگی۔

اس قصے کی روایات بہت مشہور ہیں۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں سقیفۂ بنی ساعدہ کے بعد کے واقعات کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اور ابن قتیبہ نے اپنی ''الامامة والسیاسة'' میں جو نقشہ کھینچا ہے، اور ایسے ہی دوسرے لوگ جو روایات اس سلسلے میں بیان کرتے ہیں، وہ سب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اگر آپ اس تاریخ کو باور کرتے ہیں تو پھر آپ کو محمدؐ رسول اللہ مبلغِ قرآن، داعی اسلام، مزکّیِ نفوس، کی شخصیت پر اور ان کی تعلیم و تربیت کے تمام اثرات پر خطِ نسخ کھینچ دینا پڑے گا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس پاکیزہ ترین انسان کی ۲۳ سالہ تبلیغ و ہدایت سے جو جماعت تیار ہوئی تھی، اور اس کی قیادت میں جس جماعت نے بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکے سر کر کے اسلام کا جھنڈا دنیا میں بلند کیا تھا، اس کے اخلاق، اُس کے خیالات، اس کے مقاصد، اس کے ارادے، اس کی خواہشات اور اس کے طور طریق عام دنیا پرستوں سے ذرّہ برابر بھی مختلف نہ تھے۔

اس تاریخ میں ہمارے سامنے کچھ اس طرح کا نقشہ آتا ہے کہ ایک حوصلہ مند شخص نے کئی سال کی جاں فشانی سے لڑ بھڑ کر ایک ملک فتح کیا تھا اور اپنے زور بازو سے ایک سلطنت قائم کر لی تھی۔ پھر قضائے الٰہی سے اس نے وفات پائی۔ اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے رفیقوں اور ساتھیوں نے، جو سب کے سب اسی کے بنائے ہوئے آدمی تھے، اور جن پر وہ تمام عمر اعتماد کرتا رہا،

یکا یک آنکھیں پھیر لیں۔ ابھی اس کے گھر والے اس کی تجہیز و تکفین ہی میں مشغول تھے کہ اس کے ساتھیوں کو یہ فکر پڑ گئی کہ کسی طرح تخت شاہی پر قبضہ کر لیں۔ چنانچہ وہ جمع ہوئے اور پہلے آپس میں جھگڑا کرتے رہے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ یہ لقمۂ تر میرے منہ میں آئے۔ آخر بڑی ردّوکد کے بعد انہوں نے اپنے میں سے ایک کو بادشاہی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ کارروائی جب مکمل ہوگئی تو بانی سلطنت کے خاندان والوں کو اس کی خبر پہنچی اور ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ مرحوم کا بیٹا تو تھا نہیں، ایک داماد تھا۔ وہ بپھر گیا کہ میرے ہوتے اور کون وارث تخت و تاج ہوسکتا ہے۔ بیٹی بھی پیچ و تاب کھانے لگی کہ جو سلطنت اس کے باپ نے برسوں کی جان فشانی سے قائم کی تھی، اس پر دوسروں کو قبضہ کر لینے کا کیا حق ہے۔ پہلے تو خاندان والے آپس میں سر جوڑ کر مشورے کرتے رہے۔ پھر انہوں نے مرحوم بادشاہ کے پرانے پرانے ساتھیوں کو اس کے احسانات یاد دلا دلا کر اپیل کرنے شروع کیے، اور پبلک میں اپنے حق کا مطالبہ کیا۔ مرحوم کا داماد اس کی بیٹی کو دارالسلطنت کے محلوں میں لیے پھرتا رہا اور ایک ایک بااثر قبیلے میں اسے لے گیا تا کہ شاید اسی کی فریاد سے لوگوں کے دل پگھل جائیں۔ مرحوم بادشاہ کی قبر کو بھی خطاب کر کے دہائیاں دیں کہ شاید یہی اپیل کارگر ہو جائے۔ مگر کسی نے سن کر نہ دی۔ آخر بے چارہ تھک ہار کر بیٹھ رہا، اور جب مرحوم کی بیٹی بھی، جو اس کے دعوے کی اصل بنیاد تھی، دنیا سے رخصت ہوگئی، تو اس غریب نے جا کر بادل ناخواستہ غاصبِ تخت کی اطاعت قبول کر لی۔ مگر دل میں وہ برابر پیچ و تاب کھاتا رہا اور وقتاً فوقتاً اپنے اس پیچ و تاب کا اظہار بھی کسی نہ کسی طرح کرتا رہا۔

کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیتؓ اور ان کے اصحاب کبارؓ کی؟ کیا اللہ کے رسول کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دنیا کے عام بانیانِ سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبر خدا کی ۲۳ سالہ تعلیم، صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق، یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوتے تھے؟ آخر اس نقشے کو کیا مناسبت ہے قرآن اور اس کی پاکیزہ تعلیمات سے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے اور آپ کی ان بلند ترین اخلاقی ہدایات سے جو ذخیرۂ حدیث میں بھری پڑی ہیں؟ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے ان سوانح حیات سے جن میں (اس ایک قصے کے سوا) دنیا طلبی کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا؟ ابوبکرؓ و عمرؓ کی ان زندگیوں سے جن کا کوئی رنگ بھی دنیا کے بھوکے لوگوں کے رنگ ڈھنگ سے نہیں ملتا؟ اور صحابہ کرامؓ کی ان سیرتوں سے جن کے مجموعے

میں اس داستاں کے کھینچے ہوئے نقشے کو رکھ کر دیکھا جائے تو کسی طرف سے بھی اس کا جوڑ ان کے ساتھ بیٹھتا نظر نہیں آتا؟

پھر اگر اس گروہ کی تاریخ کا پورا مستند ذخیرہ ہمارے سامنے اس کے اخلاق، اس کی سیرت، اس کی ذہنیت اور اس کے نفسیات کا کچھ اور نقشہ پیش کرتا ہے اور صرف یہ ایک مجموعۂ روایات اس کے بالکل برعکس ایک اور ہی نقشہ پیش کر رہا ہے تو آخر عقل کیا کہتی ہے؟ کیا یہ کہ سمندر میں اتفاقاً آگ لگی گئی تھی؟ یا یہ کہ سمندر میں پانی تھا ہی نہیں، آگ ہی آگ تھی؟ یا یہ کہ آگ لگنے کا قصہ جھوٹا ہے، جب تمام شہادتیں اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ سمندر تھا تو وہاں پانی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا!

تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے۔ تاریخ کے صفحات تو بہر حال اس سے آلودہ ہی ہیں۔ مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا، اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی داستانیں تھیں۔ اصل میں تو ایک شخص نے ان چالوں سے دنیا کو پھانسا تھا تاکہ اپنی ایک سلطنت بنائے' اور اس قسم کے دنیا طلب مکاروں کے گرد جیسے لوگ جمع ہوا کرتے ہیں ویسے ہی لوگ اس کے گرد بھی جمع ہو گئے تھے اور تقدس کے اس ظاہری پردے میں دراصل وہ جن مقاصد کے لیے کام کر رہا تھا، اُن کا راز آخر کار اس کے اپنے گھر والوں نے فاش کر کے رکھ دیا۔ معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔

اس کے مقابلے میں تاریخ کچھ اور روایات بھی پیش کرتی ہے۔ ذرا ان کو بھی دیکھ لیجیے۔ علامہ ابو جعفر ابن جریر طبری پوری سند کے ساتھ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت سعید بن زید سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات پوچھے گئے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بیان کیا:

ان علی ابن ابی طالب کان فی بیتہ اذ جاءہٗ من انبأہٗ ان ابابکر قد جلس للبیعۃ فخرج فی قمیص لہ ما علیہ ازارولا رداء عجلا کراھیۃ ان یبطی عنھا حتی بایعہٗ، ثم جلس الیہ وبعث الٰی ثوبہ فاتاہ فتحللہ ولزم مجلسہ۔

''علی ابن ابی طالب اپنے گھر میں تھے کہ ایک شخص نے ان کو جا کر خبر دی کہ ابو بکر بیعت لینے کے لیے بیٹھے ہیں۔ یہ سن کر وہ چادر اور ازار کے بغیر نرے قمیص ہی میں نکل کھڑے ہوئے، اتنی دیر کرنی بھی انہوں نے پسند نہ کی کہ کپڑے پہن لیں۔ پہلے جا کر بیعت کی، پھر گھر سے کپڑے منگائے اور پہن کر مجلس میں بیٹھے۔''

بیہقی کی روایت اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ وہ ابوسعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ:

فصعد ابوبکر المنبر فنظر فی دجوہ القوم فلم یر الزبیر قال فدعا بالزبیر فجاء فقال قلت ابن عمة رسول اللّٰہ وحواریہ اردت ان تشق عصا المسلمین؟ فقال لا تثریب یا خلیفة رسول اللّٰہ فقام فبایعہٗ ثم نظر فی دجوہ القوم فلم یر علیا فدعا بعلی بن ابی طالب، فجاء فقال قلت ابن عم رسول اللّٰہ وختنہ علی ابنتہ اردت ان تشق عصا المسلمین؟ قال لا تثریب یا خلیفة رسول اللّٰہ فبایعہ۔

''پھر ابوبکرؓ منبر پر چڑھے اور حاضرین مجلس پر نظر ڈالی۔ دیکھا کہ زبیر موجود نہیں ہیں۔ ان کو بلانے کے لیے آدمی بھیجا۔ جب وہ آئے تو فرمایا: میں کہہ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور حضورؐ کے حواری کہاں ہیں۔ کیا تم مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا: اے جانشین رسولؐ! معاف فرمایے، پھر اُٹھے اور بیعت کی۔ پھر ابوبکرؓ نے مجمع پر دوبارہ نظر ڈالی اور دیکھا کہ علیؓ نہیں ہیں۔ انہیں بلانے کے لیے بھی آدمی بھیجا۔ جب وہ آ گئے تو فرمایا: میں کہہ رہا تھا کہ رسولؐ اللہ کے چچازاد بھائی اور داماد کہاں رہ گئے، کیا تم مسلمانوں کی جماعت سے الگ رہنا چاہتے تھے؟ انہوں نے بھی فرمایا کہ اے جانشینِ رسولؐ! معاف فرمایے۔ پھر بیعت کی۔''

ان دونوں روایتوں میں بظاہر جو تھوڑا سا اختلاف نظر آتا ہے وہ محض تفصیل کا فرق ہے، ورنہ دراصل دونوں ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔ پھر اس کی مزید تائید حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اس روایت سے ہوتی ہے جو موسیٰ بن عقبہ نے عمدہ سند کے ساتھ اپنے مغازی میں نقل کی ہے۔

ثم خطب ابوبکر واعتذر الی الناس وقال ما کنت حریصا علی الامارة یوما ولا لیلة ولا سألتھا فی سرّ ولا علانیة۔ فقبل المھاجرون مقالتہ وقال علی والزبیر ما غضبنا الا لانا اخرنا عن المشورة وانا نریٰ ابابکر احق الناس بھا، انہ لصاحب الغار وانا لنعرف شرفہٗ وخیرہ ولقد امرہ رسول اللّٰہ ان یصلی بالناس وھو حی۔

''پھر ابوبکرؓ نے (بیعت کے بعد) خطبہ دیا اور اپنی معذرت پیش کرتے ہوئے فرمایا ''میرے دل میں ایک دن یا ایک رات کے لیے بھی امارت کی ہوس نہ تھی، اور نہ میں نے کبھی خفیہ یا علانیہ اس کی خواہش کی۔'' سب مہاجرین نے حضرت ابوبکرؓ کی

اس تقریر کو خاموشی سے سنا۔ البتہ علیؓ اور زبیرؓ نے اتنا کہا کہ ہم کو شکایت صرف اس بات کی ہے کہ ہمیں مشورے میں شریک نہیں کیا گیا، ورنہ ہم بھی ابوبکرؓ کو سب سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے رفیق غار ہیں، ان کے شرف اور ان کی تجربہ کاری کا ہمیں اعتراف ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں انہی کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کیا تھا۔''

پھر علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں اپنی یہ تحقیق پیش کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کے پاسِ خاطر سے چھ مہینے تک خانہ نشین رہے' کیوں کہ وہ تقسیم میراث کے معاملے میں حضرت ابوبکرؓ سے ناراض ہوگئی تھیں، اور حضرت علیؓ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ نبی کریمؐ کی وفات سے جو داغ ان کے دل کو لگا ہے، اس پر کسی ادنیٰ وجہ ملال کا بھی اضافہ ہو۔ بعد میں جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوگیا تو حضرت علیؓ نے دوبارہ حاضر ہوکر حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی تجدید کی اور معاملات میں حصہ لینا شروع کیا۔ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ کے لیے بیعت خلافت ہوچکی، تو جناب ابوسفیان حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا: ''یہ کیا ہوا؟ قریش کے قبیلوں میں سے سب سے چھوٹے قبیلے نے تمہارے مقابلے میں اس منصب پر غلبہ پالیا؟ اے علی! اگر تم چاہو تو خدا کی قسم میں اس وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھردوں'' اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا: ''ما زلت عدوًا واللاسلام واهله فما ضرذالك الاسلام واهله شيئًا۔ انا رأينا ابا بكر لها اهلًا۔'' ''تم ساری عمر اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی کرتے رہے، مگر تمہاری دشمنی سے اسلام اور اہل اسلام کا کچھ بھی نہ بگڑ سکا۔ ہم ابوبکر کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں۔''

ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث ومناظرے میں نہیں اُلجھنا چاہتے۔ ہم نے یہ دونوں تصویریں پیش کردی ہیں۔ اب ہر صاحب عقل کو خود سوچنا چاہیے کہ ان میں سے کون سی تصویر مبلغ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیت واصحاب کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اگر پہلی تصویر پر کسی کا دل رجحتا ہو تو رجحے، مگر اس کے ساتھ ایک اُمیدواری ودعوے داری کا مسئلہ ہی نہیں، پورے دین وایمان کا مسئلہ حل طلب ہوجائے گا۔ اور اگر کوئی اس دوسری تصویر کو قبول کرے تو اس میں سرے سے اس واقعے کا کوئی وجود ہی نہیں ہے کہ حضرت علیؓ منصب خلافت کے اُمیدوار یا دعوے دار تھے۔ (ترجمان القرآن، جمادی الاولی ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

.....☆☆☆.....

فقہی مسائل

مہر غیر موٴجل کا حکم:

سوال: اگر بوقت نکاح زرمہر کی صرف تعداد مقرر کردی گئی ہو اور اس امر کی تصریح نہ کی گئی ہو کہ یہ مہر معجّل ہے یا موٴجل، تو آیا اس کو معجّل قرار دیا جائے گا یا موٴجل؟ اس مسئلے میں علما سے استفتا کیا گیا مگر جواب مختلف آئے۔ مثلاً چند جوابات یہ ہیں:

مولانا محمد کفایت اللہ صاحب ودیگر علمائے دہلی:

''اگر مہر میں موٴجل کی تصریح بھی ہو مگر اجل مجہول بجہالت فاحشہ ہو تو مہر معجّل ہو جاتا ہے اور جب کہ معجّل یا موٴجل کا لفظ استعمال نہ کیا جائے بلکہ واجب الادا کا لفظ لکھ دیا جائے تو یہ بھی معجّل ہوگا، کیوں کہ بغیر ذکر اجل کے موٴجل نہیں ہوسکتا۔ **الا اذا اجهل الاجل جهالة فاحشة فيحب حالاً۔ غايه** (درمختار) **وان كانت جهالة متفاحشة كالى الميسرة الٰى هبوب الريح الٰى ان تمطر السماء فالاجل لا يثبت ويجب المهر حالاً۔ وكذافى غاية البيان۔** (ردالمختار)

مولانا سعید احمد صاحب مدرس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ:

''مہر موٴجل اس وقت ہوگا جب بوقت عقد نکاح ادائے مہر کے لیے وقت اور تاریخ کی تعیین ہو ورنہ معجّل۔ یہی حال تمام معاملات کا ہے۔ اگر کسی نے ایک دکان سے کوئی چیز خریدی اور بات چیت میں نقد یا تاخیر تعیین وقت کا ذکر نہیں آیا تو یہ معاملہ بھی معجّل کے حکم میں ہوگا، خریدار خواہ فوراً قیمت دے دے یا بعد میں دینے کا وعدہ کرے۔ بہر صورت معجّل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوض فوراً ادا کیا جائے بلکہ صاحب حق کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ فوراً یا جب چاہے اپنے حق کا مطالبہ کرے۔ اور معاملہٴ موٴجلہ میں اجل اور تاریخ سے پہلے مطالبے اور تقاضے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس تفصیل کی رو سے معاملہ مسئولہ میں زرمہر معجّل ہے، اس لیے عورت جب چاہے، اس کا مطالبہ اور دعویٰ کرسکتی ہے۔''

مولانا سید سلیمان ندوی:

''زرِمہر میں اگر معجّل یا موٴجل کی کوئی تفصیل نہیں ہے تو عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ وقایہ میں ہے۔ **والمعجل ومؤجل ان بينا فذالك والا فالمتعارف** اگر معجّل اور موٴجل دونوں

بیان کردیے گئے ہیں تو جیسا بیان کیا گیا ہے ویسا ہوگا ورنہ عرف کا اعتبار ہوگا۔"

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نائب مفتی ریاست پیٹالہ ودیگر علما:

"اس صورت میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا (حوالہ وہی مختصر وقایہ کا ہے) اگر عرف یہ ہے کہ ایک عورت ایسے غیر مبیّن مہر کو صرف شوہر کی وفات یا طلاق ہی کے بعد حاصل کرسکتی ہے تو وہ شوہر کی وفات یا طلاق سے پہلے اسے وصول کرنے کا حق نہیں رکھتی۔"

اس اختلاف کا حل کیا ہے؟ براہِ کرم آپ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب: قرآن وحدیث کی رو سے مہر دراصل اس حقِ زوجیت کا معاوضہ ہے جو ایک مرد کو اپنی بیوی پر حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾ [النساء4:24]

"ان کے ماسوا جو تمہاری عورتیں ہیں، تمہارے لیے حلال کیا گیا کہ اپنے مالوں کے عوض ان سے طلب نکاح کرو۔"

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ [النساء4:24]

"پس جو لطف تم نے ان سے اُٹھایا ہے اس کے بدلے ان کے مہر بطور ایک فرض کے ادا کرو۔"

﴿وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ [النساء4:21]

"اور تم وہ مال کیسے لے سکتے ہو جب کہ تم میں سے ایک دوسرے سے اختلاط کر چکا ہے۔"

ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہر ہی وہ چیز ہے جس کے عوض مرد کو عورت پر شوہرانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ پھر اس کی مزید تصریح وہ احادیث کرتی ہیں جو اس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔ صحاح ستہ اور دارمی اور مسند احمد میں حضورؐ کا یہ ارشاد منقول ہے:

اَحَقُّ الشُّرُوطِ ان تُوفُوا بِهٖ مَااستَحلَلتُم بِهِ الفُرُوجَ۔

"تمام شرطوں سے بڑھ کر جو شرط اس کی مستحق ہے کہ تم اسے پورا کرو، وہ شرط وہ ہے جس پر تم عورتوں کی شرم گاہوں کو حلال کرتے ہو۔"

لِعان کا وہ مشہور مقدمہ، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زوجین کے درمیان تفریق کرائی تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب تفریق ہوچکی تو شوہر نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میرا مال مجھے واپس دلوایا جائے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا:

لَا مَالَ لَکَ اِنْ کُنْتَ صَدَقْتَ عَلَیْهَا فَهُوَ بِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا وَاِنْ کُنْتَ کَذَبْتَ عَلَیْهَا فَذٰلِکَ اَبْعَدُ لَکَ مِنْهَا۔ (مسلم، کتاب اللعان)

''مال لینے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تو نے اس پر سچا الزام لگایا ہے تو اس کی شرم گاہ جو تو نے اپنے لیے حلال کی تھی، اس کے معاوضے میں وہ مال ادا ہو چکا، اور اگر تو نے اس پر جھوٹا الزام لگایا ہے تو مال لینے کا حق تجھ سے اور بھی زیادہ دُور ہو گیا۔''

اِس سے بھی زیادہ تصریح ایک اور حدیث میں ہے جو امام احمد اپنی مسند میں لائے ہیں کہ:

مَنْ تَزَوَّجَ امْرأةً بِصُداقٍ وَنویٰ ان لا یودیه فهو زانٍ ۔

''جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ یہ مہر دینا نہیں ہے وہ زانی ہے۔''

ان تمام نصوص سے مہر کی یہ حیثیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کوئی رسمی و نمایشی چیز نہیں ہے بلکہ وہ چیز ہے جس کے معاوضے میں ایک عورت ایک مرد کے لیے حلال ہوتی ہے۔ اور ان نصوص کا اقتضا یہ ہے کہ استحلال فرج کے ساتھ ہی پورا مہر فوراً واجب الادا ہو جائے۔ الّا یہ کہ زوجین کے درمیان اس کو مؤخر کر دینے کے لیے کوئی قرارداد ہو چکی ہو۔

پس زرِ مہر کی ادائیگی کے معاملے میں اصل تعجیل ہے نہ کہ تاجیل۔ مہر کا حق یہ ہے کہ وہ استحلال فرج کے ساتھ بروقت ادا ہو، اور یہ محض ایک رعایت ہے کہ اس کو ادا کرنے میں مہلت دی جائے۔ اگر مہلت کے بارے میں زوجین کے درمیان کوئی قرار داد نہ ہوئی ہو تو اعتبار اصل (تعجیل) کا کیا جائے گا نہ کہ رعایت (یعنی تاجیل اور مہلت) کا۔ یہ بات شارع کے منشا کے بالکل خلاف معلوم ہوتی ہے کہ تاجیل کو اصل قرار دیا جائے اور تاجیل و تعجیل کے غیر مصرّح ہونے کی صورت مَیں زرمہر کو آپ سے آپ مؤجل ٹھہرایا جائے۔

فقہائے حنفیہ کے درمیان اس مسئلے میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کی رائے وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ غایۃ البیان میں ہے:

فان کان بشرط التعجیل اومسکوتًا عنه یجب حالًا ولها ان تمنع نفسها حتّٰی یعطیها المهر۔

''اگر مہر بشرط تعجیل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو (کہ معجّل ہے یا مؤجّل) تو وہ فوراً واجب ہو گا اور عورت کو حق ہو گا کہ اپنے آپ کو شوہر سے روک

لے جب تک وہ مہر ادا نہ کرے۔"

اور شرح العنایہ علی الہدایہ میں ہے:

فان سمو المهر ساكتين عن التعجيل والتاجيل ما ذا يكون حكمه؟ قلت يجب حالا فيكون حكمه حكم ما شرط تعجيله۔

"پھر اگر مہر مقرر کر دیا گیا اور معجّل یا مئوجل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ وہ فوراً واجب ہوگا، اس کا حکم اس مہر کا سا حکم ہے جس کے لیے تعجیل کی شرط کی گئی ہو۔"

اور اسبیجابی میں ہے:

اِن كان المهر معجلا اومسكوتا عنه فانه يجب حالا لان النكاح عقد معاوضة وقد تعين حقه فى الزوجة فوجب ان يتعين حقها وذلك بالتسليم۔

"اگر مہر معجّل ہو یا اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو وہ فوراً واجب ہوگا کیوں کہ نکاح ایک عقد بامعاوضہ ہے، جب زوجہ میں شوہر کا حق متعین ہو گیا تو واجب آیا کہ عورت کا حق بھی متعین ہو جائے اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مہر ادا کر دیا جائے۔"

رہا دوسرا گروہ، تو وہ کہتا ہے کہ اس معاملے میں عرف کا اعتبار کیا جائے گا۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

فان لم يبينوا قدر المعجل ينظر الى المرأة والى المهرانه كم يكون المعجل لمثل هذه المرأة من مثل هذه المهر فيعجل ذالك ولا يتقدر بالربع والخمس بل يعتبر المتعارف۔

"اگر معجّل کی مقدار واضح نہ کی گئی ہو تو دیکھا جائے گا کہ عورت کس طبقے کی ہے اور مہر کتنا ہے اور یہ کہ ایسی عورت کے لیے ایسے مہر میں سے کس قدر معجّل قرار دیا جاتا ہے۔ بس اتنی ہی مقدار معجّل قرار دی جائے، ایک چوتھائی یا پانچویں حصے کی تعیین نہ کر دینی چاہیے، جو رواج ہو اس کا اعتبار کرنا چاہیے۔"

اسی رائے کی تائید علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وان لم یشترط تعجیل شئی بل سکتوا عن تاجیله وتعجیله فان کان عرف فی تعجیل بعضه وتاخیر باقیه الی الموت اوالمیسرة اوالطلاق فلیس لها ان تحتبس الا الٰی تسلیم ذالك القدر۔

''اور اگر کسی حصۂ مہر کی تعجیل کی شرط نہ کی گئی ہو بلکہ تعجیل اور تاجیل کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہو تو رواج کو دیکھا جائے گا۔ اگر رواج یہ ہے کہ ایک حصہ معجّل قرار دیا جاتا ہے اور باقی حصہ موت تک یا خوش حالی یا طلاق تک مؤخر رکھا جاتا ہے، تو عورت صرف اتنی ہی مقدار وصول ہونے تک اپنے آپ کو شوہر سے روکنے کا حق رکھتی ہے۔''

اصولی حیثیت سے دیکھا جائے تو پہلے گروہ کی رائے قرآن وحدیث کی منشا سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کی رائے بھی بے وزن نہیں ہے۔ ان کے قول کا مدعا یہ نہیں ہے کہ مہر کے باب میں تاجیل اصل ہے اور جب تاجیل وتعجیل کی صراحت نہ ہو تو معاملہ اصل یعنی تاجیل کی طرف راجع ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ اپنے فتوے میں ایک اور قاعدے کا لحاظ کرتے ہیں جسے شریعت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں معاملات کے متعلق جو طریقہ عام طور پر مروّج ہو، اس کی حیثیت افراد کے درمیان ایک بے لکھے معاہدے کی سی ہوتی ہے۔ اگر اس سوسائٹی کے دو فریق باہم کوئی معاملہ طے کریں اور کسی خاص پہلو کے بارے میں بصراحت کوئی قرارداد نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اِس پہلو میں وہ مروّجہ طریقے پر راضی ہیں۔

بلاشبہ یہ قاعدہ شریعت میں مسلّم ہے، اور اس لحاظ سے فقہا کے دوسرے گروہ کی رائے بھی غلط نہیں ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم کسی خاص سوسائٹی میں اس قاعدے کو جاری کریں، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت نے رواج کو بطور ایک ماخذِ قانون (Source of Law) کے تسلیم نہیں کیا ہے کہ جو کچھ رواج ہو وہی شریعت کے نزدیک حق ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ غیر متقی سوسائٹی اور اس کے غیر منصفانہ رواجوں کو قبول کرنے کے بجائے ان کو بدلنا چاہتی ہے اور صرف ان رواجوں کو تسلیم کرتی ہے جو ایک اصلاح شدہ سوسائٹی میں شریعت کی روح اور اس کے اصولوں کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔ لہٰذا رواج کو بے لکھا معاہدہ مان کر مثل قانون نافذ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جس سوسائٹی کے رواج کو ہم یہ حیثیت دے رہے ہیں کیا وہ ایک متقی سوسائٹی ہے؟ اور کیا

اس کے رواج شریعت کی روح اوراس کے اصولوں کی پیروی میں پیدا ہوئے ہیں؟ اگر تحقیق سے اس کا جواب نفی میں ملے تو اس قاعدے کو مثلِ قانون جاری کرنا عدل نہیں بلکہ قطعاً ایک ظلم ہوگا۔

اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنے ملک کی موجودہ مسلم سوسائٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ تعلقاتِ زن وشوہر کے معاملے میں اس نے خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر کے اس توازن کو بہت کچھ بگاڑ دیا ہے جو شریعت نے قائم کیا تھا، اور بالعموم اس کا میلان ایسے طریقوں کی طرف ہے جو شریعت کی روح اوراس کے احکام سے صریحاً منحرف ہیں۔ اسی مہر کے معاملے کو لے لیجیے جس پر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ اِس ملک کے مسلمان بالعموم مہر کو محض ایک رسمی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اس کی وہ اہمیت قطعاً نہیں ہے جو قرآن وحدیث میں اس کو دی گئی ہے۔ نکاح کے وقت بالکل ایک نمایشی طور پر مہر کی قرارداد ہو جاتی ہے مگر اس امر کا کوئی تصور ذہنوں میں نہیں ہوتا کہ اس قرارداد کو پورا بھی کرنا ہے۔ بارہا ہم نے مہر کی بات چیت میں اپنے کانوں سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ ''میاں کون لیتا ہے کون دیتا ہے''، گویا یہ فعل محض ضابطے کی خانہ پری کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ہمارے علم میں ۸۰ فی صدی نکاح ایسے ہوتے ہیں جن میں مہر سرے سے کبھی ادا ہی نہیں کیا جاتا۔ زرِ مہر کی مقدار مقرر کرنے میں اکثر جو چیز لوگوں کے پیش نظر ہوتی ہے، وہ صرف یہ کہ اسے طلاق کی روک تھام کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس طرح عملاً عورتوں کے ایک شرعی حق کو کالعدم کر دیا گیا ہے اور اس بات کی کوئی پروا نہیں کی گئی کہ جس شریعت کی رُو سے یہ لوگ عورتوں کو مردوں پر حلال کرتے ہیں وہ مہر کو استحلال فروج کا معاوضہ قرار دیتی ہے، اور اگر معاوضہ ادا کرنے کی نیت نہ ہو تو خدا کے نزدیک عورت مرد پر حلال ہی نہیں ہوتی۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ جس سوسائٹی کا عرف اتنا بگڑ چکا ہو اور جس کے رواج نے شریعت کے احکام اور اس کی روح کے بالکل خلاف صورتیں اختیار کر لی ہوں، اس کے عرف و رواج کو از روئے شریعت جائز قرار دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ جن فقہا کی عبارتیں اعتبار عرف کی تائید میں نقل کی جاتی ہیں، ان کے پیش نظر نہ یہ بگڑی ہوئی سوسائٹی تھی اور نہ اس کے خلاف شریعت رواج۔ انہوں نے جو کچھ لکھا تھا، وہ ایک اصلاح شدہ سوسائٹی اور اس کے عرف کو پیش نظر رکھ کر لکھا تھا۔ کوئی مفتی مجرد ان کی عبارتوں کو نقل کر کے اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ فتویٰ دینے سے پہلے اصول شریعت کی روشنی میں ان کی عبارتوں کو اچھی

طرح سمجھ لے اور یہ تحقیق کر لے کہ جن حالات میں انہوں نے وہ عبارتیں لکھی تھیں، ان سے وہ حالات مختلف تو نہیں ہیں جن پر آج انہیں چسپاں کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۲ھ جولائی، اگست ۴۳ء)

بندوق کے شکار کی حلّت وحرمت:

سوال: آپ نے تفہیم القرآن میں تکبیر پڑھ کر چھوڑی ہوئی بندوق کے مرے ہوئے شکار کو حلال لکھ کر ایک نئی بات کا اختراع کیا ہے[1] جس پر مندرجہ ذیل سوالات اُٹھ رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر جواب دے کر مشکور فرماویں۔

۱۔ چاروں امام متفق ہیں کہ بندوق سے مرا ہوا شکار بوجہ چوٹ سے مرنے کے ناجائز اور حرام ہے، پھر آپ نے کن دلائل کی بِنا پر اس کو جائز لکھا ہے۔

۲۔ بندوق کی گولی میں دھار نہیں ہوتی بلکہ اس کی ضرب شدید سے جانور مرتا ہے۔ کارتوسوں پر عام طور پر لکھا ہوتا ہے کہ اس کی طاقت اتنے پونڈ ہے، یہ نہیں ہوتا کہ اس کی دھار اتنی تیز ہے۔ ضرب سے مرا ہوا شکار قطعی ناجائز ہے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔

۳۔ تفسیر حقانی میں لکھا ہے کہ قاضی شوکانی نے بندوق کے مارے ہوئے کے حرام ہونے میں اختلاف کیا ہے لیکن قاضی صاحب کا اختلاف حجت نہیں ہوسکتا، کیوں کہ وہ مجروح احادیث بیان کرنے والا ہونے کے علاوہ اہل تشیع کی طرف میلان رکھتا ہے۔

۴۔ اس مسئلے کو فروع کہنا عوام کو دھوکا دینا ہے۔ کیا حرام کو حلال کرنا بھی فروع ہی رہے گا؟

جواب: سب سے پہلے میں آپ کی اس غلط فہمی کو دُور کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو آپ کے سوال نمبر ۴ میں پائی جاتی ہے۔ آپ پوچھتے ہیں: ''کیا حرام کو حلال کرنا بھی فروع ہی رہے گا؟''

اس سلسلے میں آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایک حرام وحلال تو وہ ہے جو نص صریح میں حلال یا حرام قرار دیا گیا ہو، اور وہ اصولی چیز ہے جس میں ردوبدل کرنا موجب کفر ہو جاتا ہے۔ دوسرا حلال وحرام وہ ہے جو نصوص کی دلالتوں یا اشارات یا اقتضاآت سے استنباط کیا جائے۔ یہ فروعی چیز

---

[1] واضح رہے کہ تفہیم القرآن کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے جب رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہو رہی تھی، اُس وقت یہ مسئلہ لکھا گیا تھا اور اِسی پر یہ سوال ہمارے پاس آیا تھا۔ اب نظر ثانی کے بعد اِس میں سے یہ مسئلہ نکال دیا گیا ہے نہ اِس لیے کہ اِس معاملے میں میری رائے بدل گئی ہے، بلکہ صرف اِس وجہ سے کہ وہاں تفصیلی دلائل کا موقع نہیں تھا اور دلائل کے بغیر محض ایک رائے درج کر دینے سے خوامخواہ غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

ہے اور اس میں ہمیشہ سے علما وفقہائے اُمت، حتیٰ کہ صحابہؓ اور تابعین کے درمیان بھی اختلاف رہے ہیں۔ ایک ہی چیز کو کسی نے حلال قرار دیا ہے اور کسی نے حرام۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نوع کی استنباطی تحلیل وتحریم پر بحث وکلام سے آگے بڑھ کر کسی نے دوسرے کو یہ الزام دیا ہو کہ تمہارا دین بدل گیا ہے یا تم خدا کے حرام کیے ہوئے کو حلال کر رہے ہو۔ افسوس یہ ہے کہ اب ہمارے ہی ملک میں نہیں، دنیا بھر کے مسلمانوں میں ایک مدت سے شرعی مسائل کی آزادانہ تحقیق کا سلسلہ بند ہے اور ہر گروہ کسی ایک مذہب فقہی کی پابندی میں اس قدر جامد ہو گیا ہے کہ اپنے ہی مذہب خاص کو اصل شریعت سمجھنے لگا ہے۔ اس لیے جب لوگوں کے سامنے ان کے مانوس مسلک سے ہٹ کر کوئی تحقیق آتی ہے تو وہ اس پر اس طرح ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ گویا دین میں کوئی تحریف کی گئی ہے۔ حالاں کہ سلف میں، جب کہ آزادانہ تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا تھا، علما کے درمیان حلال وحرام اور فرض وغیر فرض تک کے اختلافات ہو جاتے تھے اور ان کو نہ صرف برداشت کیا جاتا تھا بلکہ ہر گروہ اپنے نزدیک جو حکم شرعی سمجھتا تھا، اس پر خود عمل کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی یہ حق دیتا تھا کہ ان کے نزدیک جو حکم شرعی ہو، اس پر وہ عمل کریں۔

اسی کھانے پینے کے مسئلے میں علمائے سلف کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں، ان کی چند مثالیں میں یہاں نقل کرتا ہوں اور آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ ان حضرات میں سے کس کو آپ حرام کے حلال یا حلال کے حرام کر دینے کا الزام دے سکتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ وہ درندوں کے گوشت اور اس خون کے استعمال میں جو رگوں کے اوپر کے حصے میں رہ جاتا ہے، مضائقہ نہیں سمجھتی تھیں اور ان کا استدلال اس آیت سے تھا کہ: ﴿قُلْ لَا اَجِدُ فِیْمَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ ..... الآیہ﴾

اور اسی آیت کی بنا پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ بھی ان چار چیزوں کے سوا جن کو قرآن مجید میں حرام کیا گیا ہے (یعنی سوَر، مردار، بہتا ہوا خون اور مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ) اور کسی چیز کو حرام نہیں سمجھتے تھے۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن للجصاص، منصہ سوم صفحہ ۲۰)

پالتو گدھے کے گوشت کے متعلق ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر بعض خاص وجوہ سے اس کے کھانے سے منع کیا تھا، اور یہ ممانعت اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ گدھے کا گوشت مطلقاً حرام ہے۔ (ایضاً، ص ۲۱)

درندوں اور شکاری پرندوں کے معاملے میں امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب مطلق حرمت کے قائل ہیں۔ امام مالک درندوں کو حرام سمجھتے ہیں مگر شکاری پرندوں مثلاً کرگس، عقاب، گدھ وغیرہ کو حلال قرار دیتے ہیں، خواہ وہ مردار کھاتے ہوں یا نہ کھاتے ہوں۔ امام اوزاعی صرف گدھ کو مکروہ سمجھتے ہیں، باقی ہر قسم کے پرندے ان کے ہاں حلال ہیں۔ لیث بلی کو حلال سمجھتے ہیں اور بجّو کو مکروہ۔ امام شافعی کے نزدیک صرف وہ درندے جو انسان پر حملہ کرتے ہیں، یا وہ شکاری پرندے جو انسان کے پالتو جانوروں پر حملہ کرتے ہیں حرام ہیں، بجّو اور لومڑی اس تعریف میں نہیں آتے۔ عکرمہ سے کوّے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ''موٹی مرغی ہے'' اور بجّو کے متعلق پوچھا گیا تو کہا کہ ''موٹی دنبی ہے''۔ (ایضاً ص ۲۲)

اسی طرح حشرارت الارض کے بارے میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ حنفیہ تمام حشرات الارض کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ سانپ کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ اس کے ساتھ ذکات (یعنی ذبح) کی شرط لگاتے ہیں۔ یہی رائے امام مالک کی بھی ہے۔ اور امام اوزاعی ذکات کی شرط کو بھی اُڑا دیتے ہیں۔ لیث کے نزدیک خارپشت جائز ہے۔ امام مالک کے نزدیک مینڈک جائز ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ جن چیزوں سے اہل عرب گھن کھاتے تھے بس وہی خبائث ہیں، چنانچہ اہل عرب بجّو اور لومڑی کھاتے تھے اس لیے یہ دونوں حلال ہیں۔ (ایضاً ص ۲۴)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں نص صریح موجود نہ ہو وہاں استنباط کی بِنا پر حلال و حرام کے اختلافات سب فروعی اختلافات ہیں۔ کسی مسلک فقہی میں بر بنائے اجتہاد کسی چیز کا حرام ہونا ہرگز یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ اصل شریعت الٰہی میں حرام ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی کسی چیز کو اپنے استنباط کی بِنا پر حلال قرار دے، تو اس پر بحث تو ضرور کی جا سکتی ہے لیکن یہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے کہ اس پر رونگٹے کھڑے ہونے لگیں اور تحریف دین یا تحلیلِ مَاحَرَّمَ اللّٰہُ کے الزامات عائد کیے جانے لگیں۔

اب میں اس اصل مسئلے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس پر آپ نے یہ سوالات کیے ہیں:

مجھے حیرت ہے کہ یہ بات آپ نے کہاں سے معلوم کر کے لکھی کہ بندوق سے مرے ہوئے شکار کے حرام ہونے پر چاروں امام متفق ہیں۔ کیا ائمۂ اربعہ میں سے کسی کے زمانے میں بندوق ایجاد ہو گئی تھی؟ ائمۂ اربعہ کے مقلد علما میں کسی گروہ کا یا سب کا ان کے استنباطی مسائل میں سے کسی

مسئلے سے تخریج کرتے ہوئے کوئی حکم نکالنا اور چیز ہے اور خود ائمہ کا کوئی حکم بیان کرنا اور چیز۔ بندوق بہرحال فقہائے متاخرین کے زمانے میں ایجاد ہوئی تھی اور اس کی ساخت میں تازہ ترین اصولی تغیر تو انیسویں صدی میں ہوا ہے۔ اس کے متعلق اگر کوئی حکم فقہا نے بیان کیا بھی ہے تو وہ ائمۂ سلف کے اجتہادی احکام سے تفریع در تفریع کرتے ہوئے ہی بیان کیا ہوگا، اس کی بنیاد پر آخر خوامخوہ یہ دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے کہ اس چیز کی حرمت پر ائمۂ اربعہ متفق ہیں۔

میں نے بندوق کے شکار کے حلال ہونے کا مسئلہ جو بیان کیا ہے، وہ قاضی شوکانی سے ماخوذ نہیں ہے بلکہ براہ راست کتاب وسنت سے اخذ کیا ہوا ہے۔ شریعت میں جانوروں کی ذکات (یعنی شرعی طریقے سے ان کے ذبح) کے جو احکام ہیں، ان کو اصولاً دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے:

ایک قسم کے جانور وہ جو ہمارے قابو میں ہیں اور جن کو ہم مقرر طریقے کے مطابق ذبح کر سکتے ہوں۔ ان کی شرطِ ذکات اور ہے اور اسے اصطلاحاً ذکاتِ اختیاری کہا جا سکتا ہے۔

دوسری قسم کے جانور وہ ہیں جو ہمارے قابو میں نہ ہوں، مثلاً جنگلی جانور، یا وہ اہلی جانور جو بھاگ نکلا ہو اور وحشی کے حکم میں آ گیا ہو، یا وہ جانور جو کہیں گر پڑا ہو اور جس کی شرط ذکات مقررہ طریقے پر ادا نہ کی جا سکتی ہو، یا وہ جانور جو کسی وجہ سے مرنے کے قریب ہو اور ذبح کے لیے چھری تلاش کرتے کرتے اس کے مر جانے کا امکان ہو۔ ایسے تمام جانوروں کی شرط ذکات دوسری ہے اور اسے اصطلاحاً ہم ذکات اضطراری کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

پہلی قسم کے جانوروں کا مقام ذبح حلق ہے اور ان کو ذبح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کسی تیز دھار والے آلے سے ان کے حلقوم کو اس حد تک کاٹا جائے کہ نرخرہ اور رگِ گلو کھل جائے۔

رہے دوسری قسم کے جانور، تو ان کا سارا جسم مقام ذبح ہے اور کسی چیز سے، خواہ وہ کوئی ہو، ان کے جسم میں اتنا خرق (Puncture) کر دینا کافی ہے کہ خون بہ جائے۔ اس سلسلے میں جو نصوص کتاب وسنت سے ہمیں ملتی ہیں، وہ ترتیب وار درج ذیل ہیں:

(۱) ﴿اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾

[المائدہ 4:5]

”حلال کر دی گئیں تمہارے لیے ساری پاک چیزیں۔ اور جن شکاری جانوروں کو تم

نے سدھایا ہو، جن کو تم خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو، وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑ رکھیں، اس کو تم کھالو اور اس پر اللہ کا نام لو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ سدھائے ہوئے شکاری جانور کو اگر خدا کا نام لے کر چھوڑا گیا ہو تو اس کے پنجوں اور کچلیوں سے جو زخم وحشی جانوروں کو لگ جاتا ہے اور جو خون اس طرح نکل جاتا ہے، اس سے "اضطراری ذکات" کی شرط پوری ہو جاتی ہے، اور اگر ایسا جانور زندہ نہ ملے اور اسے باقاعدہ ذبح نہ کیا جا سکا ہو تب بھی وہ حلال ہے۔

(۲) حضرت عدی ابن حاتم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہم معراض پھینک کر شکار کرتے ہیں۔ حضورؐ نے جواب دیا:

کل ما خرق وما اصاب بعرضه فقتل فانه وقیذ فلا تاکله۔ (متفق علیہ)

"یعنی اگر وہ چھید دے تو کھالو، لیکن اگر معراض اپنے عرض کی طرف سے جانور کو لگی ہو اور اس سے وہ مر گیا تو وہ چوٹ کھایا ہوا جانور (موقوذہ) ہے، اسے نہ کھاؤ۔"

معراض ایک بھاری لکڑی یا عصا کو کہتے ہیں جس کے سرے پر یا تو لوہے کی انی لگی ہوئی ہو یا ویسے ہی لکڑی کو نوک دار بنا دیا گیا ہو۔ اس کی چوٹ سے جسم کے کسی حصے کا اس حد تک پھٹ جانا یا چھد جانا کہ اس سے خون بہ جائے، شرط ذکات پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۳) رافع ابن خدیج کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کل دشمن سے ہمارا مقابلہ ہے اور ہمارے ساتھ چھریاں نہیں ہیں کہ ہم جانوروں کو ذبح کر سکیں، تو کیا ہم پھٹے ہوئے بانس کی پھچی سے ذبح کر سکتے ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا: "ما انهر الدم و ذکر اسم الله فکل لیست السن والظفر" (متفق علیہ) یعنی خدا کا نام لے کر جس چیز سے بھی خون بہا دیا جائے، ایسے جانور کو کھالو، البتہ دانتوں اور ناخنوں سے یہ کام نہ لیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز وہ آلہ نہیں ہے جس سے کام لیا جا رہا ہو، بلکہ شرط ذکات پوری کرنے میں صرف یہ بات معتبر ہے کہ خون بہا دیا جائے۔ اسی کی تائید یہ حدیث کرتی ہے کہ حضرت عدی ابن حاتمؓ نے پوچھا: "یا رسول اللہؐ! اگر ہم میں سے کسی شخص کو شکار مل جائے اور اس کے پاس چھری نہ ہو تو کیا وہ پتھر کی دھار یا پھٹی ہوئی لکڑی سے ذبح کر سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: "امرر الدم بما شئت واذکر اسم اللّٰه" یعنی خون بہا دو جس چیز سے چاہو اور اللہ کا نام لو۔

(۴) ابوالعُشَراء اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہؐ! کیا ذبح کا مقام صرف حلق اور لبلبہ ہی نہیں ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''لو طعنت فی فخذها لا جزاء عنك'' (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی) یعنی اگر تو اس کی ران میں بھی چبھودے تو کافی ہے۔ ابوداؤد کہتے ہیں کہ یہ ایسے جانور کی ذکات ہے جو کسی گڑھے وغیرہ میں گر گیا ہو۔ ترمذی کہتے ہیں کہ تمام ضرورت کے موقعوں کے لیے یہی ذکات ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو جانور ہمارے قابو میں نہیں ہے، اس کے جسم کا ہر حصہ مقام ذبح ہے۔ نیز یہ کہ اصل شے وہ آلہ نہیں ہے جس سے کام لیا جائے، بلکہ صرف جسم کو چھید دینا ہے تا کہ خون بہ جائے۔

(۵) کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ہماری بکریاں مقام سلع میں چر رہی تھیں، یکا یک ہماری لونڈی نے دیکھا کہ ایک بکری مرنے کے قریب ہے۔ اس نے فوراً ایک پتھر توڑا اور اسے ذبح کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے کی اجازت دے دی (بخاری)۔ عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ بنی حارثہ میں سے ایک شخص احد کے قریب گھاٹی میں ایک اونٹنی چرا رہا تھا، یکا یک اس نے دیکھا کہ اونٹنی مر رہی ہے، مگر اسے کوئی چیز ایسی نہیں ملی جس سے وہ ذبح کر سکتا۔ آخر اس نے خیمہ گاڑنے کی ایک میخ لی اور اسے اونٹنی کے لبلبے میں چبھو دیا، یہاں تک کہ اس کا خون بہ گیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی اور آپؐ نے اسے کھا لینے کی اجازت دے دی۔ (ابوداؤد، مؤطا)

ٹوٹے ہوئے پتھر کی دھار تو پھر بھی دھار کی تعریف میں آتی ہے، لیکن لکڑی کی نوک دار میخ کو دھاردار آلے کی تعریف میں جس حد تک لایا جا سکتا ہے، ظاہر ہے۔

مذکورۂ بالا نصوص کو سامنے رکھنے کے بعد بندوق کے مسئلے پر غور کیجیے۔ بندوق کی گولی کو غلیل کے ٹھنڈے غُلّے پر قیاس کرنا اور اس کی بِنا پر یہ سمجھنا کہ اس سے جو جانور مرتا ہے، وہ دراصل اسی طرح کی چوٹ کھا کر مرتا ہے جیسی پتھر یا لکڑی کے عرض سے لگتی ہے، صحیح نہیں ہے۔ گولی جس قوت سے بندوق سے نکلتی ہے اور پھر جس تیز رفتار کے ساتھ وہ بندوق سے نشانے تک (تقریباً ۵۰۰ گز فی سیکنڈ) راستہ طے کرتی ہے، اس کی بِنا پر وہ کوئی ٹھنڈا سنگ ریزہ نہیں رہتی، بلکہ اچھی خاصی نرم اور تقریباً نوک دار ہو کر جسم کو چھیدتی ہوئی اس میں گھستی ہے اور پھر اس سے خون بہ کر جانور مرتا ہے۔ یہ عمل شکاری جانور کے ناخنوں اور کچلیوں اور معراض یا لکڑی کی میخ کا سرا چبھنے سے کچھ بہت

زیادہ مختلف نہیں ہوتا، بلکہ خون بہانے میں بعید نہیں کہ ان سے زیادہ ہی کارگر ہو۔

ان وجوہ سے میری رائے میں اگر خدا کا نام لے کر بندوق چلائی جائے اور اس کی گولی یا چھرّے سے جانور مر جائے تو اس کے حلال نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا اس پر اطمینان نہ ہو اور وہ اس کو حرام ہی سمجھتا ہو تو مجھے اس پر بھی اصرار نہیں ہے کہ وہ ضرور اسے حلال مانے اور واجب ہے کہ اسے کھائے۔ میرا اجتہاد میرے لیے قابل عمل ہے اور دوسروں کا اجتہاد یا کسی مجتہد کا اتباع ان کے لیے۔ اس اجتہادی اختلاف سے اگرچہ میرے اور ان کے درمیان حرام وحلال کا اختلاف ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود دونوں فریق ایک ہی دین میں رہتے ہیں، الگ الگ دینوں کے پیرو نہیں ہو جاتے۔ (ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل ۶۵ھ، فروری ۴۶ء)

نظامِ کفر وفسق میں کسبِ معاش کی مشکل:

سوال: آپ کی تحریروں کو دیکھنے کے بعد میں اپنے موجودہ ذریعۂ معاش سے بیزار ہو رہا ہوں لیکن کافرانہ نظام حکومت وتمدن کے ماتحت کسب حلال قریباً ناممکن التصور ہے۔ ملازمت، کاشت کاری اور تجارت سب پیشوں میں حرام داخل ہو گیا ہے۔ پھر ہمارے لیے کون سا راستہ ہے؟

جواب: آپ کا کہنا بجا ہے کہ ایک کافرانہ نظام تمدن وسیاست کے اندر رہتے ہوئے خالص حلال کی روٹی تقریباً محال ہے، مگر میں نے وسائل رزق کے معاملے میں حلال وحرام کی تمیز پر اپنے مضامین میں بار بار جو زور دیا ہے، اس سے میرا مقصود یہ نہیں تھا کہ حلال ذرائع یہیں کہیں موجود ہیں۔ لوگ حرام ذرائع کو چھوڑ کر ان کو حاصل کر لیں۔ بلکہ اس سے میرا مقصود یہ تھا کہ حلال وحرام کی تمیز پیدا ہو جانے کے بعد ایک سچا مسلمان جب اپنے گرد وپیش کا جائزہ لے گا، تب اس کو صحیح اندازہ ہوگا کہ اس کفر کے تسلّط کی بدولت وہ کس طرح چاروں طرف گندگیوں اور نجاستوں میں گھر گیا ہے۔ پھر اگر واقعی وہ پاکیزگی کا خواہاں ہو تو اس کے اندر اس نجاست خیز نظام کو مٹانے اور بدلنے کا شدید جذبہ پیدا ہوگا اور وہ ہر آن اس نظام سے سخت نفرت وکراہت کرے گا۔

اس اصولی بات کو سمجھنے کے بعد عملی نقطۂ نظر سے ہمارے لیے اگر کچھ ممکن ہے تو صرف یہ کہ زیادہ حرام کو چھوڑ کر کم حرام یا ملوث بہ حرام رزق کو مجبوراً گوارا کریں۔ خالص حلال کی قید کے ساتھ زندگی کا سامان بہم پہنچانا اس نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن نہیں ہے۔ اب یہ آپ کے حالات پر

اور آپ کی قوتوں اور صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ عملاً کون سے ذرائع آپ اختیار کر سکتے ہیں جن میں حرام کی آمیزش کم سے کم ہو، اور آپ موجودہ کافرانہ نظام کے بقا واستحکام میں کم سے کم مددگار بنیں۔ عملاً اس میں کامیابی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ اپنے معیارِ زندگی کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ جن کے اندر حلال وحرام کی تمیز پیدا ہو چکی ہے، یہ شرط لگاتے ہیں کہ حلال تو ملے، مگر زندگی کا معیار وہی رہے جو حرام خوری کے زمانے میں ہم نے اختیار کیا تھا۔ یہ شرط انہیں مجبوراً اسی حرام خوری میں مبتلا رکھتی ہے۔ حلال خوری پر آدمی قائم اسی وقت رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس امر کا فیصلہ کر لے کہ کھانا بہر حال حلال ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ پلاؤ ہو یا چٹنی، پہننا بہر حال حلال ہے، خواہ وہ نفیس کپڑے ہوں یا ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا گاڑھا۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۶۲ھ، ستمبر، اکتوبر ۴۳ء)

رشوت وخیانت کو حلال کرنے کے بہانے:

سوال: سرکاری اہل کاروں کو جو نذرانے اور ہدیے اور تحفے ان کی طلب اور جبر واکراہ کے بغیر کاروباری لوگ اپنی خوشی سے دیتے ہیں، انہیں ملازمت پیشہ حضرات بالعموم جائز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ رشوت کی تعریف میں نہیں آتا، اس لیے یہ حلال ہونا چاہیے۔ اسی طرح سرکاری ملازموں کے تصرف میں جو سرکاری مال ہوتا ہے، اسے بھی اپنی ذاتی ضرورتوں میں استعمال کرنا یہ لوگ جائز سمجھتے ہیں۔ میں اپنے حلقۂ ملاقات میں اس گروہ کے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر میری باتوں سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا۔

جواب: ایک شخص یا اشخاص سے دوسرے شخص یا اشخاص کی طرف مال کی ملکیت منتقل ہونے کی جائز صورتیں صرف چار ہیں: ایک یہ کہ ہبہ یا عطیہ ہو، برضا ورغبت۔ دوسرے یہ کہ خرید وفروخت ہو، آپس کی رضامندی سے۔ تیسرے یہ کہ خدمت کا معاوضہ ہو، باہمی قرارداد سے۔ چوتھے یہ کہ میراث ہو، جواز روئے قانون ایک کو دوسرے سے پہنچے۔ ان کے ماسوا جتنی صورتیں انتقال ملکیت کی ہیں، سب حرام ہیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ جو روپیا ایک افسر یا اہل کار کسی صاحب غرض سے لیتا ہے، یا جو استفادہ وہ اس مال سے کرتا ہے جو دراصل پبلک کا مال ہے اور پبلک کاموں کے لیے اس کے تصرف میں دیا جاتا ہے، اس کی حیثیت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خرید وفروخت اور میراث کی

تعریف میں تو آتا نہیں۔ پھر کیا وہ ہبہ یا عطیہ ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک سوال کا جواب کافی ہے۔ کیا یہ ہبہ یا عطیہ ایک اہل کار کو اس صورت میں بھی ملتا جب کہ وہ اس منصب پر نہ ہوتا، یا پنشن پر الگ ہو چکا ہوتا۔ اگر نہیں تو یہ عطیہ یا ہبہ نہیں ہے کیوں کہ یہ اس کے منصب کی وجہ سے اس کے پاس آرہا ہے نہ کہ کسی ذاتی تعلق یا محبت یا ہم دردی کی بِنا پر۔ اب کیا یہ ان خدمات کا معاوضہ ہے جو ایک اہل کار اپنے منصب کے سلسلے میں انجام دیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ درحقیقت معاوضہ بھی نہیں ہے۔ معاوضہ تو صرف وہ تنخواہ اور الاؤنس ہیں جو ملازم ہونے کی حیثیت سے آدمی کو ملتے ہیں۔ ان کے ماسوا جو کچھ ایک اہل کار اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے سلسلے میں حاصل کرتا ہے وہ یا تو خیانت ہے جو پبلک فنڈ میں سے کی جاتی ہے، یا ناجائز خدمات کا معاوضہ ہے جو شرائط ملازمت کے خلاف عمل کرنے کے بدلے میں آدمی کو ملتا ہے۔ یا جائز خدمات کا ناجائز معاوضہ ہے، کیوں کہ شرائط ملازمت کے حدود میں رہتے ہوئے کام کرنے کا معاوضہ تو بشکل تنخواہ آدمی پہلے ہی لے چکا ہے، اس پر پھر مزید معاوضہ حاصل کرنا صریح طور پر حرام خوری ہے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب دیکھیے کہ اس معاملے میں شرعی احکام کیا ہیں:

عن ابی حُمَید الساعدی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم ھدایا العمال غلول۔ (مسند احمد)

''ابوحمید الساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سرکاری ملازمین جو ہدیے وصول کرتے ہیں، یہ خیانت ہے۔''

وعنہ، قال استعمل رسول اللّٰہ ﷺ رجلا علی الازد یقال لہ ابن اللُّتبیَّہ، فلما قدم قال ھذا لکم وھذا اُھدی لی، فقام النبی ﷺ فَحَمِدَ اللّٰہ واثنٰی علیہ ثم قال اما بعد فانی استعمل الرجل منکم علی العمل مما ولانی اللّٰہ فیقول ھذا لکم وھذا ھدیۃ اھدیت لی، افلا جلس فی بیت ابیہ وامہ حتٰی تاتیہ ھدیتہ ان کان صادقًا۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

''ان ہی ابوحمید کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اللتبیّہ نامی ایک شخص کو قبیلۂ ازد پر عامل بنا کر بھیجا۔ جب وہ وہاں سے سرکاری مال لے کر پلٹا تو بیت المال میں داخل کرتے وقت اس نے کہا کہ یہ تو ہے سرکاری مال، اور یہ ہدیہ

ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا اور اس میں حمد وثنا کے بعد فرمایا: ''میں تم میں سے ایک شخص کو اس حکومت کے کام میں جو اللہ نے میرے سپرد کی ہے، عامل بنا کر بھیجتا ہوں تو وہ آ کر مجھ سے کہتا ہے کہ یہ تو ہے سرکاری مال، اور یہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ لوگ خود ہدیے دیتے ہیں، تو کیوں نہ وہ اپنے ابا اور اپنی اماں کے گھر بیٹھا رہا کہ اس کے ہدیے اسے وہیں پہنچتے رہتے؟''

عَن بریدہ عَنِ النبی ﷺ قال من استعملناہ علی عمل فرزقناہ رزقا فما اخذ بعدُ فھم غلول۔ (ابوداؤد)

''بریدہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کو ہم کسی سرکاری خدمت پر مقرر کریں اور اسے اس کام کی تنخواہ دیں، وہ اگر اس تنخواہ کے بعد اور کچھ وصول کرے تو یہ خیانت ہے۔''

عن رویفع بن ثابت الانصاری ان النبی ﷺ قال من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاخر فلا یرکب دابۃ من فی المسلین حتّٰی اذا اعجفھا ردھا فیہ، ومن کان یؤمن باللّٰہ والیوم الاٰخر فلا یلبس ثوبا من فی المسلمین حتّٰی اذا اخلقہٗ ردّہ فیہ۔ (ابوداؤد)

''رویفع بن ثابت انصاری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ یہ حرکت نہ کرے کہ مسلمانوں کے فَے (یعنی پبلک کے مال) میں سے ایک جانور کی سواری لیتا رہے اور جب وہ بے کار ہو جائے تو اسے پھر سرکاری اصطبل میں داخل کر دے۔ اور جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو، اس کا یہ کام بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کے فے میں سے ایک کپڑا برتے اور جب وہ پرانا ہو جائے تو اسے واپس کر دے۔''

عن عبداللّٰہ ابن عمرو قال لعن رسول اللّٰہ ﷺ الراشی والمرتشی۔ (ابوداؤد)

''عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔''

عن عدی بن عَمِیْرَۃ الکندی ان رسول اللّٰہ ﷺ قال یایھا الناس من عمل منکم لنا علٰی عمل فکتمنا منه مخیطا فما فوقه فھوغل یاتی به یوم القیٰمة۔ (ابوداؤد)

''عدی بن عمیرۃ الکندی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! جو شخص ہماری حکومت میں کسی خدمت پر مقرر کیا گیا اور اس نے ایک تاگا یا اس سے بھی حقیر تر کوئی چیز ہم سے چھپا کر استعمال کی تو یہ خیانت ہے جس کا بوجھ اُٹھائے ہوئے وہ قیامت کے روز حاضر ہوگا۔''

یہ ہیں اس مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، اور یہ اپنے مدعا میں اتنے واضح ہیں کہ ان پر کسی تشریح وتوضیح کے اضافے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ اپنی حرام خوری کے لیے طرح طرح کے حیلے اور بہانے پیش کرتے ہیں اور اسے اپنی بدزبانی..... چال بازیوں کے ذریعے سے حلال بنانے کی کوشش کرتے ہیں، آپ ان سے کہیے کہ اگر حرام کھاتے ہو تو کم از کم اسے حرام تو سمجھو، شاید کبھی اللہ اس سے بچنے کی توفیق دے دے۔ لیکن اگر حرام کو حلال بنا کر کھایا تو تمہارے ضمیر مردہ ہو جائیں گے، پھر کبھی حرام سے بچنے کی خواہش دل میں پیدا ہی نہ ہو سکے گی۔ اور جب خدا کے ہاں حساب دینے کھڑے ہو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت تمہارے بدلنے سے نہیں بدل سکتی۔ حرام حرام ہی ہے، خواہ تم اسے حلال بنانے کی کتنی ہی کوشش کرو۔

پھر لوگوں سے کہیے کہ خدا اور آخرت اور حساب اور جزا وسزا، یہ سب تمہارے نزدیک محض افسانہ ہی افسانہ ہے تب تو حلال وحرام کی بحث فضول ہے۔ جانوروں کی طرح جس کھیت میں ہریالی نظر آئے اس میں گھس جاؤ، اور جائز وناجائز کی بحث کے بغیر کھاؤ جتنا کھایا جا سکے۔ لیکن اگر تمہیں یقین ہے کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے، اور کبھی اس کے سامنے جا کر حساب بھی دینا ہے، تو ذرا اس بات پر بھی غور کر لو کہ آخر یہ حرام کی کمائی کس کے لیے کرتے ہو؟ کیا اپنے جسم وجان کی پرورش کے لیے؟ مگر یہ جسم وجان تو اس خدمت پر تمہارے احسان مند نہ ہوں گے بلکہ تمہارے خلاف خدا کے ہاں اُلٹا استغاثہ کریں گے کہ تو نے ہمیں اس ظالم کی امانت میں دیا تھا اور اس نے ہمیں حرام کھلا کھلا کر پرورش کیا۔ پھر کیا بیوی بچوں کے لیے کرتے ہو؟ مگر یہ بھی قیامت کے روز تمہارے دشمن ہوں گے اور تم پر اُلٹا الزام رکھیں گے کہ یہ ظالم خود بھی بگڑا اور ہمیں بھی بگاڑ دیا۔ پھر آخر یہ

عذابِ الٰہی کے خطرے میں اپنے آپ کو کس لیے ڈال رہے ہو؟ کون ہے جو اس ناجائز خدمت پر تمہارا احسان مند ہوگا؟ کس سے اس بے جا سعی پر صلے کی توقع رکھتے ہو؟ وہ غیر الٰہی نظام حکومت جس کے ایک جز کی حیثیت سے آپ لوگ کام کر رہے ہیں، بجائے خود ناپاک ہے۔ اس کی حیثیت بالکل خنزیر کے نظام جسمانی کی سی ہے جس کی بوٹی بوٹی اور رگ رگ میں حرام سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس کے کل پرزے بن کر آپ لوگ پہلے ہی گناہ عظیم میں مبتلا ہیں۔ اب اس پر خیانت اور رشوت اور باطل طریقوں کے ارتکاب کا اضافہ کر کے اپنے آپ کو کیوں مزید خطرے میں ڈالتے ہیں؟ کیا کبھی موت آنی ہی نہیں ہے؟ یا مرنے کے بعد کوئی جائے پناہ تجویز کر رکھی ہے جہاں خدا کی پکڑ سے بچ جانے کی اُمید ہے؟ (ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۶۲ھ، ستمبر، اکتوبر ۴۳ء)

رشوت وخیانت کے متعلق چند مزید مسائل:

سوال: رشوت وخیانت کے متعلق ترجمان القرآن کے ایک گزشتہ پرچے میں رسائل ومسائل کے زیرعنوان آپ نے جن مسائل پر بحث کی ہے انہی کے متعلق چند مزید سوالات مجھے درپیش ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ ان کے مدلل جوابات سے میرے اور میرے بعض رفقا کے شبہات کو دور فرماویں گے۔ سوالات حسب ذیل ہیں:

(۱) ایسے افسروں کو ٹی پارٹیاں دینا بھی کیا رشوت میں شمار ہوگا جن کو حکومت کسی ایک فرد یا جماعت کے کام کی جانچ پڑتال کے لیے وقتی طور پر مقرر کرتی ہے؟ یہ لوگ تو غالباً اصطلاحی افسر کی حیثیت نہیں رکھتے، پھر ان کی خاطر ومدارات میں کیا حرج ہے؟

(۲) ایک گروہ کثیر کا خیال ہے کہ موجودہ انگریزی گورنمنٹ کا مال، بالخصوص وہ مال جو پبلک کے مفاد پر صرف نہیں ہوتا بلکہ اسے گورنمنٹ اپنے مفاد اور تحفظ پر صرف کرتی ہے، جس صورت میں لیا جا سکے، لے لینا جائز ہے۔ یعنی خیانتاً یا بذریعہ رشوت وغیرہ۔ اس پر دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ سود جس کا لینا قطعی حرام ہے، اعاظم علما کے فتووں کے مطابق سرکاری بینک سے وصول کر لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر اسے بینک میں چھوڑا جائے تو عیسائی مشنریوں کی وساطت سے وہ خود اسلام کے خلاف استعمال ہوگا۔ پھر فرمایئے کہ وہ مال جو کسی غلط نظام حکومت کے استحکام میں صرف ہوتا ہے اور جس کے متعلق یہ بھی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کا اپنا نہیں

ہے بلکہ رعایا ہی سے بطور غصب لیا گیا ہے، کیوں نہ اسے ہر ذریعے سے واپس حاصل کیا جائے؟

جواب: آپ نے جو سوالات کیے ہیں ان کا جواب دینے سے پہلے اصولی طور یہ بات ذہن نشین کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم جو حلال وحرام اور جائز وناجائز کی تمیز پر زور دیتے ہیں اور لوگوں کو اپنی اخلاقی ذمہ داریاں سمجھنے اور انہیں ملحوظ رکھنے کی تاکید کرتے ہیں، اس سے ہماری غرض ہرگز یہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام باطل کو ایک ایسی پرہیز گار رعایا فراہم کر کے دیں جو ان کے لیے کم سے کم حد تک وجہ پریشانی ہو۔ درحقیقت اس نظام باطل کے طبعی اور لازمی ثمرات یہی ہیں کہ لوگ اخلاقی ذمہ داریوں سے بے پروا اور اپنی خواہشات وضروریات کو پورا کرنے میں قانون کی گرفت کے سوا ہر دوسری قید سے آزاد ہوں۔ ملازموں کا رشوت خوار اور خائن ہونا اور رعیت کا وسیع معنوں میں چور ہونا اس نظام کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس نظام نے انہی صفات کی تخم ریزی کی ہے اور یہ نظام اس کا مستحق ہے کہ اس کے لیے یہی ثمرات اس کی تخم ریزی کے نتیجے میں پیدا ہوں۔ ظاہر ہے کہ خائنوں، چوروں اور بداخلاق لوگوں کی قیادت میں پاکیزہ اخلاق رکھنے والے لوگ تو پرورش نہیں پا سکتے۔ پس اخلاق کی گفتگو سے ہماری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان بدسیرت اور بدکردار کارفرماؤں کو ان کی کشت خبیث کے زہریلے ثمرات سے بچائیں اور صالح ثمرات ان کے لیے فراہم کریں۔ ہمیں جو کچھ فکر ہے وہ دراصل خود اپنے اخلاق اور اپنی سیرت وکردار کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس نظام کے برے اثرات سے اپنے بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو بچائیں اور ان کے اندر ان اعلیٰ درجے کے اخلاق کو نشو ونما دیں جن کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں موجودہ بدعمل کارکنوں اور کارفرماؤں کی بہ نسبت صالح تر ٹھہریں اور اللہ تعالیٰ دنیا کی قیادت کے لیے ان کی بہ نسبت اِن کو اہل تر قرار دے۔ اس غرض کے لیے ہم ان برائیوں سے بھی لوگوں کو بچنے کا مشورہ دیتے ہیں جن کا ارتکاب اگرچہ موجودہ نظام کے مقابلے میں کوئی برائی نہیں ہے، بلکہ شاید بھلائی کی تعریف میں آسکتا ہے، مگر وہ بجائے خود اخلاق اور شریعت کی نگاہ میں مذموم ہیں۔

اب میں سلسلہ وار آپ کے سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں:

۱۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، خواہ سرکاری ملازموں کے اپنے مستقل افسر ہوں یا کسی دوسرے محکمے کے لوگ ہوں جنہیں ان کے کام کی جانچ پڑتال وغیرہ کے لیے مقرر کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ مخلصانہ محبت اور شخصی عقیدت وگرویدگی کا تعلق ان کے دلوں میں شاید ایک فی ہزار حالات

میں بھی نہیں ہوتا۔ اگر ان سے مفاد وابستہ نہ ہوں تو غالباً کوئی شخص بھی ان کی خاطر ومدارات کا خیال تک نہ کرے۔ یہ دعوتیں اور ٹی پارٹیاں سب اس غرض سے ہوتی ہیں کہ ان کے ذریعے سے کوئی فائدہ، کوئی رعایت یا کم از کم چشم پوشی حاصل کی جائے۔ اس لیے فی الحقیقت یہ بھی اسی طرح رشوت کی تعریف میں آتی ہے جس طرح عام اور معروف رشوت۔ لیکن جیسا کہ میں نے اوپر اپنی اصولی توضیح میں بیان کیا ہے، موجودہ غیر اسلامی حکومت میں اس کے خلاف ہمیں جو کچھ بھی اعتراض ہے، اس بنیاد پر ہے کہ ایسی پارٹیوں کے دینے اور قبول کرنے سے ہمارے اپنے بھائیوں میں ناجائز ذرائع سے کام نکالنے اور لوگوں سے ناجائز فائدے اُٹھانے کی بیماری پرورش پاتی ہے۔ ورنہ یہ سارا نظام تو حرام سے بنتا، حرام کھاتا اور حرام ہی اُگلتا ہے۔

۲۔ اس سوال کو جس طریقے آپ نے سے پیش کیا ہے، اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ آپ، یا جن لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے، صرف اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہیں کہ ایک فریق کے پاس مال کس نوعیت کا ہے، مگر اس پہلو کو پیش نظر نہیں رکھتے کہ دوسرا فریق اس کو حاصل کس حق کی بِنا پر کرتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ وہ چور ہے اور اس کے پاس سارا مال چوری کا ہے۔ پھر کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے لیے اس کے ہاں چوری کرنا یا اس کی جیب کتر لینا جائز ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اگر متعین طور پر مجھے معلوم ہو کہ اس کے قبضے میں فلاں مخصوص چیز میرے مملوکہ مال سے چرائی ہوئی ہے اور پھر میں کسی وقت اسے حاصل کر لینے پر اپنے آپ کو قادر پاؤں تو میرے لیے اس کا حاصل کر لینا جائز ہوگا۔ لیکن یہ عام مفروضہ صحیح نہیں ہے کہ چور کے مقبوضہ مال کو چرا لینا بہر حال ہر شخص کے لیے حلال ہے۔

سود کی جو مثال آپ نے دی ہے وہ یہاں اس لیے منطبق نہیں ہوتی کہ سود ہم بینکر سے چھینتے یا چراتے نہیں ہیں بلکہ وہ خود اپنے قاعدے کے مطابق اسے نکالتا ہے اور ہم اس لیے مجبوراً اسے لے لیتے ہیں کہ اسے چھوڑنا ڈاکو کے اسلحہ خانے میں چند اور تلواروں کا چھوڑنا ہے تاکہ وہ ان سے مظلوموں کو ذبح کرنے میں اور زیادہ مدد لے۔ پھر اس سود کو بھی وصول کر کے خود اپنے استعمال میں لانا حلال نہیں ہے، بلکہ اسے نادار طبقوں میں تقسیم کر دینا چاہیے، اس لیے کہ یہ سارا سود دراصل ان غریبوں ہی کی جیب سے آتا ہے جو کسی دوسرے پر اس بلا کو پھینک دینے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہاں پھر یہ سمجھ لیجیے کہ ہم حکومت کے اموال پر دست درازی کی مخالفت اس لیے نہیں

کرتے کہ یہ حکومت کسی ایمان دارانہ برتاؤ کی مستحق ہے، بلکہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ خود ہمارے اندر استحقاق کے بغیر فائدہ اُٹھانے کی بیماری پرورش نہ پائے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل وآخر ۶۳ھ، مارچ، اپریل ۴۴ء)

پیشۂ وکالت اسلامی نقطۂ نظر سے:

سوال: میں نے حال ہی میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے، اور اس پیشے میں خاصا کام یاب ہوا ہوں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ایک وکیل کو قوانینِ الٰہیہ کے برخلاف روزانہ قوانین انسانی کی بِنا پر مقدمات لڑنے پڑتے ہیں۔ وہ اپنا پورا زور لگا کر اس چیز کو حق ثابت کرتا ہے جسے انسانی قوانین حق قرار دیتے ہیں، خواہ خدائی قانون کی رُو سے وہ حق ہو یا نہ ہو۔ اور اسی طرح باطل اسے ثابت کرتا ہے جو ان قوانین کی رو سے باطل ہے، خواہ قانونِ الٰہی کے تحت وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ محتاط سے محتاط وکیل بھی عدالت کے دروازے میں قدم رکھتے ہی معاً حق و باطل اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اس معیار کو تسلیم کرتا ہے جس کو انسان کی خام کار عقل نے اپنی خواہشاتِ نفس کے ماتحت مقرر کر رکھا ہے۔ غرض یہ کہ ایک وکیل کفر کی اچھی خاصی نمایندگی کے فرائض سرانجام دیتا ہے، لیکن کوئی پیشہ بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا جسے اختیار کر کے آدمی نجاستوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس دُہری مشکل کا حل کیا ہے؟ میں یہ سوال اِس مسافر کی پوری آمادگیِ عمل کے ساتھ کر رہا ہوں جو پابہ رکاب کھڑا ہو۔

جواب: اپنے پیشے کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ سو فی صدی صحیح ہے اور آپ کی سلامتِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص حلال رزق حاصل کرنا اور مطابق شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچ کر کم حرام اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے اور بغاوت سے بچ کر ایسی معصیت کو مجبوراً گوارا کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ چکے ہیں کہ یہ قانون الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر کسی دوسرے پیشے میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہرحال وہ بغاوت سے تو کم درجے ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد

پرآدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم ازکم اس درجے میں تو حرام نہیں ہیں جس درجے کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے[1]۔ (ترجمان القرآن۔محرم،صفر۶۳ھ،جنوری،فروری۴۴ء)

عالمانہ جاہلیت:

سوال: ایک عالمِ دین اور صاحبِ دل بزرگ خطبات اور سیاسی کش مکش (جلد۳) پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ملازمتیں غیر اللہ کی اطاعت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ یہ تو اپنی اور اپنے اہل ملک کی خدمت ہے۔ یہ حد درجے غلط طریق کار ہے کہ خزائنِ ارض پر ہندو اور سکھ بطور حاکم مسلّط ہوں اور مسلمان شودر کی حیثیت میں صرف مطالبہ گزار بن کر رہ جائیں، اور ملازمت کریں بھی تو اس کی آمدنی کو حرام سمجھ کر کھایا کریں۔ میں حیران ہوں کہ ان کو کیا جواب دوں؟

جواب: جن صاحب کے اعتراضات کا آپ نے ذکر کیا ہے، اگر ان کے متعلق آپ یہ نہ لکھتے وہ عالمِ دین اور صاحبِ دل ہیں، تو ان کے اعتراضات کو پڑھ کر میں اس کے بالکل برعکس رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا اور صبر کر لیتا۔ لیکن اب آپ سے یہ معلوم کر کے کہ وہ ماشاء اللہ دل اور دین دونوں رکھتے ہیں، ان کے یہ خیالات میرے لیے سخت حیرت کے موجب ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ جب اس قسم کی باتیں کریں تو ان سے کوسوں دُور رہنا چاہیے۔ بہکے ہوئے جاہلوں کو سمجھایا جاسکتا ہے، مگر بہکے ہوئے عالموں کو سمجھانے کی کوشش فضول ہے۔ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں، اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا میرے بس میں نہیں ہے، اور اگر اس کو پڑھ کر بھی ان لوگوں کا اطمینان نہیں ہوتا تو جس راستے پر یہ چل رہے ہیں، اسی پر چلے جائیں، مرنے کے بعد حقیقت ان پر بھی کھل جائے گی اور مجھ پر بھی۔

نوٹ: اس سے پہلے کے استفسار میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں، ان کے بالمقابل ذرا ان خیالات پر بھی نگاہ ڈالیے۔ ایک طرف ایک جدید تعلیم یافتہ سیدھا سادھا مسلمان ہے اور دوسری طرف ایک عالمِ دین اور صاحب دل بزرگ۔ اس تقابل سے اندازہ کیجیے کہ جس گروہ کی امتیازی علامت ہی تقویٰ ہونی چاہیے تھی، آج وہ کس طرح سوچ رہا ہے اور دوسری طرف جو لوگ دہریت والحاد کی فضا میں ناخدا شناس تعلیم وتربیت پا کر نکلے تھے اور جن کے پاس ان دین دار بزرگوں کی بہ

---

[1] وکالت کے بارے میں زیادہ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ''اسلامی قانون'' از مصنف۔

نسبت اپنی غلط روی کے لیے بے شمار عذرات موجود تھے، ان کے اندر آج ضمیر کی بے داری کے کیسے خوش گوار آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

کاسبِ حرام کے ساتھ معاشی تعلقات کے حدود:

سوال: (۱) مشترک کاروبار جس میں صالحین و فاجرین ملے جلے ہوں، پھر فاجرین میں بائع خمر، آکلِ ربو وغیرہ شامل ہوں، اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

(۲) کاسبِ حرام سے روپیا قرض لے کر اس سے تجارت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(۳) کاسبِ حرام کے ہاں نوکر رہنا یا اس کے ہاں سے کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: (۱) تجارت اگر بجائے خود حلال نوعیت کی ہو اور جائز طریقوں سے کی جائے تو اس میں کسی پرہیز گار آدمی کی شرکت محض اس وجہ سے ناجائز نہیں ہو سکتی کہ دوسرے شرکا اپنا مال حرام ذرائع سے کما کر لائے ہیں۔ آپ کا اپنا سرمایہ اگر حلال ہے، اور کاروبار حلال طریقوں سے کیا جا رہا ہے، تو جو منافع آپ کو اپنے سرمایے پر ملے گا، وہ آپ کے لیے حلال ہوگا۔

(۲) کاسبِ حرام سے قرض لے کر کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے پاس روپیا حرام کا سہی، آپ کو تو وہ حلال راستے سے پہنچ رہا ہے۔

(۳) کاسبِ حرام کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک تو وہ جس کا پیشہ فحشا کی تعریف میں آتا ہے، مثلاً زنان بازاری کا کسب۔ اس کے قریب جانا بھی جائز نہیں، کجا کہ اس کے ہاں نوکر ہونا۔ دوسرا وہ کاسبِ حرام ہے جس کا پیشہ حرام تو ہے، مگر فحشا کی تعریف میں نہیں آتا، جیسے وکیل یا سودی ذرائع سے کمانے والا۔ اس کے کسی ایسے کام میں نوکری کرنا جس میں آدمی کو خود بھی حرام کام کرنے پڑتے ہوں، مثلاً اس کی روٹی پکا دینا یا اس کے ہاں سائیس یا ڈرائیور کا کام کرنا، یا اس کا مکان بنانے کی مزدوری، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ رہا اس کے ہاں کھانا کھانا، تو اس سے پرہیز ہی اَولیٰ ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

والدین کی مشتبہ جائداد اور کمائی سے استفادہ:

سوال: مدت سے جماعتِ اسلامی میں شامل ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوں مگر رزق حرام سے اپنے آپ کو بچانے اور حلال اور طیّب طریقوں سے ضروریاتِ زندگی حاصل

کرنے میں کام یاب نہیں ہورہا ہوں۔ ہمارا آبائی ذریعۂ معاش زمین داری ہے اور مجھے یہ معلوم ہے کہ مدتوں سے ہماری زمینیں نہ تو شرعی ضابطے کے مطابق وارثوں میں تقسیم ہوئی ہیں اور نہ ان میں سے شرعی حقوق ادا کیے جاتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مجبوراً میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے والدین سے روپیا لیتا ہوں۔ اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیندہ جو میراث مجھے ان سے پہنچنی ہے وہ مجھے لینی چاہیے یا نہیں؟

جواب: زمانۂ جاہلیت کی جائدادیں جو غیر اسلامی معاشی نظام میں پیدا ہوئی ہوں اور ایک سے دوسرے کو غیر اسلامی طریقوں پر منتقل ہوتی رہی ہوں، اصولاً تو ساری کی ساری مشتبہ اور غلط ہوتی ہیں، لیکن مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ جو ایسی جائدادیں آباواجداد کے ترکے میں پہنچی ہیں، انہیں وہ تلف کردیں یا ان سے دست بردار ہوجائیں۔ اور نہ انہیں یہی تکلیف دی گئی ہے کہ کسی مال کو لیتے ہوئے اس کی ابتدائی اصل کی تحقیق کریں۔ بلکہ حکم صرف یہ دیا گیا ہے کہ جب سے تم اسلام کو اپنے قانونِ زندگی کی حیثیت سے قبول کررہے ہو، اس وقت سے کوئی مال تمہارے پاس نہ تو ناجائز طریقے سے آئے اور نہ کسی ناجائز راستے میں جائے، اور یہ کہ جتنے تصرفات اس میں آیندہ تم کرو، وہ سب شریعت کے مطابق ہوں۔ رہے سابق کے اہل حقوق، تو اگر وہ موجود ہوں اور ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو ان کے حق انہیں ادا کردیے جائیں، ورنہ ایسے اموال کو اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے آیندہ جن جن لوگوں کے حق ان اموال میں پیدا ہوں وہ ادا کیے جاتے رہیں۔ (ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۴ھ، جنوری، فروری ۴۵ء)

اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے:

سوال: ہماری بستی میں ایک صاحب ہیں جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دوسرے احکام اسلامی کے پابند ہیں، گناہ کبیرہ سے پرہیز کرنے والے ہیں، مگر ان کا کچھ عجیب حال ہے۔ مثلاً وہ والدین کی خدمت تو سرانجام دیتے ہیں اور ان کے کام میں بھی مدد کرتے ہیں، مگر ان کی املاک سے کچھ نہیں لیتے، حتیٰ کہ ان کا کھانا تک نہیں کھاتے، محض اس بنا پر کہ ان کے والد کاروبار کے لیے جھوٹ بولتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے تمام عزیز و رشتہ دار جن کی کمائیوں میں انہیں حرام آمدنی کے شامل ہونے کا شبہ ہوتا ہے، ان کے ہاں بھی کھانے پینے سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ رشوت خوروں،

سرکاری ملازموں، سودی لین دین کرنے والوں اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں بددیانتی کرنے والوں سے بھی ان کا یہی معاملہ ہے۔ حد یہ کہ ایک امام مسجد ہیں جن کو ناجائز کمائی کرنے والے بعض اصحاب وظیفہ دیتے ہیں۔ یہ صاحب ان کے ہاں بھی کھانے یا چائے وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے۔ اگر کبھی سفر میں مجبوراً کسی ایسے شخص کے ہاں کھانا کھالینے کی نوبت آئے تو یہ کھانے کی قیمت کا اندازہ کرکے اس سے زیادہ قیمت کا کوئی ہدیہ وہاں روانہ کردیں گے اور اگر کسی ناجائز کمائی کرنے والے کے ہاں مجبوراً کچھ کھا پی لیں گے تو اندازاً اس کا معاوضہ خیراتی فنڈ میں جمع کرکے یہ دعا کریں گے کہ یا اللہ اس کا ثواب فلاں کو پہنچے، جس کے ہاں سے میں نے کھایا پیا ہے۔ اس سارے معاملے کی اُس دوسرے شخص کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔

خود ان مسلم متقی صاحب کی آمدنی ایک قطعی جائز تجارت سے ہوتی ہے جس میں یہ کوئی جھوٹ نہیں بولتے۔ اس کمائی سے اعزہ اور احباب کو کھانے اور چائے کی دعوت اکثر دیتے رہتے ہیں۔ اب ان کی اس پرہیز گاری سے ان کے والدین اور دوسرے اعزہ سخت نالاں ہیں۔ پڑوسیوں میں بھی ایک ہل چل مچ گئی ہے اور بستی میں ان کے خلاف ناراضی پیدا ہورہی ہے۔ مہربانی کرکے ہمیں یہ بتایئے کہ یہ متقی صاحب صحیح راستے پر ہیں یا نہیں؟ ان کی روش قرآن وحدیث کی حدود کے اندر ہے یا متجاوز؟ اور ان کا یہ تقویٰ ٹھوس اصولی ہے یا فروعی یا مستحب؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں ان کے نفس نے فریب دیا ہو؟

جواب: آپ کا سوال پڑھ کر بڑا تعجب ہوا۔ بجائے اس کے کہ آپ کی بستی کے لوگ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ ان کے درمیان ایک نیک بندہ ایسا ہے جو خود حلال کی کمائی کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی نیکی کی تلقین کرتا ہے اور دوسرے لوگ حرام رزق یا مشتبہ رزق کھانے والے ہیں تو وہ اپنے آپ کو اس ناپاکی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، نیز بجائے اس کے کہ لوگ اس کی زندگی سے سبق لیتے اور خود اس کے ماں باپ اور رشتہ دار شکر بجالاتے کہ ان کے گھر میں ایک ایسا پرہیز گار مردِ خدا پیدا ہوا ہے۔ بستی کے لوگ اور ماں باپ اور اقربا الٹے اس سے بگڑتے ہیں اور اس کے متعلق پوچھ رہے ہیں کہ اس کی یہ پرہیز گاری کیسی ہے۔ وہ اگر اعتدال سے زیادہ سختی بھی کررہا ہے تو اس کی زیادتی نیکی کی طرف ہے نہ کہ برائی کی طرف۔ آپ لوگوں کو اس کی پرہیز گاری کے متعلق پوچھنے کے بجائے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ جو لوگ تجارت جیسے پاک ذریعۂ رزق کو بھی جھوٹ سے

ناپاک کر لیتے ہیں اور جو لوگ رشوت اور ظلم اور ایسے ہی دوسرے حرام ذرائع سے روزی حاصل کرتے ہیں، ان کی یہ ناپرہیز گاری کیسی ہے! قصوروار کون زیادہ ہے؟ وہ جوان گندگیوں سے خود بچتا ہے اور دوسروں کو بچانا چاہتا ہے یا وہ جوان گندگیوں میں خود مبتلا ہوتے ہیں اور بچنے والے کو اُلٹی ملامت کرتے ہیں؟

مجھے یہ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی اخلاقی پستی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی بستیوں میں خدا کا قانون توڑنے والے مزے سے دندناتے پھرتے ہیں اور رب العالمین کے قانون کی پابندی کرنے والے اور اس کی اطاعت کی تلقین کرنے والے اُلٹے نکو بن جاتے ہیں۔

متعفن فضا میں اگر کہیں سے خوش بو کی ایک ذرا سی لپٹ آ رہی ہو تو تندرست دماغ اس کی طرف لپکتے ہیں اور ان کا جی چاہتا ہے کہ ساری فضا ہی ایسی ہو جائے۔ لیکن ماتم کے قابل ہے ان بیمار دماغوں کا حال جو خوش بو کی اس لپٹ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ فضا میں اتنی سی خوش بو بھی باقی نہ رہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ فضا کی عفونت نے ان دماغوں کو اندر تک سڑا دیا ہے، حتیٰ کہ اب ان کے لیے بدبو گوارا ہو گئی ہے اور خوش بو ناگوار۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

امانت، قرض، صلۂ رحمی:

سوال: (۱) امانت رکھنے اور رکھوانے والے کو کیا کیا اصول ملحوظ رکھنے چاہییں؟

(۲) قرضِ حسنہ دینے اور لینے میں کن اُمور کا لحاظ ضروری ہے؟

(۳) صلہ رحمی کا مفہوم کیا ہے اور شریعت میں اس کی اہمیت کس حد تک ہے؟

جواب: (۱) امانت اصل میں دو آدمیوں کے درمیان باہمی اعتماد کی بنا پر ہوتی ہے۔ جو شخص کسی کے پاس کوئی امانت رکھتا ہے وہ گویا اس پر یہ اعتماد کرتا ہے کہ وہ اپنی حد استطاعت تک پوری ایمان داری کے ساتھ اس کی حفاظت کرے گا۔ اور جو شخص اس امانت کو اپنی حفاظت میں لینا قبول کرتا ہے وہ بھی امانت رکھنے والے پر یہ اعتماد کرتا ہے کہ وہ ایک جائز قسم کی امانت اس کے پاس رکھ رہا ہے، کوئی چوری کا مال یا خلافِ قانون چیز نہیں رکھ رہا ہے، نہ اس امانت کے ذریعے سے کسی

قسم کا دھوکا یا فریب کر کے اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پس دونوں پر اس کے سوا کسی اور چیز کی پابندی لازم نہیں ہے کہ وہ اس اعتماد کا پورا پورا حق ادا کریں۔

(۲) قرض دینے اور لینے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ حتی الامکان فریقین کے درمیان شرائط قرض صاف صاف طے ہوں، مدت کا تعین ہو جائے، تحریر اور شہادت ہو۔ جو شخص قرض دے وہ اس قرض کے دباؤ سے کسی قسم کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ مقروض کو احسان رکھ کر نہ ذلیل کرے اور نہ اذیت پہنچانے کی کوشش کرے۔ اور اگر مدت گزر جائے اور فی الواقع مقروض شخص قرضہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کو جہاں تک ممکن ہو مہلت دے اور اپنے قرض کی وصولی میں زیادہ سختی نہ کرے۔ دوسری طرف قرض لینے والے کو لازم ہے کہ جس وقت وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو، اسی وقت ادا کر دے اور جان بوجھ کر ادائے قرض میں تساہل یا ٹال مٹول نہ کرے۔

(۳) صلۂ رحمی کا مفہوم رشتہ داری کے تعلق کی بِنا پر ہم دردی، معاونت، حسنِ سلوک، خیر خواہی اور جائز حدود تک حمایت کرنا ہے۔ اس کی کوئی حد نہ مقرر ہے، نہ کی جا سکتی ہے۔ دراصل یہ عام معروفات میں سے ہے جنہیں لوگ خود ہی جانتے ہیں۔ اور صلہ رحمی میں کوتاہی کرنا یا قطع رحمی کرنا ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن کی سخت مذمت قرآن وحدیث میں کی گئی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

کنوز کا نصابِ زکوٰۃ:

سوال: تمام کتب فقہ میں مذکور ہے کہ چاندی کا نصابِ زکوٰۃ دو سو درہم، ساڑھے باون تولے) ہے اور سونے کا ۲۰ دینار ساڑھے سات۔ اور علما فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس چاندی اور سونا دونوں ہوں اور ہر ایک نصاب مقررہ سے کم ہو تو اس صورت میں سونے کی قیمت چاندی سے لگا کر، یا چاندی کی قیمت سونے سے لگا کر، دونوں میں سے جو صورت بھی انفع للفقراء ہو، مجموعے کو دیکھیں گے۔ یہاں تک تو بات صاف ہے۔ لیکن وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر صرف چاندی ہو تو چاندی کا نصاب ہوگا اور اگر صرف سونا ہو تو سونے کا نصاب حساب کی اساس ہوگا۔ اس بِنا پر لازم آتا ہے کہ اگر کسی کے پاس ۶۰ روپے ہوں تو اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی مگر جس کے پاس ۶ تولے سونا

ہے، وہ زکوٰۃ سے بَری ہے۔ حالاں کہ مال دار ہونے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ موجودہ نرخ کے مطابق تقریباً ۵۰۰ روپے کا مالک ہے۔ بہرحال علما کے فتوے شخص اوّل پر زکوٰۃ فرض قرار دیتے ہیں اور شخص ثانی پر زکوٰۃ عائد ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن کم مال دار سے زکوٰۃ لینا اور زیادہ مال دار کو چھوڑ دینا تعجب انگیز بات ہے۔

میں تو اپنی جگہ یہ سمجھا ہوں کہ زمانۂ قدیم میں چاندی اور سونے کی مالیت میں وہ نسبت نہ تھی جو آج کل ہے۔ آج کل تو ۱:۷۵ یا ۱:۸۰ کی نسبت ہے مگر دورِ نبوی میں تقریباً ۱:۷ کی تھی۔ زکوٰۃ کی فرضیت میں مالیت کا اعتبار کیا گیا ہے اور ۱۴۰ مثقال چاندی کنوز کا بنیادی نصاب زکوٰۃ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کا نصاب متعین کرتے ہوئے اسی چاندی کی مقدار کو ذکر فرمایا۔ اس دَور میں ۱۴۰ مثقال چاندی کی مالیت کا سونا چوں کہ ۲۰ مثقال (ساڑھے سات تولے) ہی بنتا تھا اس لیے یہ نصاب قرار پایا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تا قیام قیامت سونے کی زکوٰۃ کے لیے ساڑھے سات تولے ہی مستقل نصاب متعین رہے۔ بلکہ سونے کی وہ مقدار نصابِ زکوٰۃ ہوگی جو ساڑھے باون تولے چاندی کی ملکیت کے برابر ہو یعنی جس شخص کے پاس سونا ہو، وہ اس کی قیمت لگا کر دیکھے۔ اگر وہ ساڑھے باون تولے چاندی کی قیمت کو پہنچ جاتی ہے، یا اس سے بڑھ جاتی ہے، تو اس پر زکوٰۃ ادا کرے۔

میرے اس خیال کی تائید نہ کسی فقہی کتاب کی عبارات کرتی ہیں نہ علمائے وقت ہی اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس وجہ سے مجھے اپنی رائے پر اعتماد نہیں ہے۔ آپ جس پہلو کو مرجح قرار دیں میرے لیے موجب اطمینان ہوگا۔

جواب: آپ کا خیال اس حد تک تو درست ہے کہ نبیؐ کے زمانے میں چاندی اور سونے کی قیمتوں میں وہی نسبت تھی جو نصاب کی مقدار سے معلوم ہوتی ہے۔ یعنی ساڑھے باون تولے چاندی = ساڑھے باون تولے سونا۔ لیکن آپ کے اس خیال سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ اب نسبتوں میں جو فرق عظیم ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے سونے کے نصاب کو بدل کر اس کے لیے بھی چاندی ہی کی قیمت کو نصاب بنا دیا جائے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:

۱۔ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اصل سونے کو قرار دیا جائے یا چاندی کو؟ سونے کا نصاب چاندی کی قیمت کے معیار پر کم وبیش کیا جائے یا چاندی کے نصاب کو سونے کی قیمت کے معیار پر

گھٹایا اور بڑھایا جاتا رہے؟ ان میں سے جس کو بھی اصل اور معیار قرار دیا جائے گا، وہ ایک غیر شرعی فعل ہوگا، کیوں کہ شارع نے دونوں کا حکم الگ الگ مستقلاً بیان کیا ہے اور اشارتاً و کنایتاً بھی کوئی ایسی بات نہیں فرمائی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہو کہ سونے اور چاندی میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لیے اصل اور معیار قرار دینا شارع کا منشا تھا۔

۲۔ محض انفع للفقراء ہونا کوئی ایسی قطعی اور ثابت شدہ اصل نہیں ہے جس پر اعتماد کر کے شارع کے ایک منصوص حکم میں ترمیم کرنے کی جرأت کر ڈالی جائے۔

۳۔ سونے اور چاندی کی نسبتوں میں آئے دن تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اگر ان کی مقداروں کا الگ الگ مستقل نصاب نہ ہو اور ایک کے نصاب کو دوسرے کی آئے دن بدلنے والی قیمتوں پر موقوف کر دیا جائے تو ان دائمی تغیرات کی وجہ سے کوئی ایک مستقل شرعی حکم باقی نہ رہے گا، اور عوام الناس کو تعمیل حکم میں عملی زحمتیں بھی پیش آئیں گی۔

۴۔ جو مشکل آپ سونے اور چاندی کے معاملے میں پیش کر رہے ہیں وہی بکریوں، اونٹوں، گایوں، بھینسوں اور گھوڑوں کے نصاب میں بھی پیش آتی ہے۔ ان کی قیمتوں کی باہمی نسبتوں میں بھی مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بہت بڑا فرق ہوتا رہتا ہے، اور ان کے بارے میں بھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کی قیمت کو اصل قرار دے کر دوسری سب انواع کے نصاب کو اس کے مطابق بدلا جاتا رہے۔

ان وجوہ سے مناسب یہی ہے کہ مختلف اشیا کی زکوٰۃ کے لیے خود شارع نے جو نصاب مقرر کر دیا ہے اور جس مقدار یا تعداد پر زکوٰۃ عائد کر دی ہے، اسی کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۶۵ھ، جون ۴۶ء)

دارالکفر میں سودخواری:

سوال: ایک متدیّن بزرگ جو ایک یونی ورسٹی میں دینیات کے پروفیسر بھی ہیں، اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''جو تاجر یا زمین دار گورنمنٹ کو ٹیکس یا لگان دے رہے ہیں، اگر وہ ڈاک خانے یا امپریل بنک میں روپیا جمع کر کے گورنمنٹ سے سود وصول کریں تو ان کو بقدر اپنے ادا کردہ ٹیکس و لگان کے

گورنمنٹ سے سود لینا جائز ہے۔"

ایک دوسرے مشہور ومعروف عالم دین اس سے آگے قدم رکھ کے فرماتے ہیں:

"قرآن، حدیث، اجماع، قیاس، الغرض کسی بھی شرعی دلیل سے حربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت کوئی صاحب پیش کر سکتے ہوں تو کریں.....افسوس کہ علمائے اسلام نے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، ورنہ اِدھر ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہو گئے غالباً یہ صورت حالات نہ ہوتی۔ ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ سود لیتا رہا اور دوسرا طبقہ سود دیتا رہا، اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے، اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں، بلکہ زیادہ تر علما پر اس لیے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت کا علاج موجود تھا لیکن انہوں نے ایک جز پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا۔"

علمائے کرام کی ان بحثوں نے ہم کو تذبذب میں ڈال دیا ہے کہ سود سے اجتناب کی جس روش پر ہم اب تک قائم ہیں، کہیں وہ غلط تو نہیں ہے۔ یہ تو عجیب معاملہ ہوگا کہ ایک طرف تو ہم آخرت ہی کے اجر کی امید پر دنیا میں نقصان اُٹھائیں اور دوسری طرف آخرت میں جا کر ہم کو یہ جواب مل جائے کہ تمہارا سود سے اجتناب کسی شرعی حکم کے مطابق نہ تھا، لہٰذا تم کسی اجر کے مستحق نہیں ہو۔

جواب: سود کی حرمت قرآن اور حدیث کی قطعی نصوص سے بالتصریح ثابت ہے، فقہ کی کوئی اصطلاحی بحث ان نصوص کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا آپ اطمینان رکھیں کہ علما کے ان ارشادات کے باوجود آخرت میں آپ کا اجر محفوظ ہے۔

قانون کی پیچیدہ بحثوں سے قطع نظر کر کے اگر ہم ایک سیدھے سادھے مسلمان کے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیں تو بداہتاً یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام دین واخلاق اور تمدن وتہذیب کے ان اصولوں کی علم برداری کرنا ہے جنہیں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں حق کہا گیا ہے، اور دنیا سے ان خیالات اور طریقوں کو مٹانے کی کوشش کرنا ہے جنہیں قرآن اور سنت نے باطل ٹھہرایا ہے۔ جس سرزمین میں باطل کا غلبہ ہو اور احکام کفر جاری ہو رہے ہوں، وہاں ہمارا کام باطل طریقوں کو اختیار کر لینا نہیں ہے، بلکہ ہمارا اصلی منصب یہ ہے کہ ہم وہاں رہ کر قرآن کے قانونِ حیات کی تبلیغ کریں اور نظام کفر کی جگہ نظام اسلامی قائم

کرنے کے لیے ساعی ہوں۔ اب غور کیجیے کہ اگر ہم خود سود کھائیں گے تو کفار کی سود خواری کے خلاف آواز کس منہ سے اُٹھائیں گے؟ کفار اگر ناجائز طریقوں سے ہمارے اموال لے رہے ہیں یا حکومت کفر ہمارے اموال سے اگر بلا استحقاق (یعنی خدا کی سند پر مبنی حق کے بغیر) کوئی حصہ لے اڑتی ہے تو ہمارے لیے یہ کیسے روا ہوسکتا ہے کہ ہم ان اموال کو واپس لینے کے لیے ویسی ہی ناجائز کارروائیاں کرنے لگیں اور کسب حرام کو اپنا حق واپس لینے کا ذریعہ بنائیں؟ اس طرح تو سود خواری کے ساتھ شراب نوشی، مزامیر سازی، فحش فلم بنانا، عصمت فروشی، کاروبار رقص وسرود، بت تراشی، فحش نگاری، سٹہ بازی، جوئے بازی اور سارے ہی حرام کاموں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر یہ فرمایئے کہ ہم میں اور کفار میں وہ کون سا اخلاقی فرق باقی رہ جاتا ہے جس کے بل پر ہم دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرسکیں؟

اصل میں مسئلے کی صورت یہ ہے کہ حکومت کفر کے آئین کی رُو سے آپ پر یہ سب حرام ہیں۔ اگر آپ شریعت اسلام کے پیروکار ہیں تو آپ حکومت کفر کے آئین کی ڈھیل سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتے اور اگر آپ ایک طرف دنیا کو شریعتِ اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری طرف کچھ فائدوں کے لیے یا کچھ نقصانات سے بچنے کے لیے حرام خوری کی ان گنجایشوں سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں جو آئین کفر نے دی ہیں مگر آئین اسلام نے جن کی سخت مذمت کی ہے تو چاہے فقیہ شہر آپ کے اس طرزِ عمل کے جواز کا فتویٰ بھی دے دے، لیکن عام انسانی رائے اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ پھر بھی وہ آپ کی تبلیغ کا کوئی اخلاقی اثر قبول کرے گی۔

حقیقتاً اس طرز فکر کو فقہ اسلامی میں استعمال کرنا ہی غلط ہے کہ مسلمانوں کو فلاں تکلیف اور فلاں نقصان جو حکومتِ کفر کے تحت رہتے ہوئے پہنچ رہا ہے، اسے روکنے کے لیے نظامِ باطل ہی کے اندر کچھ شرعی وسائل پیدا کیے جائیں۔ یہ طریقِ فکر مسلمانوں کو بدلنے کے بجائے اسلام کو بدلتا ہے، یعنی تجدید دین کی جگہ تجدد کا دروازہ کھولتا ہے جو نظام دینی کے لیے حد درجے تباہ کن ہے، اور افسوس یہ ہے کہ غلبۂ کفر کے زمانے میں فتویٰ نویسی کچھ اسی راہ پر چلتی رہی ہے۔ اس طریقے نے مسلمانوں کو نظام باطل کے اندر راضی اور مطمئن زندگی بسر کرنے کا خوگر بنادیا ہے، حالاں کہ یہ دین حق کے عین منشا ہی کے خلاف ہے۔ ہم اس طرز فکر کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتے، خواہ کیسے ہی بڑے بڑے علما اس کے حامی ہوں۔ نظام باطل کے تحت مسلمانوں کے لیے تکلیف اور نقصان کے

سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ اس تکلیف اور نقصان کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اس نظام کو بدلنے کے لیے جدوجہد کریں، نہ یہ کہ کفر کے زیر سایہ کسی قدر سہولت سے جینے کے لیے شریعت کو موافق حال بنائیں[1]۔ (ترجمان القرآن۔ رمضان ۶۵ھ، اگست ۴۶ء)

غیر محرم قریبی اعزّہ سے پردے کی صورت:

سوال: کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو شرعاً بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ کہ سسرال اور میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہمارے آج کل کے نظام معاشرت میں بالعموم عورتیں پردہ نہیں کرتیں، ان سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیے تو کن حدود کے ساتھ؟

جواب: شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا اور رسول کے احکام کی خلاف ورزی کا بیوی کو حکم دے۔ اور اگر وہ ایسا حکم دے تو ایک مسلمان عورت کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت سے انکار کر دے۔ سورۂ نور کے رکوع ۴ میں اللہ تعالیٰ نے ان رشتہ داروں کی فہرست دے دی ہے جن کے سامنے ایک مسلمان عورت اپنی زینت کے ساتھ آسکتی ہے۔ ان کے سوا کسی کے سامنے اظہار زینت کا حکم دینا کسی مسلمان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم قریبی رشتہ داروں کے ساتھ رہن سہن ہوتا ہے، ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بالکل غیر مردوں سے پردے کی نوعیت ہے۔ عورتیں اپنے غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے بغیر زینت کے سادہ لباس میں، پورے ستر کے ساتھ آسکتی ہیں۔ مگر صرف اس حد تک ان کے سامنے رہنا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو۔ یہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرنا اور تنہائی میں بیٹھنا، جس کا رواج ہماری سوسائٹی میں بڑی کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے، شرعی احکام کے قطعی خلاف ہے، اور بعض رشتہ داروں، مثلاً دیوروں کے ساتھ ایسے تعلقات کی تو حدیث میں صریح ممانعت موجود ہے۔

اس معاملے میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ شریعت کا جو حکم ہے وہ میں نے بتا دیا ہے۔ مگر مسلمانوں میں رواج سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہو گئے

---

[1] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ''سود'' از مصنف۔

ہیں، ان کو دُور کرنے کے لیے بڑی جرأت اور عزم کی ضرورت ہے۔ ایک طرف بکثرت مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں جو شریعت کے مطالبات سے بڑھ جاتا ہے۔ دوسری طرف یہی لوگ رشتہ داروں کے معاملے میں تمام حدود شرعیہ کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس معاملے میں اگر کوئی شخص احکام شریعت پر ٹھیک ٹھیک عمل درآمد کرنا چاہے تو شاید بہت سے خاندانی تعلقات کو توڑے بغیر ایسا نہیں کرسکتا۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی اگست ۴۵ء)

پردے کے متعلق چند عملی سوالات:

سوال: آپ کی کتاب ''پردہ'' کے مطالعے کے بعد میں نے اور میری اہلیہ نے چند ہفتوں سے عائلی زندگی کو قوانین الٰہیہ کے مطابق بنانے کی سعی شروع کر رکھی ہے۔ مگر ہمارے اس جدید رویے کی وجہ سے پورا خاندان بالخصوص ہمارے والدین سخت برہم ہیں اور پردے کو شرعی حدود وضوابط کے ساتھ اختیار کرنے پر برافروختہ ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ کہیں ہم ہی بعض مسائل میں غلطی پر نہ ہوں۔ پس تسلی کے لیے حسب ذیل اُمور کی وضاحت چاہتے ہیں:

۱۔ سورہ احزاب کی یہ آیت کہ ''عورتوں پر کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے باپوں کے سامنے پردہ نہ کریں اور نہ اپنے بیٹوں کے سامنے..... الخ'' اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ آیت میں جن اعزہ کا ذکر ہے، ان کے سوا عورتوں کا کسی دوسرے کے سامنے کسی بھی شکل اور حالت میں آنا (الا بہ اشد مجبوری) صریحاً گناہ ہے۔ اس معاملے میں غیر محرم رشتہ دار اور غیر محرم اجانب بالکل برابر ہیں۔ کیا میرا یہ خیال صحیح ہے؟

۲۔ کیا غیر محرم اعزہ (مثلاً چچازاد بھائی یا خالو جب خالہ زندہ ہوں) کے سامنے ہونا جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کن مواقع کے لیے اور کن طریقوں کے ساتھ جائز ہے؟

۳۔ اگر کسی غیر محرم رشتہ دار کے ساتھ ایک ہی مکان میں مجبوراً رہنا ہو یا کوئی غیر محرم عزیز بطور مہمان آرہے تو ایسی حالت میں پردہ کس طرح کیا جاسکے گا؟ اسی طرح کسی قریبی عزیز کے ہاں جانے پر اگر زنانے سے بلاوا آئے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟

۴۔ اگر گھروں میں جوان ملازم کام کاج کے لیے آئیں جائیں تو سن رسیدہ عورتوں کے لیے تو جو رخصت ہے وہ مجھے معلوم ہے، مگر جوان عورتیں کیا صرف یہ کہہ کر ان کے سامنے بے پردہ

ہوسکتی ہیں کہ ہماری نیت پاک ہے؟

۵۔ اگر خدا اور رسول کے احکام کے تحت پردہ اختیار کرنے میں کسی کی والدہ آحائل ہو تو اس کے حکم کو ردّ کیا جاسکتا ہے یا نہیں، جب کہ آپ کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔

۶۔ کیا عورتوں کو مردوں اور عورتوں کے مشترکہ جلسوں میں نقاب اوڑھ کر تقریر کرنی جائز ہے؟ حدیث کی رُو سے تو عورتوں کی آواز کا غیر محرم مردوں تک پہنچنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا۔

۷۔ کیا عورتیں لیڈی ڈاکٹر یا نرس یا معلّمہ بن سکتی ہیں؟ جیسا کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے لیڈروں نے قوم کو اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری عورتیں ان کاموں میں حصہ لے کر گزشتہ نقصانات اور پس ماندگی کی تلافی کریں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورتیں کیا ان مشاغل کو اختیار کرسکتی ہیں؟ اور آیا انہیں پردے میں رہ کر ہی انجام دینا ہوگا یا ضرورتاً پردے سے باہر بھی آسکتی ہیں؟

۸۔ کیا عورتیں چہرہ کھول کر یا نقاب کے ساتھ جہاد میں شرکت کرسکتی ہیں؟

جواب: (۱) آپ نے قرآن مجید کے اصل الفاظ پر غور نہیں کیا۔ وہ آیت جس کا حوالہ آپ دے رہے ہیں، سورۂ احزاب میں نہیں ہے بلکہ سورہ نور میں ہے اور اس میں الفاظ یہ ہیں کہ: ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا .....﴾ یعنی بجز ان لوگوں کے اور کسی کے سامنے اپنی زینت کا اظہار نہ کریں۔ دوسرے لفظوں میں بناؤ سنگھار اور آرایش کے ساتھ غیر محرم لوگوں کے سامنے نہ آئیں۔ دوسری طرف گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ یعنی اپنی چادروں کو اپنے اوپر گھونگٹ کے طور پر لٹکا لیا کریں۔ ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی تین قسمیں ہیں اور ہر قسم کے الگ احکام ہیں۔ ایک وہ محرم رشتہ دار وغیرہ جن کا ذکر سورۂ نور والی آیت میں آیا ہے۔ دوسرے بالکل اجنبی لوگ جن کا حکم سورۂ احزاب والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ تیسرے ان دونوں کے درمیان ایسے لوگ جو محرم بھی نہیں ہیں اور اجنبی بھی نہیں۔ پہلی قسم کے مردوں کے سامنے عورت اپنے بناؤ سنگار کے ساتھ آسکتی ہے۔ دوسری قسم کے مردوں کو چہرہ تک نہیں دکھا سکتی۔ رہے تیسری قسم کے لوگ، تو ان سے پردے کی نوعیت مذکورۂ بالا دونوں حدوں کے درمیان رہے گی۔ یعنی نہ تو ان سے بالکل اجنبیوں کا سا پردہ ہوگا اور نہ ان کے سامنے زینت کا اظہار ہی کیا جائے گا۔

۲۔ سامنے ہونے کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ اس طرح کی آزادی اور بناؤ سنگار کے ساتھ سامنے ہونا، جیسے باپ بھائی وغیرہ کے سامنے ہوا جاتا ہے، اور بے تکلف بیٹھ کر بات چیت کرنا، ہنسنا بولنا، حتیٰ کہ تنہائی تک میں ساتھ رہنا۔ یہ چیز کسی قسم کے غیر محرم مردوں کے ساتھ بھی جائز نہیں ہے، خواہ وہ اجنبی ہوں یا رشتہ دار۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ عورت اپنی زینت کو چادر وغیرہ سے چھپا کر، نیز سر کو ڈھانک کر صرف چہرہ اور ہاتھ کھولے ہوئے کسی کے سامنے آئے، اور وہ بھی اپنے آپ کو دکھانے کی غرض سے نہیں بلکہ ان ناگزیر ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے جو مشترک خاندانی معاشرت میں پیش آتی ہیں۔ مگر آزادی کے ساتھ بیٹھ کر خلا ملانہ کرے۔ خلوت میں بھی اس کے ساتھ نہ رہے، اور صرف اس طرح سامنے ہو کہ مثلاً اس کے سامنے سے گزر جائے یا کوئی ضروری بات ہو تو پوچھ لے یا بتا دے۔ اس حد تک غیر محرم اعزہ کے سامنے ہونے کی شرعاً اجازت ہے یا کم از کم ممانعت نہیں ہے۔ بہر حال چچا زاد بھائیوں اور خالہ زاد بھائیوں کے ساتھ جو ہنسی مذاق اور انتہائی بے تکلفی آج مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہے اور جس طرح مسلمان لڑکیاں اس قسم کے عزیزوں کے سامنے بنی ٹھنی رہتی ہیں، شریعت اسلامیہ میں ان بے اعتدالیوں کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

۳۔ ایسے حالات میں اگر شریعت کی پابندی کا ارادہ دونوں طرف موجود ہو تو صحیح راہ عمل یہ ہے کہ جب کوئی غیر محرم عزیز گھر میں آئے تو شرعی قاعدے کے مطابق استیذان (طلب اجازت) کرے[1]۔ پھر جب ایسی آواز آئے تو عورت کو چاہیے کہ کوئی چیز اوڑھ کر اپنی زینت کو چھپا لے اور ذرا اپنا رخ بدل لے یا پیٹھ موڑ لے۔ اگر بالکل ناگزیر ہو تو چہرہ اور ہاتھ غیر محرم عزیز کے سامنے ظاہر ہونے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح بضرورت سادگی کے ساتھ بات کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ البتہ خلا ملا اور بے تکلفی اور ہنسی مذاق بالکل ناجائز ہے۔

۴۔ ملازموں کے معاملے میں میری تحقیق یہ ہے کہ جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی رائے یہ ہو کہ وہ ''غیر اُولِی الْاِرْبَۃِ'' کی تعریف میں آتے ہیں (یعنی اپنے آقا کے گھر کی عورتوں کے متعلق کوئی بُرا خیال ان کے دل میں آنے کی توقع نہیں ہے) ان کو گھر میں آنے جانے

---

[1] افسوس ہے کہ قرآن وسنت کے حکم استیذان کو آج مسلمانوں نے اپنی معاشرت سے بالکل ہی خارج کر دیا ہے اور اجازت مانگے بغیر گھر میں گھس آنے کو بے تکلفی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ شرعاً خود گھر کے مردوں حتیٰ کہ باپوں، بیٹوں اور بھائیوں کو بھی لازم ہے کہ جب وہ گھر میں داخل ہونے لگیں تو کم از کم کھنکار دیں یا کوئی ایسا آواز کر دیں جس سے گھر کی عورتوں کو معلوم ہو جائے کہ کوئی مرد آ رہا ہے۔

اور کام کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔لیکن جن ملازموں کے متعلق صاحب خانہ کی یہ رائے نہ ہو،ان کا گھروں میں آنا جانا جائز نہیں ہے۔بہرحال اس معاملے میں گھر کے قوام کا اجتہاد معتبر ہے،بشرطیکہ وہ شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو،نہ کہ حدودِ شریعت کو بے پروائی کے ساتھ ٹالنے والا ہو۔

۵۔ ماں کے پاؤں کے نیچے جنت بے شک ہے،لیکن حکم صرف اسی ماں کا مانا جاسکتا ہے جو جنتیوں کے سے کام کرے،یعنی خدا و رسول کے احکام کے آگے جھکنے والی ہو اور اپنے نفس یا خاندانی رواجوں پر شریعت کو قربان کردینے والی نہ ہو۔رہی وہ ماں جو اس کے برعکس صفات رکھتی ہو،تو اس کی خدمت تو کی جاتی رہے گی،مگر غیر شرعی اُمور میں اس کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔ شریعت کی پابندی سے آزاد ہوکر اور اپنے نفس یا برادری کی شریعت کو خدا کی شریعت پر ترجیح دے کر تو اس نے اپنا قدم خود جہنم کی طرف ڈال دیا۔پھر آخر اس کے پاؤں کے نیچے جنت کیسے ہوسکتی ہے۔

۶۔ بعض حالات میں یہ چیز جائز ہے کہ عورت پردے کی پوری پابندی کے ساتھ مردوں کو خطاب کرے،لیکن بالعموم جائز نہیں ہے۔اس امر کا فیصلہ کرنا کہ کن حالات میں یہ چیز جائز ہے اور کن میں جائز نہیں،صرف ایسے شخص یا اشخاص کا کام ہے جو مواقع اور حالات کو شرعی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور شریعت کے منشا کے مطابق زندگی بسر کرنے کی نیت بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

۷۔ لیڈر صاحبان کا حوالہ دے کر آپ نے جو سوال کیا ہے،اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب اسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی یہ حضرات خود اور ان کے اتباع میں مسلمان آج کل کر رہے ہیں،تو پھر اسلامی تہذیب اور یورپین تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے۔پھر تو مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو آج کل یورپ میں ہو رہا ہے۔لیکن اگر اسلامی تہذیب اس تہذیب کا نام ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی،تو آج کل کے میڈیکل کالجوں اور نرسنگ کی تربیت گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجے بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کردیا جائے۔رائج الوقت گرلز کالجوں میں جاکر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معلّمات بننے کا معاملہ بھی اس سے کچھ بہت مختلف نہیں ہے۔البتہ اگر نظامِ تعلیم و تربیت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو اور ہم اپنے طریقے پر لڑکیوں کو تیار کرکے ان سے تمدن کے ضروری کاموں کی خدمت لینے پر قادر ہوں تو

یقیناً ہم اس کا انتظام کریں گے کہ اسلامی حدود کی پابندی کرتے ہوئے لڑکیوں کو فن طب، سرجری، قابلہ گری، نرسنگ اور تربیت اطفال کی تعلیم دیں اور ان کو دوسرے علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم وتربیت دے کر معلّمات بھی بنائیں اور ان سے تمدن کی دوسری مختلف ضروری خدمات بھی ایسے طریقوں پر لیں جو اسلامی تہذیب کے مطابق ہوں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ضمناً لائق تصریح ہے کہ ہم مسلمان اس مغربی نظریے کے قائل نہیں ہیں کہ تیمارداری (نرسنگ) کا پیشہ عورت کے لیے مخصوص ہے اور یہ کہ زنانہ ومردانہ سب قسم کے ہسپتالوں میں نرس عورت ہی ہونی چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس خیال کے لیے کوئی علمی اور عقلی بنیاد نہیں ہے، اور اخلاقی حیثیت سے یہ نہایت شرم ناک ہے کہ نرس خواتین سے مرد بیماروں کی تیمارداری کے وہ کام لیے جائیں جنہیں مرد تیمار دار بھی انجام دیتے ہوئے حجاب محسوس کریں۔ اس بِنا پر ہم مسلمان لوگ اگر عورتوں کو طبی خدمات کے لیے تیار کریں گے تو عورتوں کے علاج اور تیمارداری کے لیے کریں گے نہ کہ عام طبی خدمات کے لیے۔ ہمارے نزدیک مردانہ ہسپتالوں کے لیے مرد ہی نرس ہونے چاہییں۔

۸۔ جنگ کے موقع پر تیمارداری، مرہم پٹی، مجاہدوں کا کھانا پکانا، اسلحہ اور رسد رسانی، پیغام رسانی وغیرہ کی خدمات انجام دینا عورتوں کے لیے جائز ہے۔ پردے کے احکام سے قبل بھی یہ خدمات عورتیں انجام دیتی تھیں اور ان احکام کے آنے کے بعد بھی دیتی رہیں اور آج بھی دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ فوج اسلامی ہو، حدود اللہ کی پابند ہو اور ان بدمعاشیوں سے پاک ہو جن میں آج کل کی فوجوں نے نام وری حاصل کر رکھی ہے۔ (W.A.C.1) جیسے معصوم ناموں سے عورتوں کو بھرتی کرنا اور پھر بدمعاش سپاہیوں اور افسروں کے لیے ان سے قحبہ گری کی خدمت لینا وہ شیطانی کام ہے جس کے لیے کوئی گنجایش برائے نام بھی اسلامی تہذیب میں نہیں نکل سکتی[1]۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان ۶۵ھ، اگست ۴۶ء)

---

[1] آج کل کی فوجوں کی اخلاقی حالت کا اندازہ اِس سے کیا جاسکتا ہے کہ گزشتہ جنگ عظیم کے سلسلے میں امریکی فوج نے جاپان میں ایک لاکھ، انگلستان میں ۷۰ ہزار اور جرمنی میں ۵۰ ہزار حرامی بچے چھوڑے ہیں اور روسی فوج نے صرف مشرقی برلن میں ۲۹ ہزار حرامی اولاد پیدا کی ہے۔ یہ صرف اُن بچوں کی تعداد ہے جو ۱۹۵۲ء کے آخر تک شمار میں آگئے ہیں۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اِس برتھ کنٹرول کے دور میں کتنے بڑے پیمانے پر بدکاری کی گئی ہوگی تب جا کر یہ نتائج بدظہور میں آئے۔

رسموں کی شریعت:

سوال: چند اشکال درپیش ہیں۔ان کے متعلق شرعی رہنمائی چاہتا ہوں۔امید ہے کہ آپ میرے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور پر روشنی ڈالیں گے:

ا: ایک مفلس مسلمان اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے۔افلاس کے باوجود دنیا والوں کا ساتھ دینے کا بھی خواہش مند ہے،یعنی شادی ذرا تزک واحتشام سے کرکے وقتی سی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس کی رہنمائی کیسے کی جائے؟

ب: ایک مقروض مسلمان جو تمام اثاثہ بیچ کر بھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، بیٹے بیٹیوں کی شادی کرنا چاہے تو فریق ثانی کی طرف سے ایسی شرائط سامنے آتی ہیں جو بہر حال صرفِ کثیر چاہتی ہیں،تو اس کے لیے کیا راہ عمل ہے؟

ج: عموماً لڑکیوں کی شادی کے معاملے میں اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ دوسری طرف سے نسبت کے پیغام میں پہل ہو، چنانچہ اسی انتظار میں بعض اوقات لڑکیاں جوانی کو طے کرکے بڑھاپے کی سرحد میں جا داخل ہوتی ہیں اور کنواری رہ جاتی ہیں۔اس معاملے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

د: موجودہ مسلمان شادی بیاہ، پیدائش اور موت کی تقریبات پر چھٹی، چلّہ، باجا، منگنی، جہیز اور اسی طرح چالیسواں، قُل وغیرہ کی جو رسوم انجام دیتے ہیں ان کی حیثیت شریعت میں کیا ہے؟

جواب: (ا) ایسا شخص جو خود جانتا ہے کہ وہ اتنا خرچ کرنے کے قابل نہیں ہے،اور پھر محض دنیا کے دکھاوے اور اپنی غلط خواہشات کی تسکین کی خاطر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا چاہتا ہے وہ تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو معصیت کے گڑھے میں پھینک رہا ہے۔اپنی غلط خواہش کی وجہ سے یا تو وہ سودی قرض لے گا یا کسی ہم درد کی جیب پر ڈاکا ڈالے گا،اور اگر اسے قرض حسن مل گیا، جس کی امید نہیں ہے،تو اسے مار کھائے گا۔اور اس سلسلے میں خدا جانے کتنے جھوٹ اور کتنی بے ایمانیاں اس سے سرزد ہوں گی۔آخر ایسے شخص کو کیا سمجھایا جا سکتا ہے جو محض اپنے نفس کی ایک غلط خواہش کی خاطر اتنے بڑے بڑے گناہ جانتے بوجھتے اپنے سر لینے پر آمادہ ہے۔

ب: ایسے شخص کو اپنے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں ان لوگوں میں کرنی چاہییں جو مالی حیثیت سے اسی جیسے ہوں اور جو اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی چادر سے نہ وہ خود زیادہ پاؤں

پھیلائیں اور نہ دوسرے کو زیادہ پاؤں پھیلانے پر مجبور کریں۔ اپنے سے بہتر مالی حالات رکھنے والوں میں شادی بیاہ کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو خواہ مخواہ مشکلات میں مبتلا کرنا ہے۔

ج: یہ صورت تو کچھ فطری سی ہے، لیکن اس کو حد سے زیادہ بڑھانا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی لڑکی جوان اور شادی کے قابل ہو چکی ہو اور اسے کوئی مناسب لڑکا نظر آئے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنی طرف سے پیغام دینے میں ابتدا کرے۔ اس کی مثالیں خود صحابۂ کرام میں ملتی ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت میں کوئی ذلت کی بات ہوتی تو نبیؐ اس کو منع فرما دیتے۔

د: یہ سب چیزیں وہ پھندے ہیں جو لوگوں نے اپنے گلے میں خود ڈال لیے ہیں، ان میں پھنس کر ان کی زندگی اب تنگ ہوئی جا رہی ہے، لیکن لوگ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے ان کو کسی طرح چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ براہِ راست ان رسموں کے خلاف کچھ کہا جائے، بلکہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن اور سنت کی طرف دعوت دی جائے۔ خدا اور رسول کے طریقے پر لوگ آ جائیں تو بڑی خرابیاں بھی دور ہوں گی اور یہ چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی نہ رہیں گی۔

سوال: میں عرصے سے تجرد کی زندگی گزار رہا ہوں اور اس سبب کی ذمہ داری میرے ''اجتہاد'' کے سر ہے۔ ہمارے اطراف میں کچھ اس قسم کے اصول و مراسم شائع ہیں جن کے بارے میں اگر فقہی موشگافیوں سے کام لینا شروع کر دیا جائے تو ان کو ''ناجائز'' اور ''غیر شرعی رسم'' کہنا مشکل ہوگا۔ مثلاً یہ کہ منسوبہ یا منکوحہ کے لیے زیور و پارچہ جات کا مطالبہ، کچھ آپس کے لین دین، ایک دوسرے کے کمیوں اور خدمت گاروں کو بطور عطیہ و انعام کچھ دینا دلانا، برادری اور اہل قرابت کو بلانا اور ان کی ضیافت کرنا وغیرہ۔ یہ بہت سی چیزیں بظاہر اگر علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھی جائیں تو ان میں سے غالباً کسی ایک کو بھی ناجائز نہ کہا جا سکے گا۔ لیکن اگر ان مراسم کے اس پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ان کی پابندی اور التزام اس حد تک ہے کہ ان کے بغیر کامیابی ہی نہیں ہوتی اور کوئی کسی درجے کا آدمی کیوں نہ ہو، ان کی پابندی قبول کیے بغیر ازدواجی زندگی کا آغاز کر ہی نہیں سکتا، تو بالکل صفائی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چیزیں اب صرف ''مباح'' کے درجے پر باقی نہیں رہی ہیں، بلکہ یہ سب برادری کا ایک قانون بن گئی ہیں اور ایسا قانون کہ ان کی خلاف ورزی کرنے والا

گویا مجرم متصور ہوتا ہے۔ پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر باطل قانون کو توڑ دیا جائے، چاہے وہ کہیں ہو، تو سوال یہ ہے کہ آیا مذکورۂ بالا چیزیں اس شکست وریخت کی مستحق ہیں یا نہیں؟ اگر یہ حملے کی مستحق ہیں جیسا کہ میری رائے ہے، تو کیا یہ حقیقت آپ سے مخفی ہے کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں اس قسم کی ''شریعتِ رسوم'' نافذ العمل نہ ہو، خواہ اس کی تفصیلی اشکال کچھ ہی ہوں۔ جن تقریبات کو آج کل ''شرعی تقریبات'' کہا جاتا ہے وہ بھی بس صرف اس حد تک شرعی ہوتی ہیں کہ ان میں ناچ، باجا گاجا اور ایسی ہی دوسری خرافات ومزخرفات نہیں ہوتیں، لیکن مذکورہ بالا رسوم کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ان میں بھی بدرجۂ اتم موجود رہتی ہیں اور انہیں ''اباحت'' کی چادر میں چھپالیا جاتا ہے۔ پس کیا جماعتِ اسلامی کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے اراکین کو ''غیر شرعی رسوم'' کی وضاحت اس طرح کر کے بتلائے کہ یہ ''اباحت'' کی قبا چاک ہو جائے اور وہ اپنی تقریبات کو بالکل مسنون طریقے پر منائیں؟

اگر ان رسوم کے خلاف میرا احساس صحیح نہ ہو تو پھر کچھ وضاحت سے ''شریعت رسوم'' کے واجبات کو قابل بغاوت قوانین باطل سے مستثنیٰ قرار دینے کی وجوہ تحریر فرمائیں۔ اس سے اگر میرا اطمینان ہو گیا تو تجرد کی مصیبت سے نجات حاصل ہو سکے گی۔ اور اگر آپ نے میری رائے کی تصدیق کی تو پھر میرے لیے بظاہر کامیابی کا کہیں موقع نہیں ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی مسرت ہوگی، کیوں کہ پھر تکلیف صحیح معنوں میں اللہ کی راہ میں ہوگی۔ **و لعل اللّٰہ یحدث بعد ذالك امرًا۔**

جواب: ہم ''الاقدم فالاقدم'' کے اصول پر کام کر رہے ہیں۔ پہلے دین کی جڑوں کو دلوں میں جمانا ضروری ہے، اس کے بعد تفصیلات کو ایک ترتیب وتدریج کے ساتھ زندگی کے مختلف گوشوں اور کونوں میں درست کرنے کا موقع آئے گا۔ اگر ہم شادی بیاہ، لین دین اور دوسرے معاملات کی تفصیلات وجزئیات بیان کرنے پر اُتر آئیں تو ہماری اصولی دعوت کا کام منتشر ہو جائے گا۔ اس لیے جہاں تک دین کے بنیادی اُمور کا تعلق ہے، ہم ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اور جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے، ان کے متعلق ہم سردست اجمال سے کام لے رہے ہیں۔

شادی بیاہ وغیرہ تقریبات کی رسوم کی پوری پوری اصلاح اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ دینی زندگی اپنی صحیح بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہوئی اس مرحلے پر نہ پہنچ جائے جہاں ان چیزوں کی اصلاح ممکن ہو۔ اس وقت تک ہمارے ارکان کو زیادہ تر صرف ان چیزوں سے اجتناب پر اصرار

کرنا چاہیے جن کو صریحاً خلاف شریعت کہا جاسکتا ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو معاشرت اسلامی کی روح کے تو خلاف ہیں مگر مسلمانوں کی موجودہ معاشرت میں قانون وشریعت بنی ہوئی ہیں، تو وہ ہمارے ذوق اسلامی پر خواہ کتنی ہی گراں ہوں، لیکن سردست ہمیں ان کو اس امید پر گوارا کر لینا چاہیے کہ بتدریج ان کی اصلاح ہو سکے گی۔ مگر یہ گوارا کرنا رضامندی کے ساتھ نہ ہو، بلکہ احتجاج اور فہمایش کے ساتھ ہو۔ یعنی ہر ایسے موقع پر واضح کر دیا جائے کہ شریعت تو اس طرح کے نکاح چاہتی ہے جیسے ازواج مطہرات اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے ہوئے تھے، لیکن اگر تم لوگ یہ تکلّفات کیے بغیر نہیں مانتے تو مجبوراً ہم اس کو گوارا کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ وقت آئے کہ جب تم نبیؐ اور اصحاب نبیؐ کی طرح کے سادہ نکاح کرنے کو اپنی شان سے فروتر نہ سمجھو!

ہمارا یہ رویہ تو عام لوگوں کے لیے ہے جن سے ہم مختلف قسم کے روابط پیدا کرنے اور جن کے ساتھ کئی طرح کے دنیوی اُمور میں معاملہ کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن خود ارکان جماعت کے درمیان ایسے جتنے روابط اور معاملات بھی ہوں، انہیں رسوم کی آلودگیوں سے پاک کر کے سادگی کی اس سطح پر لے آنا چاہیے جس تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ نے انہیں پہنچایا تھا۔ ہمارے معاملات میں مباحات کو مباحات ہی کی حد تک رہنا چاہیے اور ان میں سے کسی چیز کو قانون اور شریعت کے درجہ تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ رواج کی رَو میں بہنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو بغاوت کرنا بھی چاہتے ہیں مگر پہل کی جسارت نہیں کر سکتے۔ رسموں کی بیڑیوں سے نجات حاصل تو کرنا چاہتے ہیں مگر دوسروں سے پہلے انہیں کاٹنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ اپنی پیٹھوں پر لدے ہوئے رواجوں کے بوجھوں سے ان کی کمریں ٹوٹ رہی ہوتی ہیں مگر ان کو پٹخ دینے میں پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ پہل اور پیش قدمی اب ہم لوگوں کو کرنی ہے۔ ہمارے ہر ساتھی کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے روزمرہ کے معاملات اور تقریبات کو گوناگوں پابندیوں سے آزاد کرنے میں پوری بے باکی سے پہل کرے اور لوگوں کی ''ناک'' بچانے کے لیے خود نکو بن کر معاشرتی زندگی میں انقلاب برپا کرے۔ خالص اسلامی انداز میں تقریبات اور معاملات کو سرانجام دینے کی مثالیں اگر جگہ جگہ ایک دفعہ قائم کر دی جائیں گی تو سوسائٹی کا کچھ نہ کچھ عنصر ان کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے گا اور اس طرح رفتہ رفتہ احوال بدل سکیں گے۔

سوال: ہمارے علاقے میں عام طور پر نکاح کا مہر نو صد روپے معین ہوتا ہے۔ اس سے تین سو

روپے کی ادائیگی ہو جاتی ہے اور چھ سو روپے کی رقم وصول طلب رہتی ہے۔ لیکن بالعموم مرد کی طرف سے اس چھ سو کی ادائیگی کی نوبت کبھی نہیں آتی۔

ہمارے ایک رشتہ دار کی لڑکی کا نکاح آج سے قریباً ۵ سال قبل ہوا تھا اور اس کا مہر دس ہزار روپے قرار پایا تھا۔ لڑکے کی طرف سے اوّل اوّل اتنے بڑے مہر کو تسلیم کرنے میں پس وپیش ہوتا رہا مگر آخر کار محض اس وجہ سے یہ ہٹ چھوڑ دی گئی کہ یہ سب کچھ ایک نمایشی رسم کے سوا کچھ نہیں۔

اب اسی رشتہ دار کی دوسری لڑکی کی نسبت میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ طے پائی ہے اور اب جلد ہی اس کا نکاح ہونے والا ہے۔ لڑکی کے اولیا کی طرف سے قبل از وقت یہ اطلاع پہنچا دی گئی ہے کہ مہر وہی نو دس ہزار روپے ہوگا۔ اگر اس رقم میں اب کوئی کمی کی جائے تو ان کا پہلا داماد بگڑ جائے گا کہ جب اس کے لیے دس ہزار روپے رکھا گیا تھا تو اب دوسرے داماد سے کوئی امتیازی رویہ کیوں اختیار کیا جائے؟

اس اُلجھن کو طرفین نے حل کرنے کی صورت یہ سوچی ہے کہ مجلس نکاح میں جب کہ ہمارے عزیز کا پہلا داماد موجود ہوگا، مہر وہی نو دس ہزار روپے تحریر کیا جائے گا، مگر بعد میں خفیہ طور پر اس تحریر کو بدل کر نو ہزار سے نو سو کر دیا جائے گا۔ اس طرح نہ پہلا داماد ناراض ہوگا نہ ہمارے چھوٹے بھائی پر بار رہے گا۔

مجھے اس مجوزہ صورتِ معاملہ میں کھٹک سی ہو رہی ہے اور میں نے اس کا اظہار اپنے والد محترم کے سامنے بھی کر دیا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ علمائے شریعت سے استصواب کر لیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ ایک مقامی مفتی صاحب سے استفتا کیا جا چکا ہے اور ان کی رائے میں ایک معاملے میں طرفین جب راضی ہیں تو شریعت معترض نہیں ہو سکتی۔ اس پر میں نے والد صاحب پر اپنا عدم اطمینان ظاہر کیا ہے۔

یہی معاملہ جماعتِ اسلامی کے ایک رکن کے سامنے رکھا تو انہوں نے فرمایا کہ مجوزہ صورت معاملہ میں ایک تو پہلے داماد کو فریب دیا جائے گا اور دوسرے دس ہزار مہر کی بہر حال ایک اور مثال عوام کے سامنے قائم کی جائے گی اور رسم ورواج کی بیڑیوں میں گویا ایک اور کڑی کا اضافہ کیا جائے گا۔ اس وجہ سے میں اسے صحیح نہیں سمجھتا۔

اب مشکل یہ ہے کہ نکاح کی مجلس میں لڑکے کا بھائی ہونے کی وجہ سے مجھے شریک بھی ہونا

ہے اور شاید وکیل یا گواہ بھی بننا پڑے، اور صورت ایسی ہے کہ میرا ضمیر اس کے جائز ہونے کی شہادت نہیں دیتا۔ اگر میں بحیثیت وکیل یا شاہد مجلس میں شریک ہوتا ہوں تو از خود اس غلطی میں حصہ دار ہوں جس کو سوچ سمجھ کر میرے اعزہ کرنے لگے ہیں۔ اگر شرکت سے باز رہوں تو یہ سمجھا جائے گا کہ میں بھائی کی شادی پر خوش نہیں ہوں۔ نیز اگر عدم شرکت کی وجہ مجھ سے پوچھی جائے تو میں خاموش رہنے پر مجبور ہوں، کیوں کہ اگر حقیقت بیان کر دوں تو سارا معاملہ درہم برہم ہو کے رہے گا۔

اب براہِ کرم آپ میرے لیے صحیح اسلامی رویہ تجویز فرما دیں، ان شاء اللہ میں دنیوی تعلقات اور مفاد کو تعمیل میں حائل نہ ہونے دوں گا۔ میں صرف شریعت کا حکم معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس کے اتباع پر تیار ہوں، فرار کے لیے کوئی تاویل مجھے مطلوب نہیں ہے۔

جواب: جو معاملہ آپ نے لکھا ہے وہ ایک نمونہ ہے ان غلط کاریوں کا جن میں مسلمان شریعت و اخلاق سے دُور ہو کر مبتلا ہو گئے ہیں۔ شریعت نے مہر کو عورت کا ایک حق مقرر کیا تھا اور اس کے لیے یہ طریقہ طے کیا تھا کہ عورت اور مرد کے درمیان جتنی رقم طے ہو، اس کا ادا کرنا مرد پر واجب ہے۔ لیکن مسلمانوں نے شریعت کے اس طریقے کو بدل کر مہر کو ایک رسمی اور دکھاوے کی چیز بنا لیا، اور بڑے بڑے مہر دکھاوے کے لیے باندھنے شروع کیے، جن کے ادا کرنے کی ابتدا ہی سے نیت نہیں ہوتی اور جو خاندانی نزاع کی صورت میں عورت اور مرد دونوں کے لیے بلائے جان بن جاتے ہیں۔ اب ان غلطیوں سے بچنے کی سیدھی اور صاف صورت یہ ہے کہ مہر اتنے ہی باندھے جائیں جن کے ادا کرنے کی نیت ہو، جن کے ادا کرنے پر شوہر قادر ہو۔ پورا مہر بر وقت ادا کر دیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ اس کے لیے ایک مدت کی قرارداد ہونی چاہیے اور آسان قسطوں میں اس کو ادا کر دینا چاہیے۔ اس راستی کے طریقے کو چھوڑ کر اگر کسی قسم کے حیلے نکالے جائیں گے تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ایک غلطی سے بچنے کے لیے دس قسم کی اور غلطیاں کی جائیں گی جو شرع کی نگاہ میں بہت بری اور اخلاق کے اعتبار سے نہایت بدنما ہیں۔ آپ ایسے نکاح میں وکیل یا گواہ کی حیثیت قبول نہ کریں، بلکہ فریقین کو سمجھانے کی کوشش کریں اور اگر نہ مانیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ نکاح میں شریک ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن جھوٹ اور فریب کا گواہ بننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں۔ (ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ، ۶۵ھ، اکتوبر ۴۶ھ)

لباس اور چہرے کی شرعی وضع:

سوال: مطالبہ کیا جاتا ہے کہ صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لیے آدمی کو لباس اور چہرے کی اسلامی وضع قطع اختیار کرنی چاہیے۔ براہِ کرم بتائیے کہ اس سلسلے میں اسلام نے کیا احکام دیے ہیں؟

جواب: لباس اور چہرے کی وضع قطع کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے، اس کا جواب تو میں دے دیتا ہوں، لیکن اس سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ظاہر کی اصلاح باطن کی اصلاح پر مقدم نہ ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے اپنے آپ کو قرآنی معیار کے مطابق حقیقی مسلمان بنانے کی کوشش کیجیے۔ پھر ظاہر کی تبدیلی اس حد تک کرتے چلے جائیے جس حد تک باطن میں واقعی تبدیلی ہوتی جائے۔ ورنہ مجرد ضابطہ وقانون (Rules and Regulations) کو سامنے رکھ کر اگر آپ نے اپنے ظاہر کو اس نقشے پر ڈھال لیا جو حدیث وفقہ کی کتابوں میں ایک متقی انسان کے ظاہری نقشے کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے اور اندر تقویٰ پیدا نہ ہوا، تو آپ کی مثال ایسی ہوگی جیسے تانبے کے سکّے پر اشرفی کا ٹھپا لگا ہوا ہو۔ اشرفی کا ٹھپا لگانا کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔ بہت آسانی سے جس سستی سے سستی دھات پر چاہیں، اس کو لگا سکتے ہیں۔ لیکن زرِ خالص بہم پہنچانا ایک مشکل کام ہے، اور مدت کی کیمیا گری سے یہ چیز حاصل ہوا کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک مدت سے ظاہر پر غیر معمولی زور دیا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشرفی کے ٹھپے کے ساتھ تانبے، لوہے، سیسے اور ہر قسم کی گھٹیا دھاتوں کے سکے چل پڑے ہیں۔ عملی دنیا کا بازار ایسا بے لاگ صراف ہے کہ وہ زیادہ مدت تک اس جعل سازی سے دھوکا نہیں کھا سکتا۔ کچھ مدت تک تو ہماری دھونے کی اشرفیاں چل گئیں، لیکن اب بازار میں کوڑی بھر بھی قیمت ان کی باقی نہیں رہی ہے۔ پس ہمیں اسلامی جماعت میں جس قسم کی دین داری پیدا کرنی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم اشرفی کا ٹھپا لگانے سے پہلے سونے کا سکہ بننے کی کوشش کریں۔

لباس اور چہرے کی وضع اور ایسے ہی دوسرے ظواہر کے متعلق نبیؐ نے جتنی ہدایات دی ہیں وہ مدینۂ طیبہ کے آخری پانچ چھ برسوں کی ہیں۔ اس سے پہلے پندرہ سولہ سال تک آپ اپنے متبعین میں تقویٰ اور احسان کی وہ صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے جن کا مفصل نقشہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں بیان ہوا ہے۔ اس ترتیب پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا

نے جس کو تزکیۂ نفوس کی خدمت پر مقرر فرمایا تھا، اس نے بھی پہلے اپنی پوری توجہ مس خام کو کندن بنانے ہی پر صَرف کی تھی۔ پھر جب کندن بنالیا تب اس پر اشرفی کا نقش مرتسم کیا۔

لیکن اس تقدیم وتاخیر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے احکام شرعی کی تعمیل سے جی چرانے کا بہانہ بنالیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی متقیانہ وضع بنانے سے پرہیز کیا جائے جس کی تہ میں واقعی تقویٰ اور خداترسی موجود نہ ہو اور جس کے اندر اسلامی اخلاق کی روح مفقود ہو۔

لباس کے متعلق اسلام نے جس پالیسی کا تعین کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایسی وضع میں رہیں جس میں آپ کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکے کہ آپ مسلمان ہیں۔ بحیثیت مجموعی آپ کی وضع قطع کفار سے مشابہ نہ ہونی چاہیے۔

ڈاڑھی کے متعلق نبیؐ نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے، صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ آپ اگر ڈاڑھی رکھنے میں فاسقین کی وضعوں سے پرہیز کریں اور اُتنی ڈاڑھی رکھ لیں جس پر عرف عام میں ڈاڑھی رکھنے کا اطلاق ہوتا ہو، (جسے دیکھ کر کوئی شخص اس شبہے میں مبتلا نہ ہو کہ چند روز سے آپ نے ڈاڑھی نہیں مونڈی) تو شارع کا منشا پورا ہو جاتا ہے، خواہ اہل فقہ کی استنباطی شرائط پر وہ پوری اترے یا نہ اترے۔

سر کے بالوں کے متعلق صرف یہ ہدایت ہے کہ کچھ منڈوانا اور کچھ رکھنا ممنوع ہے۔ موجودہ زمانے میں جس قسم کے بالوں کو پنجاب میں ''بودے'' کہتے ہیں اور جنہیں یو۔پی میں انگریزی بال کہتے ہیں، ان کے ناجائز ہونے کی مجھے کوئی دلیل نہیں ملی۔ لیکن ایک غیر مسلم قوم کی ایجاد کردہ وضع کو سر چڑھانے میں کراہت کا پہلو ضرور ہے اور اسی لیے میں نے اس وضع کو بدل دیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۶۲ھ، ستمبر، اکتوبر ۴۳ء)

ڈاڑھی کے متعلق ایک سوال:

سوال: میں نے ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ میرے کچھ ایسے رشتہ دار جو علم دین سے کافی واقف ہیں، وہ اعتراض کرتے ہیں کہ ڈاڑھی فرض نہیں ہے، قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں ملتا، ڈاڑھی نہ رکھی جائے تو کون سا گناہ کبیرہ ہے۔ یہ رسول کی سنتی محبت ہے۔ آپ فرمایئے کہ میں انہیں کیا جواب دوں؟

جواب: ڈاڑھی کے متعلق آپ نے جو سوال مجھ سے کیا ہے، اس پر ایک انگریز نو مسلم کا واقعہ یاد آ گیا، جس نے اسلام کا اچھا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو قبول کیا تھا، قبول اسلام کے بعد ہی اس نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی۔ بعض لوگ جو اسی طرح کے ''علم دین سے کافی واقف'' تھے جیسے آپ کے یہ عزیز ہیں، کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنا اسلام میں کچھ ایسا ضروری کام تو نہیں ہے، پھر کیوں خواہ مخوہ آپ نے ڈاڑھی مونڈنی چھوڑ دی؟ اس نے جواب دیا: ''میں ضروری اور غیر ضروری کی تقسیم نہیں جانتا، میں بس یہ جانتا ہوں کہ پیغمبرؐ نے اس کا حکم دیا ہے، جب میں نے پیغمبرؐ کی اطاعت قبول کر لی تو حکم بجالانا میرا فرض ہے۔ کسی ماتحت کا یہ کام نہیں ہے کہ افسر بالا (Higher Authority) کے احکام میں سے کسی کو ضروری اور کسی کو غیر ضروری قرار دے۔'' بس یہی واقعہ اپنے ان عزیزوں کو سنا دیجیے، اور ان سے یہ بھی پوچھیے کہ یہ تو خیر ''رسولؐ کی سستی محبت ہے''، جناب نے اگر کسی مہنگی محبت کا ثبوت دیا ہو تو ارشاد فرمایے۔ اگر ایک نوکر آقا کے آسان احکام کی تعمیل سے بھی گریز کرتا ہے تو وہ امور مہمہ کو کیسے سرانجام دے سکے گا۔ ہم سستی اور مہنگی محبت کا فرق نہیں جانتے۔ ہمیں تو پوری طرح اس راستے پر چلنا ہے جس پر نبیؐ چلے ہیں اور ان احکام کی تعمیل کرنی ہے جو آپ نے دیے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لیجیے۔ موجودہ زمانے میں ڈاڑھی رکھنا کسی ایسے شخص کے لیے جو فرنگیت زدہ طبقوں سے تعلق رکھتا ہو، محض ایک حکم نبوی کی تعمیل ہی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کا جہاد بھی ہے، اور عجب نہیں کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہجرت کا اجر بھی مل جائے۔ سب سے پہلے تو اس کو خود اپنے اس مذاق اور رنگ طبیعت کے خلاف بہت دنوں تک جدوجہد کرنی پڑتی ہے جو برسوں کی تعلیم و تربیت اور ماحولی اثرات کے تحت اس کے اندر راسخ ہو چکا تھا۔ پھر جب وہ اس پرانے ذوق کی بیخ کنی کرنے اور اس کی جگہ اسلامی ذوق اپنے اندر پرورش کرنے میں اس حد تک کام یاب ہو جاتا ہے کہ اس کے چہرے پر ڈاڑھی اگ سکے تو باہر ایک دوسری کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا ماحول اس سے لڑنے لگتا ہے کہ یہ کیسا انقلاب تیرے اندر رونما ہو رہا ہے۔ اس کے عزیز، اقارب، دوست، آشنا سب اسے چھیڑنے لگتے ہیں۔ اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، اس پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ شادی کے مارکیٹ میں اس کی قیمت گر

جاتی ہے۔ ہر طرف سے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں کہ اِس دیوار کو ڈھاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان اُٹھ رہی ہے۔ ان پے در پے حملوں کے مقابلے میں کوئی ایسا شخص ٹھیر نہیں سکتا جس میں کیرکٹر کی مضبوطی نہ ہو، یا جس میں اندرونی تغیر کے مکمل ہونے سے پہلے کسی وقتی جذبے کے اثر یا کسی خارجی دباؤ سے بیرونی تغیر شروع ہو گیا ہو۔ ایسا شخص تھوڑا یا بہت مقابلہ کرنے کے بعد آخر کار اپنے ماحول سے شکست کھا جاتا ہے اور بہروپیوں کی طرح پھر وہی وضع اختیار کر لیتا ہے جسے چھوڑنے کی اس نے نمایش کی تھی۔ مگر جو مضبوط کیرکٹر رکھتا ہو اور جس کا باطنی انقلاب پائدار بنیادوں پر اُٹھا ہو، وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے اور اس استقامت کے نتیجے میں دو زبردست فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر موجودہ کافرانہ ماحول کے خلاف دوسرے میدانوں میں بھی کام یاب لڑائی لڑنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جس مضبوط سیرت کا اس نے ثبوت دیا ہے، اس کا رعب اس کے ماحول پر طاری ہو جاتا ہے اور اس کی تبلیغ و تلقین میں اتنا وزن پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی سوسائٹی کے دوسرے اصلاح پذیر لوگوں پر بھی وہ اثر ڈال سکے۔

اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اس زمانے میں منڈی ہوئی ڈاڑھی محض ایک وضع نہیں ہے بلکہ ایک کلچر اور ایک مذہب زندگی کا نمایاں ترین شعار ہے۔ اس شعار کو چھوڑنا دراصل اس کلچر اور اس مذہب زندگی کو چھوڑنے کا اعلان ہے جس کا یہ شعار ہے۔ اور ڈاڑھی رکھنا کم از کم موجودہ حالات میں تو عملاً اسلام کو ایک کلچر اور ایک مذہب زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے کا ہم معنی ہے۔ یہ ترک و اختیار اس وقت تک حقیقی اور پائدار نہیں ہو سکتا جب تک فی الواقع آدمی کے نفس میں مغربی کلچر اور مذہب زندگی کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے اور اس کی جگہ اسلامی کلچر اور مذہب زندگی کی جڑیں اچھی خاصی مضبوط نہ ہو جائیں۔ لہٰذا جو لوگ محض سطحی طور پر اخلاقی دباؤ ڈال کر جدید طرز کے نوجوانوں سے ڈاڑھی رکھوانے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اندرونی انقلاب چاہے ہو یا نہ ہو، مگر بیرونی انقلاب سے ضابطے کی خانہ پری فوراً کر دی جائے، وہ بے چارے حقائق سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ مگر جہاں یہ تغیر فی الحقیقت ایک گہرے

اندرونی انقلاب کا نتیجہ ہو اور اس کے متوازی متقیانہ سیرت کے دوسرے مظاہر بھی ساتھ ساتھ نمایاں ہو رہے ہوں اور ماحول کے غیر اسلامی اثرات سے لڑنے میں بھی پامردی کا ثبوت دیا جا رہا ہو، ایسی جگہ اس انقلاب کو محض ایک معمولی چیز قرار دینا اور اسے رسول کی سستی محبت سے تعبیر کرنا صرف انہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو بے چارے رخسار و ذقن کے بالوں سے زیادہ کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ (ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۶۲ھ، ستمبر، اکتوبر، ۴۳ء)

ڈاڑھی کی مقدار کا مسئلہ:

سوال: ڈاڑھی کی مقدار کے عدم تعین پر ''ترجمان'' میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے مجھے تشویش ہے، کیوں کہ بڑے بڑے علما کا متفقہ فتویٰ اس پر موجود ہے کہ ڈاڑھی ایک مشت بھر لمبی ہونی چاہیے اور اس سے کم ڈاڑھی رکھنے والا فاسق ہے۔ آپ آخر کن دلائل کی بِنا پر اس اجماعی فتوے کو رد کرتے ہیں؟

جواب: یہ تو انہی علما سے پوچھنا چاہیے کہ ان کے پاس مقدار کے تعین کے لیے کیا دلیل ہے؟ اور خصوصاً ''فسق'' کی وہ آخر کیا تعریف کرتے ہیں جس کی بِنا پر ان کی تعین کردہ مقدار سے کم ڈاڑھی رکھنے والے پر فاسق کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ مجھے سخت افسوس ہے کہ بڑے بڑے علما خود حدود شرعیہ کو نہیں سمجھتے اور ایسے فتوے دیتے ہیں جو صریحاً حدودِ شرعیہ سے متجاوز ہیں۔

ڈاڑھی کے متعلق شارع نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ علما نے جو حد مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بہر حال ایک استنباطی چیز ہے، اور کوئی استنباط کیا ہوا حکم وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتا جو نص کی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اگر فاسق کہا جا سکتا ہے تو صرف حکم منصوص کی خلاف ورزی پر کہا جا سکتا ہے۔ حکم مستنبط کی خلاف وزری (چاہے استنباط کیسے ہی بڑے علما کا ہو) فسق کی تعریف میں نہیں آتی، ورنہ اسے فسق قرار دینے کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ استنباط کرنے والوں کی بھی شریعت میں وہی حیثیت ہے جو خود شارع کی ہے۔

سوال: کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کسی صحابی کی ڈاڑھی ایک مشت سے کم تھی؟

جواب: اسماء الرجال اور سیر کی کتابوں میں تلاش کرنے سے مجھے بجز دو تین صحابیوں کے کسی کی ڈاڑھی کی مقدار نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ صحابہؓ کے حالات پر صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں، مگر ان کے

متعلق یہ نہیں لکھا گیا کہ ان کی ڈاڑھی کتنی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سلف میں یہ مقدار کا مسئلہ کتنا غیر اہم اور نا قابل توجہ تھا۔ حالاں کہ متاخرین میں جس شدت سے اس پر زور دیا جاتا ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مومن کی سیرت وکردار میں پہلی چیز، جس کی جستجو ہونی چاہیے، وہ یہی ہے کہ اس کی ڈاڑھی کا طول کتنا ہے۔

سوال: ڈاڑھی کی مقدار کے عدم تعین کا جو مسئلہ جماعتِ اسلامی میں پھیل نکلا ہے، اس کے ماتحت بعض رفقا نے اپنی ڈاڑھیاں پہلے سے چھوٹی کرالی ہیں اور اب ان خشخشی ڈاڑھیوں کے متعلق یہ خدشہ ہے کہ کہیں ''احمدی ڈاڑھی'' کی طرح ان کا بھی کوئی فرقی نام نہ پڑ جائے اور عوام کے لیے یہ چیز فتنہ نہ ثابت ہو۔ چوں کہ علما کا متواتر تعامل مشت بھر ڈاڑھی رکھنے کا ہے، اس وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں بھی اس کا التزام کرنا چاہیے۔

جواب: آپ کا قلب جس چیز پر گواہی دے، آپ کو خود اس پر عمل کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک کسی کی ڈاڑھی کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اصل چیز جو آدمی کے ایمان کی کمی اور بیشی پر دلالت کرتی ہے وہ تو اور ہی ہے۔ البتہ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان کی کمی کو بعض ظاہری چیزوں کی بیشی سے پورا کرنے کی اب تک کوششیں کی جاتی رہی ہیں، کہیں جماعتِ اسلامی کے بھی کچھ لوگ اسی مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر کسی کی حقیقی جاں نثاری ووفاداری اللہ تعالیٰ کی راہ میں ''طویل'' ہو تو کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے گا اگر اس کی ڈاڑھی ''قصیر'' ہو۔ لیکن اگر جاں نثاری ووفاداری ''قصیر'' ہے تو یقین رکھیے کہ ڈاڑھی کا طول کچھ بھی فائدہ نہ دے گا، بلکہ بعید نہیں کہ خدا کے ہاں اُس پر فریب کاری اور مکاری کا مقدمہ چل جائے۔

آپ اس کی فکر نہ کیجیے کہ ہماری جماعت کے ارکان کے متعلق لوگ کیا رائے قائم کریں گے اور ان کے ظاہر سے کیا اثر لیں گے۔ آپ کو اور ہمارے تمام رفقا کو اپنے باطن کی فکر اپنے ظاہر سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور اسی طرح اپنے اُن اعمال کی زیادہ فکر کرنی چاہیے جن پر خدا کی میزان میں آدمی کے ہلکے یا بھاری ہونے کا مدار ہے، کیوں کہ اگر ایسے اعمال ہلکے رہ گئے تو بال برابر وزن رکھنے والی چیزوں کی کمی بیشی سے میزان الٰہی میں کوئی خاص فرق واقع ہونے کی توقع نہیں ہے[1]۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل، جمادی الثانیہ ۶۴ھ، مارچ، جون ۴۵ء)

---

[1] اس مسئلے پر مزید بحث آگے ''خلافیات'' کے باب میں آرہی ہے۔

فوٹو کا مسئلہ:

سوال: میرے ایک فوٹو گرافر دوست کا خیال ہے کہ اسلام نے تصویر کے متعلق جو حکم امتناعی جاری کیا ہے وہ فوٹو پر عائد نہیں ہوتا، بالخصوص جب کہ فحش منظر کا فوٹو نہ لیا جائے۔ کیا اس حد کو قائم رکھتے ہوئے فوٹو گرافی کو پیشہ بنایا جا سکتا ہے؟ قومی لیڈروں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں لینے میں کیا حرج ہے؟

جواب: فوٹو کے متعلق اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام جان دار چیزوں کی مستقل شبیہ محفوظ کرنے کو بالعموم روکنا چاہتا ہے، کیوں کہ انسانی تاریخ کا طویل تجربہ ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز اکثر فتنے کی موجب بنی ہے۔ اب چوں کہ اصل فتنہ صورت کا محفوظ ہونا ہے لہٰذا اس سے بحث نہیں کی جائے گی کہ اس کو کس طریقے سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ طریقہ خواہ سنگ تراشی کا ہو یا موئے قلم یا عکاسی کا یا کوئی جو آیندہ ایجاد ہو، بہر حال وہ ناجائز ہی رہے گا۔ کیوں کہ یہ سارے طریقے اصل فتنے کا سبب بننے میں یکساں ہیں۔ پس فوٹو گرافی اور مصوری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور ممانعت چوں کہ جان دار اشیا کی تصویروں کی ہے، اس لیے تمام تصویریں حرام رہیں گی، خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔ البتہ فحش تصویر میں ایک وجہ حرمت کی اور بڑھ جاتی ہے۔

اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثنا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو، یا جب کہ تصویر کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لیے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہوگا۔ مثلاً پاسپورٹ، پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لیے تصویریں محفوظ کرنا، ڈاکٹروں کا علاج کے لیے یا فن طب کی تعلیم کے لیے مریضوں کی تصویریں لینا، اور جنگی اغراض کے لیے فوٹو گرافی کا استعمال۔[1] یہ اور دوسرے استعمالات حکم عام سے مستثنیٰ قرار پائیں گے، بشرطیکہ وہ غرض جس کے لیے اس استثنا سے فائدہ اُٹھایا جا رہا ہو، بجائے خود حلال ہو۔ لیکن لیڈروں کی تصویریں اور جلسے اور جلوسوں کی تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو بندگان خدا کو اس خطرے سے بہت ہی

---

[1] استثناء اِسی اُصول پر مبنی ہے جس کی بنیاد پر علمائے سلف نے لڑکیوں کی تربیت اور کھیل کے لیے گڑیوں کے استعمال کی اجازت دی ہے اور جس کا ثبوت حدیث مبارکہ سے بھی ملتا ہے۔

قریب پہنچا دیتی ہیں جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ کانگریس کے اجلاس میں گاندھی جی کا باون فٹ لمبا فوٹو، یہ پولینڈ پر روسی قبضے کے بعد ہی اسٹالن کی تصویروں کا پولینڈ کے ایک ایک گاؤں میں درآمد کیا جانا، یہ روس میں ہر جگہ اسٹالن اور پولت برو کے ارکان کے تصویروں کا لوگوں کے سروں پر مسلط رہنا، یہ جرمن سپاہیوں کا ہٹلر کی تصویر کو سینے سے لگائے پھرنا اور پھر ہسپتال میں مرتے وقت اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگا کر جان دینا، یہ سینما میں شاہ انگلستان کی تصویر سامنے آتے ہی لوگوں کا کھڑا ہو جانا، یہ سکّوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامتِ حاکمیت ثبت کیا جانا، کیا یہ سب بت پرستی کی جڑیں نہیں ہیں؟ آخر اِسی لیے تو اسلام نے تصویر کو حرام کیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر خدا کے سوا کسی دوسرے کی کبریائی کا نقش قائم نہ ہونے پائے۔ میں تو چھوٹے بچوں کی تصویریں لینے کو بھی اسی لیے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے اور اس کی تصویر فتنے کی موجب بن جائے۔ کنھیا جی کی بچپن کی تصویر آج تک بچ رہی ہے۔ لہٰذا آپ اپنے دوست کو سمجھا دیجیے کہ ان کا پیشہ شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کا خوف رکھتے ہیں تو بتدریج اس پیشے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کر لیں۔ اور اگر یہی کام کرنا چاہتے ہیں تو اسے خواہ مخواہ حلال بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اخلاقی تنزل کا بدترین مرتبہ یہ ہے کہ آدمی جس گناہ میں مبتلا ہو، اسے جھوٹی تاویلوں سے ثواب ٹھیرا لے۔ اس گڑھے میں گرنے کے بعد پھر آدمی کے سنبھلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

سوال: انٹرنس کے امتحان میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں شرکت کے لیے درخواست کے ہمراہ فوٹو ارسال کرنا لازمی ہے۔ پھر کیا ایسی صورت میں فوٹو کھنچوانا جائز ہے؟ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیت العلماء نے اس صورت کو جائز فرمایا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ فعل جائز کیوں کر ہو سکتا ہے؟

جواب: اس معاملے میں مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب کے فتوے سے اتفاق ہے۔ فوٹو کھنچوانا اگرچہ ناجائز ہے لیکن جہاں کسی حقیقی تمدنی نقصان سے بچنے یا کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے فوٹو کا استعمال ناگزیر ہو، وہاں صرف اس ضرورت کی حد تک ایسا کرنا جائز ہے۔ امتحانات

کے سلسلے میں چوں کہ یہ تجربہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگ دھوکا دے کر کسی دوسرے شخص کو اپنے بجائے امتحان دینے کے لیے بھیج دیتے ہیں، اس لیے درخواست کے ساتھ تصویر لگانا لازم کیا گیا ہے۔ اس ضرورت کو تصویر کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پورا کرنا مشکل ہے، اور دھوکے اور فریب کا سدّ باب بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے تصویر کھنچوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اسی طرح میرے نزدیک پاسپورٹ، تفتیش جرائم، طبی تحقیقات وضروریات، جہاد اور ناگزیر تعلیمی اغراض کے لیے بھی فن تصویر کا استعمال درست ہے۔ اصولِ فقہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات۔ یعنی انسان کی حقیقی ضروریات کے لیے وہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں جو بجائے خود ناجائز ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۲ھ، جولائی، اگست ۴۳ء)

.....☆☆☆.....

نواقض وضو:

سوال: اسلام نے جسم ولباس کی طہارت ونظافت کا جولحاظ رکھا ہے اس کی قدر و قیمت سے عقل انسانی انکار نہیں کرسکتی۔ لیکن اس سلسلے میں بعض جزئیات بالکل ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ریح کے نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا، حالاں کہ جسم کے ایک حصے سے محض ایک ہوا کے نکل جانے میں بظاہر کوئی ایسی نجاست نہیں ہے جس سے وضو ساقط ہوجائے۔ آخر اس ہوا سے کیا چیز گندی ہوجاتی ہے؟ اسی طرح پیشاب کرنے سے وضو کا سقوط، حالاں کہ اگر احتیاط سے پیشاب کیا جائے اور پھر اچھی طرح دھولیا جائے تو کہیں کوئی نجاست لگی نہیں رہ جاتی۔ یہی حال دوسرے نواقض وضو کا ہے، جس سے وضو ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ براہِ کرم اس اُلجھن کو اس طرح دور کیجیے کہ مجھے عقلی اطمینان حاصل ہوجائے۔

جواب: نواقض وضو کے مسئلے میں آپ کو جو شبہات پیش آئے ہیں، انہیں اگر آپ حل کرنا چاہیں تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ شریعت میں جن جن باتوں سے وضو کے ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کا حکم لگایا گیا ہے پہلے ان سب کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے، پھر خود اپنے طور پر سوچیے کہ عام انسانوں کے لیے (جن میں عالم اور جاہل، عاقل اور کم عقل، طہارت پسند اور طہارت سے غفلت کرنے والے، سب ہی قسم کے لوگ مختلف درجات وحالات کے موجود ہیں) آپ کو ایک ایسا ضابطہ بنانا ہے جس میں حسب ذیل خصوصیات موجود ہوں:

۱۔ لوگوں کو بار بار صاف اور پاک ہوتے رہنے پر مجبور کیا جائے اور ان میں نظافت کی حس اس قدر بیدار کردی جائے کہ وہ نجاستوں اور کثافتوں سے خود بچنے لگیں۔

۲۔ خدا کے سامنے حاضر ہونے کی اہمیت اور امتیازی حیثیت ذہن میں بٹھائی جائے تاکہ نیم شعوری طور پر آدمی خود بخود اپنے اندر یہ محسوس کرنے لگے کہ نماز کے قابل ہونے کی حالت دنیا کی دوسری مشغولیتوں کے قابل ہونے کی حالت سے لازماً مختلف ہے۔

۳۔ لوگوں کو اپنے نفس اور اس کے حال کی طرف توجہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ وہ اپنے پاک یا ناپاک ہونے، اور ایسے ہی دوسرے احوال سے جو ان پر وارد ہوتے رہتے ہیں، بے خبر نہ ہونے پائیں اور ایک طرح سے خود اپنے وجود کا جائزہ لیتے رہیں۔

۴۔ ضابطے کی تفصیلات کو ہر شخص کے اپنے فیصلہ اور رائے پر نہ چھوڑا جائے بلکہ ایک طریق کار معین ہوتا کہ انفرادی طور پر لوگ طہارت میں افراط وتفریط نہ کریں۔

۵۔ ضابطہ اس طرح بنایا جائے کہ اس میں اعتدال کے ساتھ طہارت کا مقصد حاصل ہو، یعنی نہ اتنی سختی ہو کہ زندگی تنگ ہو کر رہ جائے اور نہ اتنی نرمی کہ پاکیزگی باقی نہ رہے۔

ان پانچ خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر آپ خود ایک ضابطہ تجویز کریں اور خیال رکھیں کہ اس میں کوئی بات اس نوعیت کی نہ آنے پائے جس پر وہ اعتراضات ہو سکتے ہوں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

اس قسم کا ضابطہ بنانے کی کوشش میں اگر آپ صرف ایک ہفتہ صرف کریں گے تو آپ کی سمجھ میں خود بخود یہ بات آجائے گی کہ ان خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر صفائی وطہات کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا جا سکتا جس پر اُس نوعیت کے اعتراضات وارد نہ ہو سکتے ہوں جو آپ نے پیش کیے ہیں۔ آپ کو بہر حال کچھ چیزیں ایسی مقرر کرنی پڑیں گی جن کے پیش آنے پر ایک طہارت کو ختم شدہ فرض کرنا اور دوسری طہارت کو ضروری قرار دینا ہوگا۔ آپ کو یہ بھی متعین کرنا ہوگا کہ ایک طہارت کی مدت قیام (Duration) کن حدود تک رہے گی اور کن حدود پر ختم ہو جائے گی۔ اس غرض کے لیے جو حدیں بھی آپ تجویز کریں گے، ان میں ناپاکی ظاہر اور نمایاں اور محسوس نہ ہوگی، بلکہ فرضی اور حکمی ہی ہوگی اور لامحالہ بعض حوادث ہی کو حد بندی کے لیے نشان مقرر کرنا ہوگا۔ پھر آپ خود غور کیجیے کہ آپ کی تجویز کردہ حدیں ان اعتراضات سے کس طرح بچ سکتی ہیں جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں۔

جب آپ اس زاویۂ نظر سے اس مسئلے پر غور کریں گے تو آپ خود بخود اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ شارع نے جو ضابطہ تجویز کر دیا ہے وہی ان اغراض کے لیے بہترین اور غایت درجے معتدل ہے۔ اس کے ایک ایک جزئیہ کو الگ الگ لے کر علت ومعلول اور سبب ومسبّب کا ربط تلاش کرنا معقول طریقہ نہیں ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کیا بحیثیت مجموعی ان اغراض ومصالح کے لیے جو اوپر بیان ہوئی ہیں، اس سے بہتر اور جامع تر کوئی ضابطہ تجویز کیا جا سکتا ہے؟ لوگوں کو احکام وضو میں جو غلط فہمی پیش آتی ہے، اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اُس بنیادی حکمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو بحیثیت مجموعی ان احکام میں ملحوظ رکھی گئی ہے، بلکہ ایک ایک جزوی حکم کے متعلق یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں فعل میں آخر کیا بات ہے کہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی ضرب آخر کس طرح شکست وضو کا سبب بن جاتی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

آلات کے ذریعے سے توالد وتناسل:

سوال: کیمیاوی آلات کے ذریعے سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو، تو یہ عمل مضرت سے خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں؟ اور اس عمل کی معمولہ زانیہ شمار کی جائے گی اور اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟ اس امر کا خیال رکھیے کہ آج کل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے۔ وہ اگر سائنٹفک طریقوں سے اپنے حصے کی نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کر دے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ امریکا میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے۔

جواب: آلات کے ذریعے سے استقرار حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لیے اس عمل کا تصور ہی ناقابل برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک گرا دی جائے۔ آخر انسان کی صنف اناث اور حیوانات کی مادہ میں کچھ تو فرق رہنے دیجیے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے توالد وتناسل کا جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہی ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے کہ وہ گھوڑیوں کو اپنے نروں سے ملنے کا لطف حاصل نہیں کرنے دیتا اور ان سے صرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان کی اپنی ''مادہ'' کے ساتھ بھی یہی برتاؤ شروع ہو جائے تو اس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔

آج کی ''فیشن دار'' عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل اس کی فطرت کو مصنوعی فکری وصنفی ماحول نے مسخ کر دیا ہے۔ ورنہ اگر وہ صحیح انسانی فطرت پر ہوتی تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار، ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرتی۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی قدرتی بنیاد ہے۔ فطرت الٰہی نے عورت اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان میں مودّت اور رحمت ہو، حسن معاشرت ہو، مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائٹی نشو ونما حاصل کرے۔ اس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے، لہٰذا وہی اولاد جائز

اولاد ہے جو قید نکاح میں پیدا ہو۔اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے۔اگر آلے کے ذریعے سے بچہ پیدا کیا جائے تو اسے حلالی نہیں کہا جا سکتا۔شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔نیز اس کا سلسلۂ آبائی منقطع ہوگا اور وہ باپ کے ورثے سے محروم رہے گا جو قطعی طور پر اس کی حق تلفی ہے۔

پھر غور تو کیجیے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار کون ہوگا؟ صرف ماں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچے کے لیے ماں اور باپ، چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کیے ہیں، ان میں سے آدھے ساقط کر دیے جائیں اور وہ صرف سلسلۂ مادری پر منحصر رہ جائے؟ کیا دنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری قائم رہے مگر مرد ہمیشہ کے لیے باپ ہونے کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جائے؟

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے ''امتحانی نلیوں'' میں پالا جائے۔یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے۔اور جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی، عورت چاہے گی کہ اسے صرف بچہ جننے کی تکلیف دی جائے، اس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے وہ تیار نہ ہوگی۔

یہ صورت جب رونما ہوگی تو انسانی بچے اسی طرح ''کثیر پیدا آوری'' (Mass Production) کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں۔یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اس کا اسفل السافلین ہوگا۔ان ''کارخانہ ہائے نسل کشی'' سے انسان نہیں بلکہ دو ٹنگے جانور پیدا ہوں گے جن میں انسانی شرف اور پاکیزہ انسانی جذبات واحساسات کی خوبو برائے نام بھی نہ ہوگی اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہوگا جو تمدن کی رنگا رنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔میرے خیال میں تو وہ مادّہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں۔اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

مشینی امامت:

سوال: ریڈیو ایک ایسا آلہ ہے جو ایک شخص کی آواز کو سیکڑوں میل دور پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح گراموفون کے ریکارڈوں میں انسانی آواز کو محفوظ کرلیا جاتا ہے اور پھر اسے خاص طریقوں سے دہرایا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی امام ہزاروں میل کے فاصلے سے بذریعۂ ریڈیو امامت کرائے یا کسی امام کی آواز کو گراموفون ریکارڈ میں منضبط کرلیا گیا ہو اور اسے دہرایا جائے، تو کیا ان آلاتی آوازوں کی اقتدا میں نماز کی جماعت کرنا جائز ہے؟

جواب: ریڈیو پر ایک شخص کی امامت میں دُور دراز کے مقامات کے لوگوں کا نماز پڑھنا یا گراموفون کے ذریعے سے نماز کا ریکارڈ بنانا اور پھر کسی جماعت کا اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا اصولاً صحیح نہیں ہے۔ اس کے وجوہ پر آپ غور کریں تو خود آپ کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

امام کا کام محض نماز پڑھانا ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک طرح سے مقامی جماعت کا رہنما ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اپنے مقام کے لوگوں سے شخصی ارتباط قائم کرے، ان کے اخلاق، معاملات اور مقامی حالات پر نظر رکھے، اور حسب موقع وضرورت اپنے خطبوں میں یا دوسرے مفید مواقع پر اصلاح وارشاد کے فرائض انجام دے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمانوں کی دوسری چیزوں کے ساتھ اس ادارے میں بھی اب انحطاط رونما ہوگیا ہے۔ لیکن بہرحال نفس ادارہ کو تو اپنی اصلی صورت پر قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر ریڈیو پر نمازیں ہونے لگیں یا گراموفون سے امامت وخطابت کا کام لیا جانے لگے تو امامت کی اصل روح ہمیشہ کے لیے فنا ہوجائے گی۔

نماز دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی طرح محض ''پوجا'' نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی امامت سے شخصیت کو خارج کردینا اور اس میں ''مشینیت'' پیدا کردینا دراصل اس کی قدر و قیمت کو ضائع کردینا ہے۔

علاوہ بریں اگر کسی مرکزی مقام سے کوئی شخص ریڈیو یا گراموفون کے ذریعے سے امامت وخطابت کے فرائض انجام دے اور مقامی امامتوں کا خاتمہ کردیا جائے، تو یہ ایک ایسی مصنوعی یکسانی ہوگی جو اسلام کی جمہوری روح کو ختم کردے گی اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ کو ترقی دے گی۔ یہ چیز ان نظامات کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے جن میں پوری پوری آبادیوں کو ایک مرکز سے

کنٹرول کرنے اور تمام لوگوں کو ایک لیڈر کا بالکلیہ تابع بنادینے کا اُصول اختیار کیا گیا ہے، جیسے فاشزم اور کمیونزم۔ لیکن اسلام ایک مرکزی امام یا امیر کے اقتدار کو ایسا ہمہ گیر بنانا نہیں چاہتا کہ مقامی لوگوں کی باگ ڈور بالکل اس کے ہاتھوں میں چلی جائے اور خود ان کے اندر اپنے مفاد کو سوچنے، اپنے معاملات کو سمجھنے اور ان کو طے کرنے کی صلاحیت ہی نشو ونما نہ پا سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرن خیر القرون میں ''امام'' محض پجاری کی حیثیت نہیں رکھتے تھے جن کا کام چند مذہبی مراسم کو ادا کرا دینا ہو، بلکہ وہ مقامی لیڈر کے طور پر مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کا کام تعلیم وتزکیہ اور اصلاحِ تمدن ومعاشرت تھا، اور مقامی جماعتوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا تھا کہ وہ بڑی اور مرکزی جماعت کی فلاح وبہبود میں اپنی قابلیتوں کے مطابق حصہ لیں۔ ایسے اہم مقاصد ریڈیو سیٹ یا گراموفون سے کیوں کر پورے ہو سکتے ہیں۔ آلات انسان کا بدل کبھی نہیں ہو سکتے، صرف مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ''مشینی امامت'' اسلام کی روح کے بالکل خلاف ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری فروری ۴۴ء)

اسلام اور آلات موسیقی:

سوال: (۱) آلات موسیقی بنانا اور ان کی تجارت کرنا جائز ہے؟

(۲) کیا شادی بیاہ کے موقع پر باجے وغیرہ بجانا جائز ہیں؟ نیز تفریحاً ان کا استعمال کیسا ہے؟

(۳) اگر جواب نفی میں ہو تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود ان کا استعمال نہیں کرتے لیکن ایسے تعلق داروں کے ہاں بخوف کشیدگی چلے جاتے ہیں جو آلات موسیقی کا استعمال کرتے ہیں؟

(۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونے کی اجازت ہے جہاں آلات موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو؟

(۵) آلاتِ لہو کے حامیوں کا خیال ہے کہ چوں کہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں دف ہی ایک موسیقی کا آلہ عرب میں رائج تھا اور آپ نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، لہٰذا ہمارے زمانے میں دف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں مستعمل ہو گئی ہیں تو ان کا استعمال کیوں نہ روا ہو؟

(۶) کیا دف آلات لہو میں شامل ہے؟

جواب: (۱) حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں آلات موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔'' اب یہ کس طرح صحیح سکتا ہے کہ جو نبی اس کام کے لیے بھیجا گیا ہو، اس کے پیرو انہی آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کے لیے اپنی قوتیں استعمال کریں۔

(۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور، باجے بجانا کسی حال میں درست نہیں۔ حدیث میں جس حد تک اجازت پائی جاتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شادی اور عید کے موقع پر دف کے ساتھ کچھ گا بجالیا جائے۔

(۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے کہ آدمی اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ناراضی سے ڈر کر ایک ناجائز کام میں حصہ لے۔ رسولؐ اور اصحاب رسول کے ساتھ جو لوگ اپنا حشر چاہتے ہوں، ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھیں جنہیں احکامِ شریعت کی پروا نہیں۔ ورنہ جن کو ان لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں، انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جاسکتا۔ جب تمہاری دنیا فاجروں کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی انہی کا ساتھ نصیب ہوگا۔

(۴) جواب نمبر ۳ ملاحظہ ہو۔ مگر یہ خیال رہے کہ مجلس نکاح میں جب کہ ایجاب وقبول ہو رہا ہو اور منکرات وفواحش کی نمایش نہ ہو رہی ہو، شرکت کرنے میں مضائقہ نہیں، بلکہ اَولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی وشرافت کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمہارے جائز کاموں کا تعلق ہے ہم تمہاری مسرت میں دل سے شریک ہیں، اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم ان خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دف کے سوا اس زمانے میں اور کوئی دوسرا آلۂ موسیقی نہ تھا۔ ایران اور روم اور مصر کی تمدنی تاریخ اور خود عرب جاہلیت کی تمدنی تاریخ سے جو شخص جاہلِ محض ہو، وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعار جاہلیت میں ملتے ہیں۔

(۶) دف کا نام اگر آلات موسیقی میں شامل ہو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور عید کے موقع پر نبیؐ نے اس کی اجازت دی ہے۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک آدمی جاسکتا ہے۔ اس آخری حد کو جو شخص نقطۂ آغاز بنانا چاہتا ہو، اس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ

مخواہ اس نبیؐ کے پیروؤں میں اپنا نام لکھوائے جو آلات موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے؟''

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۳ھ، جنوری، فروری ۴۴ء)

عذر مجبوری کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت:

سوال: ایک شخص غیر اللہ مثلاً بادشاہ یا حکومت باطلہ کی اطاعت کرتا ہے اور اعتقاداً بھی اسی کو حق سمجھتا ہے۔ دوسرا شخص اعتقاداً تو اس کی بندگی نہیں کرتا لیکن عملاً اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے لیے مجبوری کا عذر پیش کرتا ہے۔ کیا ان دونوں کے عمل میں کوئی تفریق کی جا سکتی ہے؟ آپ کی تفسیر الٰہ وربّ کے لحاظ سے تو دونوں ایک ہی درجے میں ہوئے، حالاں کہ دونوں میں بعدالمشرقین ہے۔

جواب: میں اپنے مضامین میں کئی جگہ اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ تمام انسان حسبِ ذیل چار طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

ا: **مومن بالغیر و مسلم للغیر**: یعنی جو غیر اللہ کو مطاعِ برحق اور ماخذ امر اعتقاداً بھی مانتے ہیں اور عملاً اس کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ یہ مکمل کافر ہیں۔

ب: **مومن بالغیر و مسلم لِلّٰہ**: یعنی جو ایمان غیر اللہ پر رکھیں مگر اطاعت قوانین الٰہی کی کرتے ہیں۔ یہ پوزیشن ذمیوں کی اور ایک حد تک منافقوں کی ہے۔

ج: **مومن باللّٰہ و مسلم للغیر**: یعنی اللہ کو اعتقاداً مطاع برحق ماننے والے مگر غیر اللہ کی اطاعت وبندگی بجالانے والے۔ یہ پوزیشن ان مسلمانوں کی ہے جو کفار کے تابع فرمان ہو جائیں۔ اس حالت میں اگر مسلمان مبتلا ہو تو اسے اس پر نہ راضی ہونا چاہیے نہ مطمئن رہنا چاہیے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ یا تو اس حالت کو بدلنے کی کوشش کرے یا اس سے نکل جائے۔

د: **مومن باللّٰہ و مسلم للّٰہ**: یعنی اللہ ہی پر ایمان رکھنے والے اور اسی کی اطاعت کرنے والے۔ یہی مسلمانوں کی اصلی پوزیشن ہے اور قرآن کی دعوت تمام انسانوں کو یہی ہے کہ وہ یہی پوزیشن اختیار کرنے کی سعی کریں۔ اس پوزیشن میں کوئی رخنہ اس وجہ سے واقع نہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی غیر مسلم نظام میں مجبوراً اپنی کسی کوتاہی سے نہیں بلکہ حالات کے جبر سے گرفتار ہو جائے، جس طرح مکہ معظمہ میں مسلمان تھے، یا جس طرح بہت سے صحابہ کرام

کفار کے ہاتھوں اسیر ہوئے یا جیسا کہ اکثر انبیا کا حال رہا ہے کہ وہ نظام کفر ہی میں پیدا ہوئے۔اس طرح کی مجبورانہ گرفتاری اسلام لغیر اللہ کی تعریف میں نہیں آتی۔ کیوں کہ اوّل تو یہ چیز ان کی اختیار کردہ یا قبول کردہ نہ تھی بلکہ ان پر مسلط شدہ تھی۔دوسرے جب کوئی شخص مومن باللہ وکافر بالغیر ہو چکا ہو اور اس کے ساتھ جس نے اپنی حد تک مسلم للہ ہونے اور عاصی للغیر ہونے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو، اس پر مسلم للغیر ہونے کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

نیز یہ بات یقینی ہے کہ طبقۂ ج کی پوزیشن طبقۂ الف اور ب کے لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔مومن باللہ و مسلم للغیر مشرک اور کافر ہرگز نہیں ہیں۔لیکن اگر وہ اس حالت پر راضی ہیں یا اسے بدلنے اور اس سے نکلنے کی امکانی سعی نہیں کرتے تو سخت گناہ گار ہیں، ایسے گناہ گار کہ ان کی ساری زندگی گناہ بن کر رہ جاتی ہے۔ (ترجمان القرآن۔محرم، صفر ۶۴ھ، جنوری، فروری ۴۵ء)

خدا کے حضور دعا میں ہاتھ اٹھانا:

سوال: مقامی حلقوں میں میرے خلاف بعد نماز ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنے پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ یہاں بہت زیادہ آبادی ایک ایسے مسلک کے پیروں کی ہے جن کا امتیازی شعار ہی یہ ہے کہ دعا میں ہاتھ نہ اُٹھائے جائیں۔یہ حضرات میرے خلاف اپنے اعتراض میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً کے ارشاد کا تقاضا یہی ہے کہ دعا میں حد درجے اخفا برتا جائے۔ بخلاف اس کے ہاتھ اُٹھانے سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ بدیں وجہ دعا میں ہاتھ اُٹھانا قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔نیز احادیث سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا التزام کیا ہو۔اب عوام کو دلائل سے تو کچھ مطلب نہیں ہوتا، وہ لکیر کی فقیری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ میں ان کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حق نہیں رکھتا۔اس حکم کے نافذ کرنے والوں میں بعض حضرات خوب اچھے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ خیر یہ جاہلیت کے کرشمے ہیں۔ مجھے صرف مذکورۃ الصدر آیت کی روشنی میں اصل مسئلے کو سمجھایئے۔

جواب: ان حضرات سے دریافت کیجیے کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اپنے ربّ کو پکارو عاجزی کے ساتھ اور چپکے چپکے) کا اگر وہی تقاضا ہے جو آپ لوگ سمجھتے ہیں تو یہ نماز کے لیے بلند

آواز سے اذان، پھر علانیہ مسجدوں میں لوگوں کا مجتمع ہونا، پھر جماعت سے نماز پڑھنا، پھر نماز میں جہری قراءت کرنا، یہ سب کچھ بھی تو پھر اس آیت کے خلاف قرار پائے گا۔ نماز اصل میں تو ایک دعا ہی ہے۔ اگر دعا کے لیے اِخفا ایسا ہی لازمی ہے کہ اظہار کی کوئی شکل اس میں ہونی ہی نہ چاہیے، تو ظاہر ہے کہ نماز باجماعت کی پوری صورت ہی اس کے خلاف ہے۔

پھر جو کچھ یہ حضرات فرماتے ہیں، وہ حدیث کے بھی خلاف ہے۔ حدیث میں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگی جائے تو ہاتھ اُٹھا کر مانگی جائے اور دعا سے فارغ ہوکر چہرے پر ہاتھ مل لیے جائیں۔ ابوداؤد، ترمذی اور بیہقی میں اس مضمون کی متعدد روایات موجود ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے کہ:

اِنَّ رَبَّکُمْ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِ مِنْ عَبْدِہٖ اِذَا رَفَعَ یَدَیْہِ اَنْ یَرُدَّھُمَا صِفْراً۔

''تمہارا ربّ بڑا باحیا اور کریم ہے۔ بندہ جب اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسے شرم آتی ہے کہ اس کو خالی ہاتھ واپس کردے۔''

دوسری روایت میں حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبیؐ جب دعا مانگتے تھے تو ہاتھ اٹھا کر مانگتے تھے اور اس کے بعد اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر لیتے تھے۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''دعا میں ہاتھ اٹھانا اللہ کے آگے عاجزی اور مسکنت کے اظہار کے لیے ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ طریقہ رائج نہ تھا جو اب رائج ہے کہ نماز باجماعت کے بعد امام اور مقتدی سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ اس بنا پر بعض علما نے اس طریقے کو بدعت ٹھیرایا ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر اس کو لازم نہ سمجھ لیا جائے، اور اگر نہ کرنے والے کو ملامت نہ کی جائے، اور اگر کبھی کبھی قصداً اس کو ترک بھی کردیا جائے، تو پھر اسے بدعت قرار دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ خدا سے دعا مانگنا بجائے خود تو کسی حال میں برا فعل نہیں ہوسکتا۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل، جمادی الثانیہ ۶۴ھ، مارچ، جون ۴۵ء)

کرب کا علاج بذریعۂ موت:

سوال: اگر کسی مریض کے جاں بر ہونے کی قطعاً امید نہ رہی ہو اور شدت مرض کی وجہ سے وہ انتہائی کرب میں مبتلا ہو، یہاں تک کہ نہ غذا اندر جاتی ہو نہ دوا، تو کیا ایسے حالات میں کوئی طبیب

حاذق اس کو تکلیف سے نجات دینے کے لیے کوئی زہر دے کر اس کی زندگی کی دردناک گھڑیاں کم کرسکتا ہے؟ اس قسم کی موت وارد کرنے سے کیا اس پر شرعاً قتل کا الزام آئے گا؟ حالاں کہ اس کی نیت بخیر ہے؟

جواب: یقیناً اس پر قتل کا الزام آئے گا۔ اس معاملے میں نیت بخیر ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جس جان کا وہ مالک نہیں ہے اور جس کے خلاف کوئی شرعی حق بھی قائم نہیں ہوا ہے، اس کو اگر اس نے قصداً ہلاک کیا ہے تو وہ قطعی طور پر قتل عمد کا مجرم ہے۔

طبیب کو اللہ نے جو علم دیا ہے اس کی غرض انسانی جان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنا ہے نہ کہ اس کی موت کے لیے۔ جب تک کسی شخص کے اندر زندگی موجود ہو، طبیب کا فرض ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کرتا رہے، اور جس حد تک اس کے امکان میں ہو، اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے بھی سعی کرے۔ لیکن یہ بات ایک طبیب کے اخلاقی وشرعی حدود عمل سے بالکل خارج ہے کہ وہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ کون آدمی ہلاک کردیے جانے کا مستحق ہے۔ بلکہ یہ بات خود اس مریض کے اپنے حدود اختیار سے بھی باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کرے۔ اس لیے اگر مریض کا اپنا مطالبہ بھی ہو تب بھی طبیب کے لیے ایسا کوئی فعل ہرگز جائز نہیں ہے جو اسے ہلاک کرنے کی خاطر ہو۔

علاوہ بریں یہ بھی ایک قطعی غلط مفروضہ ہے کہ کوئی ڈاکٹر کسی مریض کے بارے میں یہ بالکل یقین کے ساتھ جان سکتا ہے کہ وہ ضرور مر جائے گا۔ ایسی مثالیں نادر نہیں ہیں جن میں ایک طبیب نے نہیں بلکہ متعدد طبیبوں نے بالاتفاق رائے قائم کی ہے کہ مریض نہیں بچے گا، اور پھر ان کے اندازوں کے بالکل خلاف اس کی جان بچ گئی ہے۔ اس لیے جو ڈاکٹر محض اندازے سے کسی شخص کے جاں برنہ ہونے کا فیصلہ کرے گا اور اس کی تکلیف دُور کرنے کے لیے اسے ہلاک کردے گا، وہ دراصل ایک بہت بڑا مظلمہ اپنی گردن پر لے گا۔ اپنے علم پر ایسا بے جا اعتماد ایک کافر ڈاکٹر تو کرسکتا ہے مگر یہ ایک مسلمان ڈاکٹر کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۶۵ھ، دسمبر ۴۵ء)

سفر میں قصر صلوٰۃ:

سوال: (ا) قصر صلوٰۃ انگریزی میلوں کے حساب سے کتنے لمبے سفر میں واجب ہے؟

(ب) کیا یہ فاصلہ یک طرفہ سفر کے لیے ہے یا آمد ورفت کی دُہری مسافت بھی شمار ہوگی؟

(ج) کیا ایک مقررہ حلقے میں سفر کرنے پر بھی یہ رعایت حاصل ہوگی؟

جواب: (ا) فقہا کی آرا اس معاملے میں مختلف ہیں۔ چنانچہ قصر صلوٰۃ کے لیے کم از کم ۹ میل اور زیادہ سے زیادہ ۴۸ میل کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آں حضورؐ سے اس معاملے میں کوئی صریح ارشاد منقول نہیں ہے اور نص صریح کی غیر موجودگی میں جن دلائل سے استنباط کیا گیا ہے، ان کے اندر مختلف اقوال کی گنجایش ہے۔ صحیح یہ ہے کہ قصر کے لیے مسافت کا ایسا تعین جس میں ایک نقطۂ خاص سے تجاوز کرتے ہی قصر کا حکم لگایا جاسکے شارع کا منشا نہیں۔ شارعؑ نے ''سفر'' کے مفہوم کو عرف عام پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بات ہر شخص خود بآسانی جان سکتا ہے کہ کب وہ سفر میں ہے اور کب سفر میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم شہر جاتے ہیں تو کبھی مسافر ہونے کا احساس ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ بخلاف اِس کے جب واقعتاً سفر درپیش ہوتا ہے تو ہم مسافرت کی کیفیت خود محسوس کرتے ہیں۔ اسی احساس کے مطابق قصر اور اتمام کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ شرعی معاملات میں صرف اس شخص کا فتوائے قلب معتبر ہے جو شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو نہ کہ بہانہ بازی کا۔

(ب) اس حصے کا جواب اوپر ہی کی سطور میں موجود ہے۔ ویسے جن فقہا نے مقدار سفر مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے پیشِ نظر یک طرفہ مسافت تھی۔

(ج) ہاں مقررہ حلقے میں سفر کرنے کی شکل میں بھی قصرِ صلوٰۃ کرنا چاہیے جس طرح اس حلقے سے باہر کے سفروں کے دوران میں۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی، اگست ۴۵ء)

ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ:

سوال: مسلمان قوم اگر ہندوستان میں گائے کی قربانی کو روک دے تو اسلام کی نگاہ میں کوئی قیامت نہیں آجاتی، خصوصاً جب کہ اس فعل میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ پھر کیوں نہ ایک ہمسایہ قوم کا اتحاد حاصل کرنے کے لیے رعایت سے کام لیا جائے؟ اکبر اعظم، جہانگیر، شاہجہان اور موجودہ نظام حیدرآباد نے عملی مثالیں اس سلسلے میں قائم کی ہیں۔

جواب: آپ نے جن بڑے بڑے ''اماموں'' کا نام لیا ہے مجھے ان میں سے کسی کی تقلید کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو راضی کرنے کے

لیے اگر گائے کی قربانی ترک کی تو چاہے وہ کائناتی قیامت نہ آجائے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، لیکن ہندوستان کی حد تک اسلام پر واقعی قیامت تو ضرور آجائے گی۔ افسوس یہ ہے کہ آپ لوگوں کا نقطۂ نظر اس مسئلے میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ آپ کے نزدیک اہمیت صرف اس امر کی ہے کہ کسی طرح دو قوموں کے درمیان اختلاف ونزاع کے اسباب دُور ہو جائیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک اصل اہمیت یہ امر رکھتا ہے کہ توحید کا عقیدہ اختیار کرنے والوں کو شرک کے ہر ممکن خطرے سے بچایا جائے۔

جس ملک میں گائے کی پوجا نہ ہوتی ہو اور گائے کو معبودوں میں شامل نہ کیا گیا ہو اور اس کے تقدس کا بھی عقیدہ نہ پایا جاتا ہو، وہاں تو گائے کی قربانی محض ایک جائز فعل ہے، جس کو اگر نہ کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن جہاں گائے معبود ہو اور تقدس کا مقام رکھتی ہو، وہاں تو گائے کی قربانی کا حکم ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر ایسے ملک میں کچھ مدت تک مسلمان مصلحتاً گائے کی قربانی ترک کر دیں اور گائے کا گوشت بھی نہ کھائیں تو یہ یقینی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اپنی ہمسایہ قوموں کے گاؤ پرستانہ عقائد سے وہ متاثر ہو جائیں گے اور گائے کے تقدس کا اثر ان کے قلوب میں اسی طرح بیٹھ جائے گا جس طرح مصر کی گاؤ پرست آبادی میں رہتے ہوئے بنی اسرائیل کا حال ہوا تھا کہ ''اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ''۔ پھر اس ماحول میں جو ہندو اسلام قبول کریں گے وہ چاہے اسلام کے اور دوسرے عقائد قبول کر لیں، لیکن گائے کی تقدیس ان کے اندر بدستور موجود رہے گی۔ اسی لیے ہندوستان میں گائے کی قربانی کو میں واجب سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ میرے نزدیک کسی نو مسلم ہندو کا اسلام اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک وہ کم از کم ایک مرتبہ گائے کا گوشت نہ کھا لے۔ اسی کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ ''جس نے نماز پڑھی جیسی ہم پڑھتے ہیں اور جس نے اسی قبلے کو اختیار کیا جو ہمارا ہے، اور جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا وہ ہم میں سے ہے۔'' یہ ''ہمارا ذبیحہ کھایا'' دوسرے الفاظ میں یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے ان اوہام وقیود اور بندشوں کا توڑنا بھی ضروری ہے جن کا جاہلیت کی حالت میں کوئی شخص پابند رہا ہو۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی، اگست ۴۵ء)

جبری امتناع کی صورت میں مباحات کا وجوب:

سوال: ہمارے مقامی خطیب صاحب نے ایک وعظ میں یہ فرمایا ہے کہ اگر کسی ملک میں جبراً گاؤکشی بند کردی جائے تو اس صورت میں ملک کے مسلمانوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اس حکم امتناعی کی خلاف ورزی کریں۔ یہ فتویٰ مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ آخر شریعت نے جن چیزوں کو حلال ٹھہرایا ہے، وہ بس حلال ہی تو ہیں، واجب کیسے ہوگئیں؟ مثلاً اونٹ کا گوشت کھانا حلال ہے، لیکن اگر کوئی نہ کھائے تو گناہ گار نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حلّت کے معنی وجوب کے نہیں ہیں۔ پھر یہ مولوی صاحب فرضیت کا فتویٰ کہاں سے دیتے ہیں؟ آپ فرمائیے کہ مذکورۂ بالا فتویٰ کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: یہ بات تو بہت صحیح ہے کہ جب کسی مباح چیز کو کوئی حکومت یا کوئی طاقت زبردستی حرام قرار دے دے تو اس کی قائم کی ہوئی حرمت کو تسلیم کرنا گناہ ہے اور اس کو توڑنا واجب ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ جو حضرات چھوٹے چھوٹے مباحات کے معاملے میں شریعت کے اس حکم سے واقف ہیں، ان کو یہ یاد کیوں نہیں آتا کہ جس نظام حکومت میں وہ رہتے ہیں، اس نے حلال وحرام قرار دینے کے پورے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور نماز، روزہ اور نکاح وطلاق کے چند مسائل کو چھوڑ کر خدا کی پوری شریعت کو منسوخ کردیا ہے۔ اگر گاؤکشی کی ممانعت پر گاؤکشی مباح کے بجائے فرض ہوجاتی ہے تو پوری شریعت کی تنسیخ پر کیا کچھ فرض عائد ہوجاتا ہوگا، یہ ان مولوی صاحب سے پوچھیے!

شریعت اسلامی کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ زندگی میں اپنا پورا غلبہ بلاشرکت غیر چاہتی ہے۔ اور اگر غیر اللہ کا کوئی اقتدار انسانوں پر اپنا دامن پھیلانا چاہتا ہو تو اسلامی شریعت اپنے متبعین کو اس کا باغی دیکھنا چاہتی ہے نہ کہ مطیع ووفاشعار۔ جس نظام حق کو گائے کی قربانی جیسے معمولی مسئلے میں غیر اللہ کی مداخلت گوارا نہیں ہے، وہ آخر اسے کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ سیاست اور معیشت اور معاشرت کے اہم مسائل میں خدا سے سرکشی کرنے والی کوئی قوت اپنی مرضی کو اللہ کے بندوں پر نافذ کرے۔

شریعت اسلامی کی یہی اسپرٹ ہمیشہ نظام کفر وجاہلیت کے خلاف اربابِ حق کو صف آرا کرتی رہی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی پوری ہوتی رہی ہے کہ میری امت

میں جہاد قیامت تک جاری رہے گا، نہ کسی عادل کا عدل اسے ختم کر سکے گا نہ کسی ظالم کا ظلم۔ یہی اسپرٹ ہمیشہ تجدید اسلام کی تحریکوں کی محرک رہی ہے اور اسی نے صالحین کو ماحول کی خوف نا کیوں کے آگے جھک جانے سے روکا ہے۔

مگر جہاں یہ اسپرٹ مسلمانوں میں کمزور ہوگئی ہے وہاں انہوں نے اپنی اسلامیت میں کتر بیونت کر کے ہر قسم کے نظام ہائے طاغوت کو نہ صرف یہ کہ گوارا کر لیا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ اسے چلانے اور مستحکم رکھنے اور اس کا تحفظ کرنے کی خدمات تک سرانجام دینے کے لیے تاویلیں کر لی ہیں۔

یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ گاؤکشی اگر طاغوت کی روک سے مباح کے بجائے واجب ہو جاتی ہے تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نظام کا قائم کرنا جو پہلے ہی فرض اور بہت بڑا فرض ہے، باطل کی طرف سے کسی مزاحمت کے پیدا ہو جانے پر دین کے ہر فرض سے بڑا فرض ہو جاتا ہے اور اس سے چشم پوشی کر کے اگر مسلمان ہزار نفلی عبادتیں بھی کرے تو وہ بے معنی ہیں۔

درحقیقت کسی غیر الٰہی طاقت کی مداخلت فی الدین چاہے کتنے ہی چھوٹے معاملے میں ہو، مسلمان کے عقیدۂ توحید پر براہ راست ضرب لگاتی ہے اور ہر ایسی مداخلت کے معنی یہ ہیں کہ مداخلت کرنے والے نے ایک خاص معاملے میں اپنی خدائی کا عملی اعلان کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعلان پر مسلمان کا امن وسکون سے بیٹھے رہنا تک اس کے ایمان کو مشتبہ کر دیتا ہے، کجا یہ حال کہ اس اعلان کے اعلانچی خود مسلمان ہوں اور وہ دوسروں سے بالجبر اسے منوانے کے لیے اپنی قوتیں باطل کے ہاتھ فروخت کر دیں۔

پس اصلی مسئلہ قربانیِ گاؤ کا نہیں ہے، بلکہ عقیدۂ توحید کی حفاظت کا ہے۔ اس کی حفاظت میں کوتاہی کر کے ہم کس اُخروی بہبود کی امیدیں قائم کر سکتے ہیں!

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ ۶۵ھ۔ اکتوبر ۴۶ء)

تزکیۂ نفس کی حقیقت:

سوال: یہاں کی مقامی فضا تصوف کے چرچے سے معمور ہے۔ اس سے اکثر طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت دو باتیں دریافت طلب ہیں:

۱۔ تزکیۂ نفس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس بارے میں رسولؐ اللہ کی تعلیم کیا تھی؟ متصوفین کا

اس سلسلے میں صحیح عمل کیا رہا ہے؟ نیز ایک مسلمان کو اپنی زندگی کے اس شعبے میں کیا صورت اختیار کرنی چاہیے؟

ب۔ کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آج کل کے صوفیہ کی طرح تزکیۂ نفس کیا کرتے تھے اور عالم بالا کے مشاہدات ہوتے رہتے تھے؟

جواب: سوال کے پہلے جزو کے جواب میں یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے: ایک پاک صاف کرنا، دوسرے بڑھانا اور نشو ونما دینا۔ اس لفظ کو قرآن مجید میں بھی انہی دونوں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پس تزکیہ کا عمل دو اجزا سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ نفس انسانی کو انفرادی طور پر اور سوسائٹی کو اجتماعی طور پر ناپسندیدہ صفات اور بری رسوم وعادات سے پاک صاف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پسندیدہ صفات کے ذریعے سے اس کو نشو ونما دیا جائے۔

اگر آپ قرآن مجید کو اس نقطہ نظر سے دیکھیں اور حدیث میں اور کچھ نہیں تو صرف مشکوٰۃ ہی پر اس خیال سے نظر ڈال لیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ کون سی ناپسندیدہ صفات ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسولؐ دور کرنا چاہتے ہیں، اور وہ کون سی پسندیدہ صفات ہیں جن کو وہ افراد اور سوسائٹی میں ترقی دینا چاہتے ہیں۔ نیز قرآن وحدیث کے مطالعے ہی سے آپ کو ان تدابیر کی بھی پوری تفصیل معلوم ہو جائے گی جو اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اور اس کے رسولؐ نے استعمال کی ہیں۔

اہل تصوف میں ایک مدت سے تزکیۂ نفس کا جو مفہوم رائج ہو گیا ہے اور اس کے جو طریقے عام طور پر ان میں چل پڑے ہیں وہ قرآن وسنت کی تعلیم سے بہت ہٹے ہوئے ہیں۔

دوسرے جز کا جواب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے تو عالم بالا کے معاملے میں صرف رسولؐ کے اعتماد پر غیب کی ساری حقیقتوں کو مان لیا تھا، اس لیے مشاہدے کی نہ ان کو طلب تھی اور نہ اس کے لیے انہوں نے کوئی سعی کی۔ وہ بجائے اس کے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے، اپنی ساری قوتیں اس جدوجہد میں صرف کرتے تھے کہ پہلے اپنے آپ کو اور پھر ساری دنیا کو خدائے واحد کا مطیع بنائیں اور دنیا میں عملاً وہ نظام حق قائم کر دیں جو برائیوں کو دبانے اور بھلائیوں کو نشو ونما دینے والا ہو۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی، اگست ۴۵ء)

الکوحل آمیز ادویہ کا استعمال:

سوال: اس زمانے میں انگریزی دوائیں جو عام طور پر رائج ہیں، ان میں سے ہر رقیق دوا میں الکوہل (جوہرِ شراب) شامل ہوتا ہے۔ میں ان سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ تحریم خمر کے متعلق جو حکم قرآن میں ہے، اس میں اگر خمر کا مطلب ''نشہ آور چیز'' لیا جائے تو دوا میں الکوہل اتنا کم ہوتا ہے کہ نشہ نہیں کرتا اور نہ کوئی اس مقصد سے پیتا ہے نہ اس ترکیب سے اس کو اپنے لیے حلال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں باریک بینی کی جائے تو ڈبل روٹی میں بھی آٹے کا خمیر اُٹھنے پر کچھ الکوہل بن جاتا ہے، اور شربت جو بوتلوں میں آتے ہیں، ان میں بھی کچھ الکوہل ضرور بن جاتا ہے۔ بلکہ الکوہل تو باسی انگوروں میں بھی بنتا ہے۔ اگر ان صورتوں میں کوئی وجہ حرمت نمودار نہیں ہوتی تو آخر صرف دوا ہی کے اندر الکوہل کی شمولیت کیوں اتنی زیادہ قابل توجہ ہو؟

نیز اگر باعتبار لغت خمر کا مطلب انگوری شراب لیا جائے تو الکوہل انگوری شراب نہیں ہے۔ اس لیے انگریزی دوائیں ناجائز نہ ہونی چاہییں۔ لیکن علما نے اس زمانے میں جب ایسی ادویات سامنے نہیں تھیں، ایسے سخت فتوے دے دیے کہ آج انہیں مختلف مواقع پر چسپاں کرنے سے بڑی مشکل پیش آرہی ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ آج کل یونانی ادویۂ مرکبہ کا خالص حالت میں دستیاب ہونا بہت ہی دشوار ہے۔ خمیرہ مروارید میں بڑے سے بڑا متقی دوا ساز بھی مروارید کی جگہ صدف ملا دیتا ہے۔ نیز جانیں بچانے کے لیے جب لوگ زیادہ ترقی یافتہ انگریزی طب اور جراحی کے ماہرین کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہیں تو آخر وہ یونانی ادویہ تجویز کر کے تو دینے سے رہے! ان سارے پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر آپ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: خمر اگرچہ انگوری شراب کو کہتے ہیں لیکن اس سے مراد ہر نشہ آور چیز ہے۔ چنانچہ خمر کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ ''الخمر ما خامر العقل''یعنی ہر وہ چیز خمر ہے جو عقل کو ڈھانک لے اور شریعت میں یہ اُصول بیان کیا گیا ہے کہ ''ما اسکر کثیرہٗ فقلیلہ حرام''یعنی جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔ یہ کم مقدار کی حرمت نشے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کم مقدار استعمال کر لینے سے نفس کے اندر کی وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے، یا کم از کم کمزور پڑ جاتی ہے، جو حرام چیز کے لیے نفس میں موجود ہوتی ہے۔

پھر یہ بات علمی طریق پر معلوم ہے کہ تمام شرابوں میں وہ اصل چیز جو نشہ پیدا کرنے والی ہے، الکوہل ہی ہے۔ اس لیے کسی صورت میں اس کا استعمال جائز تو نہیں ہوسکتا۔ البتہ ایسے حالات میں جب کہ فن طب کی ترقی مسلمانوں کے ہاں ایک مدت سے بند ہوچکی ہے اور جدید زمانے میں اس فن کی تمام ترقیات ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی ہیں جو حرام وحلال کی تمیز سے خالی ہیں اور انہوں نے نئے زمانے کی بیش تر مؤثر دواؤں میں الکوہل کو ایک اچھا محلّل پاکر دواسازی میں بکثرت استعمال کیا ہے، افراد کے لیے اضطرار کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ شریعت کسی انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ اپنی صحت اور اپنی زندگی کی حفاظت کے صرف ان ذرائع پر انحصار کرے جو کسی خاص زمانے تک دریافت ہوئے ہوں اور اس زمانے کے بعد دریافت ہونے والے ذرائع خواہ کتنے ہی کارگر اور مفید ہوں، ان سے اجتناب کرکے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔ اس لیے افراد تو اضطرار کی بِنا پر ان ذرائع میں حرمت کا سبب موجود ہوتے ہوئے بھی ان کو اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے استعمال کرسکتے ہیں، لیکن تمام مسلمان بحیثیت مجموعی اس وقت تک اس گناہ کے ذمہ دار بنتے رہیں گے جب تک وہ فن طب اور دواسازی کی جدید ترقیات کو مسلمان بنالینے کی اجتماعی کوشش نہ کریں۔

جدید فن طب اور دواسازی کو مسلمان بنانے سے میری مراد یہ ہے کہ اس فن کی تمام موجودہ اور آیندہ ترقیات کو اسلام کے اُصول اخلاق کا پابند بنایا جائے اور دواسازی کے تمام موجودہ اور آیندہ ترقی پذیر ذرائع کو اسلامی حدود کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ یہ کام جب تک اجتماعی سعی سے نہ ہوگا، افراد تو اضطرار کی وجہ سے معاف ہوتے رہیں گے، لیکن جماعت کے نامۂ اعمال میں مسلسل گناہ لکھا جاتا رہے گا۔ اجتماعی گناہوں کی یہی خاصیت ہے کہ ان کی وجہ سے افراد کے لیے انفرادی طور پر اضطرار کی حالت پیدا ہوجاتی ہے، مگر اجتماعی طور پر پوری جماعت گناہ گار قرار پاتی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۶۵ھ، جون ۴۶ء)

راجا کی غائبانہ سلامی:

سوال: سکول میں ڈرل کے بعد مہاراجا صاحب کی سلامی بینڈ پر اُتاری جاتی ہے۔ یہ غائبانہ سلامی ہے اور اسے وفاداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بندے کو خدا کی معبودیت میں شریک ماننے سے قولاً وعملاً انکار کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے غور کے لیے مہلت دی

ہے۔آپ میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: آپ سلامی تو بہر حال نہ دیں، خواہ انجام کچھ بھی ہو، لیکن اپنی حد تک اس معاملے کو بخیر وخوبی ٹالنے کی کوشش کریں۔اس کی صورت یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر کو بہت ٹھنڈے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کیجیے کہ وہ اس معاملے کو طول دینے سے خود احتراز کرے۔اگر آپ سلامی کے موقع پر ٹل جایا کریں اور ہیڈ ماسٹر اس کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کرتا رہے تو بات چھوٹی رہے گی۔لیکن اگر وہ مجبور کرے اور آپ کے انکار پر باز پرس کرے تو کیا عجب کہ بات طول کھینچ جائے، اور نہ صرف آپ کے مدرسے میں بلکہ ساری ریاست میں اس کا اثر پھیل جائے۔یہی پہلو آپ ہیڈ ماسٹر کو سمجھا دیجیے گا۔اگر عقل مند ہوگا تو وہ خود خاموشی اختیار کر لے گا، ورنہ اس کو آخری مرحلے تک پہنچ جانے دیجیے اور سمجھیے کہ شاید آپ ہی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اس ریاست میں اس پیغام کو پھیلانے کا ایک موقع پیدا کرنا چاہتا ہے۔ایسی صورت پیش آجانے کے بعد اپنے آپ کو اچھی طرح تول لیجیے کہ پھر ذرّہ برابر کمزوری کا اظہار نہ ہونے پائے۔خواہ ملازمت سے برطرفی کی نوبت آئے یا ریاست سے اخراج کی۔میں بھی آپ کے لیے استقامت کی دعا کرتا ہوں۔

(ترجمان القرآن۔رجب، شعبان ۶۲ھ، جولائی اگست ۴۳ء)

غیر حکیمانہ تبلیغ:

سوال: ایک شخص کو ایک مدرسے میں تبلیغ کے لیے ملازم رکھا گیا ہے۔اب مدرسے کے منتظمین خود ہی اس کی تبلیغی مساعی کو روکنا چاہتے ہیں۔مثلاً بعض آیات بچوں کو یاد کرانے میں وہ مانع ہوتے ہیں۔ایسی چند آیات درج ذیل ہیں:

(۱) یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُو لَاتَتَّخِذُوا الیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اَوْلِیَآءَ۔ الآیہ

(۲) قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ الآیہ۔

(۳) وَمَنْ لَمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنزَلَ اللّٰہُ فَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ.....

.....ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ.....ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ۔

اب ایسے شخص کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ اسے مدرسے میں رہنا چاہیے یا نہیں۔

جواب: آپ جس طریقے سے سوال کر رہے ہیں، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ صورت واقعہ اس سے مختلف ہے اور آپ اسے ایک معصوم شکل میں پیش کر کے استفسار کر رہے ہیں۔

تبلیغ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ موقع ومحل کو دیکھے بغیر آدمی ہر جگہ ایک ہی طرح کی شدت برتے اور ہر مخاطب کے سامنے وہ انتہائی باتیں کہہ ڈالے جن کا تحمل ابتدائی مراحل میں کم ہی کوئی شخص کرسکتا ہے۔ جہاں لوگ توحید ورسالت اور آخرت کے ابتدائی تصورات تک سے بے گانہ ہوکر رہ گئے ہوں وہاں یکا یک ان کے سامنے ان عقائد کا محض مکمل تصور ہی نہیں بلکہ اسے تسلیم کرنے کے تمام لوازم اور عملی تقاضے تک پیش کرڈالنا اور پھر اس پر اتنا اصرار کرنا کہ لوگوں میں چڑ پیدا ہوجائے، حکمتِ تبلیغ کے خلاف ہے۔

اگر آپ کو، یا آپ کے کسی دوست کو، کسی وکیل یا جج کے ہاں بچوں کو پڑھانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے کیسی غلطی کی ہے کہ اس کے بچوں کو چن چن کر وہی آیتیں یاد کرانی شروع کردیں جو آپ نے نقل فرمائی ہیں، اور اس طرح اسے مجبور کردیا کہ یا تو وہ قرآن کے مقابلے میں آ کھڑا ہو، یا نہیں تو خود اپنے بچوں کی نگاہ میں کافر وفاسق قرار پائے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بجائے اگر آپ بتدریج ان بچوں کو اسلامی عقائد کے مبادی سے، پھر ان کی تفصیلات سے، پھر ان کے لوازم اور تقاضوں اور مطالبوں سے آگاہ کرتے، اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے ذریعے سے یہ چیزیں ان کو سمجھاتے چلے جاتے تو خطرے کا الارم بھی نہ بجتا، بچوں کو دین کی تعلیم بھی اچھی طرح مل جاتی، اور ان کے والد صاحب چاہے جو کچھ بھی بنے رہتے، مگر ان کی اولاد درست ہوجاتی۔ آپ نے اِس کے برعکس کم سمجھ بچوں کو ایسی باتیں یاد کرانی شروع کردیں جن کی بِنا پر وہ ہر جگہ اُلٹے سیدھے فتوے جڑنے لگے ہوں گے۔ یہی چیز خطرے کی گھنٹی بن گئی اور اس نے وہ صورت حال پیدا کردی جس میں آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ بچے کسی ایسے ہی معلم کے حوالے کیے جائیں گے جو مذہب کا ایسا تصور ان کے ذہن میں بٹھائے جس کی رُو سے خدا اور قیصر کے حقوق الگ الگ ہوں اور ساتھ ساتھ بے کھٹکے ادا کیے جاسکیں۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۴ھ، جنوری، فروری ۴۵ء)

.....☆☆☆.....

خلافیات

تقلید وعدم تقلید:

سوال: تقلیدِ ائمۂ اربعہ کے متعلق آپ کا نظریہ کیا ہے؟ یعنی تقلید کو آپ کسی حد تک جائز سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر جائز سمجھتے ہیں تو کس حد تک؟ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں، آپ ایک وسیع المشرب مقلد ہیں؟

جواب: میرا مسلک یہ ہے کہ ایک صاحب علم آدمی کو براہِ راست کتاب وسنت سے حکم صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس تحقیق وتجسس میں علمائے سلف کی ماہرانہ آرا سے بھی مدد لینی چاہیے۔ نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرنا چاہیے کہ ائمۂ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب وسنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ پھر جو چیز حق معلوم ہو، اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔

میں نہ مسلک اہل حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ جماعت اسلامی میں جو لوگ شریک ہوں، ان کا فقہی مسلک لازماً میرے فقہی مسلک کے مطابق یا اس کے تابع ہو۔ وہ اگر فرقہ بندی کے تعصّبات سے پاک رہیں اور حق کو اپنے ہی گروہ میں محدود نہ سمجھیں تو وہ اس جماعت میں رہتے ہوئے اپنے اطمینان کی حد تک حنفی، شافعی، اہل حدیث یا دوسرے فقہی مسلک پر عمل کرنے میں آزاد ہیں۔

سوال: تقلید ائمۂ اربعہ کو گروہِ ''اہل حدیث'' حرام وشرک بتاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا مقلدین اہل حدیث نہیں ہیں؟ تقلید اصل میں کیا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے؟

جواب: اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کی نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے اور عمل کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان کی بنا پر ہے۔ ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

ائمہ کی پیروی کی حقیقت صرف یہ ہے کہ ان ائمہ نے اللہ اور رسولؐ کے احکام کی چھان بین کی، آیات قرآنی اور سنت رسول سے معلوم کیا کہ مسلمان کو عبادات اور معاملات میں کس طریقے پر چلنا چاہیے، اور اُصولِ شریعت سے جزئی احکام کا استنباط کیا۔ لہٰذا وہ بجائے خود آمر ومناہی نہیں ہیں، نہ بذات خود مطاع اور متبوع ہیں، بلکہ علم نہ رکھنے والے کے لیے علم کا ایک معتبر ذریعہ ہیں۔ جو

شخص خود احکام الٰہی اور سنت نبوی میں نظر بالغ نہ رکھتا ہو اور خود اُصول سے فروع کا استنباط کرنے کا اہل نہ ہو، اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ علما اور ائمہ میں سے جس پر بھی اسے اعتماد ہو، اس کے بتائے ہوئے طریقے کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص اِس حقیقت سے ان کی پیروی کرتا ہے تو اس پر کسی اعتراض کی گنجایش نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کو بطور خود آمر و ناہی سمجھے یا ان کی اطاعت اس انداز سے کرے جو اصل آمر و ناہی کی اطاعت ہی میں اختیار کیا جاسکتا ہے، یعنی ائمہ میں سے کسی کے مقرر کردہ طریقے سے ہٹنے کو اصل دین سے ہٹ جانے کا ہم معنی سمجھے اور اگر کسی ثابت شدہ حدیث یا صریح آیت قرآنی کے خلاف ان کا کوئی مسئلہ پایا جائے، تب بھی وہ اپنے امام ہی کی پیروی پر اصرار کرے، تو یہ بلاشبہ شرک ہوگا۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

وہابی اور وہابیت:

سوال: فرقۂ وہابیہ کا بانی کون تھا؟ اس کے مخصوص عقائد کیا تھے؟ ہندوستان میں اس کی تعلیمات کس طرح شائع ہوئیں؟ کیا علمائے اسلام نے اس کی تردید نہیں کی؟ اگر کی ہے تو کس طریقے پر؟ آیا اس فرقے نے اشاعت اسلام میں حصہ لیا ہے یا مخالفت اسلام میں؟

جواب: وہابی دراصل کسی فرقے کا نام نہیں ہے۔ محض طنز اور طعن کے طور پر ان لوگوں کے لیے ایک نام رکھ دیا گیا ہے، جو یا تو اہل حدیث ہیں یا محمد ابن عبدالوہاب کے پیرو ہیں۔ اہل حدیث کا مسلک تو قدیم ہے۔ ائمۂ اربعہ کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ اور یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو کسی امام کی تقلید اختیار کرنے کے بجائے خود حدیث و قرآن سے احکام کی تحقیق کرتے ہیں۔ رہے محمد بن عبدالوہاب کے پیرو، تو وہ دراصل حنبلی طریقے کے لوگ ہیں۔ ان کی فقہ اور ان کے عقائد وہی ہیں جو امام احمد بن حنبلؒ کے تھے۔ ہندوستان میں یہ مؤخر الذکر گروہ غالباً کہیں موجود نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہاں وہابی کہا جاتا ہے وہ دراصل پہلے گروہ کے لوگ ہیں۔ ان لوگوں نے اوّل اوّل نہایت اچھا کام کیا اور اب بھی ان میں اچھے افراد پائے جاتے ہیں۔ مگر ان میں بہت سے جاہل اور جھگڑالو آدمی بھی شامل ہوگئے ہیں جو خواہ مخواہ چھوٹے چھوٹے معاملات پر بحث و مناظرے کا بازار گرم کرتے پھرتے ہیں۔ اور ایسے ہی جاہل خود حنفی کہلانے والے گروہ میں بھی بکثرت موجود

ہیں۔ یہ ساری مناظرہ ومباحثہ اور فرقہ بازی کی گرمیِ بازار انہی دونوں فریقوں کی برکت ہے۔

سوال: کیا کسی حدیث میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نجد سے ایک فتنہ اُٹھے گا؟ کیا یہ حدیث مذکورہ بالا فرقے پر منطبق ہوتی ہے؟

جواب: نجد یا مشرق کی طرف سے ایک فتنہ اُٹھنے کی خبر تو حدیث میں دی گئی ہے مگر اس کو محمد ابن عبدالوہاب پر چسپاں کرنا محض گروہ بندی کے اندھے جوش کا نتیجہ ہے۔ ایک فریق جب دوسرے فریق سے لڑنا چاہتا ہے تو ہر ہتھیار اس کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے، حتیٰ کہ خدا اور رسولؐ کو بھی ایک فریق جنگ بنانے میں دریغ نہیں کرتا۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

مذہب حنفی اور حدیث:

سوال: بعض اعمال میں اقوال حضرت امام اعظم بظاہر احادیث صحیحہ کے خلاف پائے جاتے ہیں، جیسے فاتحہ خلف الامام، رفع یدین، آمین بالجہر، شرط مصر فی صلوٰۃ الجمعہ وغیرہ تو کیا امام موصوف کے اقوال قرآن و حدیث سے مستنبط ہیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ احادیث کون سی ہیں؟ کیا وہ عندالمحدثین صحیح ہیں؟

جواب: امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک کے مذہب میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جن پر اہل حدیث کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ حدیث کے خلاف ہیں اور ان ائمہ کے پیروؤں کی طرف سے ان اعتراضات کے جواب بھی دیے گئے ہیں۔ جو شخص خود علم رکھتا ہو اور جس میں خود اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو وہ فریقین کے درمیان محاکمہ کرسکتا ہے اور اسے حق ہے کہ حدیث سے جس طریقے کو ثابت پائے اسے اختیار کرے اور جسے ثابت نہ پائے اسے چھوڑ دے۔ لیکن یہ عام اہل حدیث جو ان مسائل پر بحث کرتے پھرتے ہیں، ان کا حال عام حنفیوں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ ان کا علم بھی ویسا ہی تقلیدی ہے جیسا حنفیوں کا ہے۔ یہ اپنے ائمہ وعلما پر اعتماد کرتے ہیں، اور حنفی اپنے ائمہ وعلما پر۔ ان میں خود اجتہادی قابلیت نہیں، نہ یہ احادیث کا اتنا علم اور اُصول میں اتنی بصیرت رکھتے ہیں کہ احکام کی تحقیق کرسکیں۔ ان کا یہ کہنا کہ فاتحہ خلف الامام یا رفع یدین یا آمین بالجہر حدیث سے ثابت ہے اور اس کا خلاف ثابت نہیں ہے، دراصل تقلید کی بنیاد پر

ہے نہ کہ اجتہاد کی بنیاد پر۔ لہٰذا ان کے جواب میں خاموشی بہتر ہے۔ البتہ جو علم رکھتے ہیں، وہ ان مسائل پر بول سکتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے بارے میں جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے، اس کی رُو سے زیادہ صحیح مسلک یہ ہے کہ جب امام بآواز بلند پڑھ رہا ہو تو مقتدی خاموش رہیں اور جب امام آہستہ پڑھ رہا ہو تو مقتدی بھی فاتحہ پڑھیں۔ اس طرح کسی حکم قرآنی اور کسی حدیث کی خلاف ورزی کا اندیشہ نہیں رہتا اور تمام مختلف دلائل دیکھ کر یہ ایک متوسط طریقہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ لیکن جو شخص امام کے پیچھے کسی صورت میں بھی فاتحہ نہیں پڑھتا یا ہر حال میں پڑھتا ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی نماز نہیں ہوتی۔ کیوں کہ دونوں مسلکوں کی تائید میں دلائل موجود ہیں اور وہ شخص جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے، بلکہ جو حکم اس کے نزدیک دلیل سے ثابت ہے اسی پر عمل کر رہا ہے۔ لہٰذا اس پر وہ الزام نہیں رکھا جا سکتا ہے جو حکم شرعی کی بالقصد مخالفت کرنے والے پر رکھا جاتا ہے۔

رہا ''رفع یدین'' اور ''آمین بالجہر'' تو ان کے فعل اور ترک دونوں کی تائید میں دلائل مجھ کو تقریباً مساوی الوزن نظر آتے ہیں۔ اس لیے جو ان افعال کو کرتا ہے وہ بھی حدیث کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہے، اور جو انہیں ترک کرتا ہے اسے بھی مخالفت حدیث کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ صاحب شریعت علیہ السلام نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے عمل کیا ہے، اور اسی طرح صحابہ کرام نے بھی۔ اب ایک شخص جس طریقے کی بھی پیروی کرتا ہے وہ صاحب شریعت ہی کا مطیع ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیریت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے، یا اسے اپنے ہی پسندیدہ طریقے کی طرف تشدّد سے کھینچا جائے۔ ہاتھ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا، اور آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک کا التزام اور دوسرے کے ترک کا اہتمام کیا جائے۔

نماز جمعہ میں شرطِ مصر کے متعلق مجھے علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے، میری تحقیق یہ ہے کہ بعد کے لوگوں نے خود امام ابوحنیفہ ہی کے استدلال واستنباط کو اِس معاملے میں نہیں سمجھا۔ امام صاحب کا مدعا صرف یہ تھا کہ اقامت جمعہ ایسی آبادیوں میں ہو جو اپنے علاقے کے اندر مرکزی حیثیت رکھتی ہوں۔ اور یہ حدیث کے عین مطابق ہے۔ لیکن بعد کے لوگوں نے مصر کا مدلول متعین کرنے میں کھینچ تان کی اور متعدد ایسی شرطیں بڑھا دیں جن کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس مسئلے پر

مفصل بحث ترجمان القرآن میں کی جا چکی ہے[1]۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

حدیث کی تدوینِ جدید:

سوال: قرآن کے بعد احادیث نبویہ کو دینی حجت ماننے یا نہ ماننے میں ہمارے اہل فکر ونظر افراط وتفریط میں مبتلا ہیں۔ میرے خیال میں تفریط تو یہ ہے کہ ذخیرہ حدیث کو تاریخی روایات کی حیثیت دی جائے اور افراط یہ ہے کہ احادیث صحاح ستہ میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے جو کچھ بھی لکھا گیا ہو، اسے کلیتًا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی حدیث سمجھ لیا جائے اور اس پر دین واعتقاد کی عمارت کھڑی کر لی جائے۔ میں اپنی معلومات کی کمی اور فکر ونظر کی کوتاہی کی وجہ سے اس بارے میں کوئی نقطۂ اعتدال نہیں پا سکا، براہ کرم آپ ہی رہنمائی فرمائیے اور ان شبہات کو صاف کر دیجیے۔

کیا احادیث کی تحقیق وتنقیح اور راویوں کے حالات کی تفتیش کا کام اگلے محققین پر ختم ہو گیا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس دعوے کی دلیل کیا ہے؟ اور پھر اس کے کیا معنی کہ صحیح بخاری تک میں ایسی حدیثیں موجود ہیں جو نقل صحیح اور عقل سلیم کی روشنی میں محل اعتراض ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تین مرتبہ جھوٹ بولنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ملک الموت کی آنکھ پر گھونسا مارنا وغیرہ روایات کو ملاحظہ کر لیجیے۔

نیز اگر جواب نفی میں ہو تو بتلائیے کیا وجہ ہے کہ اب تک صحیح اور غلط احادیث کو چھانٹ دینے کا فریضہ متاخرین علمائے اسلام نے انجام نہیں دیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مشتبہ روایات پر وارد ہونے والے اعتراضات تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

جواب: میں اپنے مضامین میں متعدد مقامات پر اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ احادیث کی تنقید وتحقیق وترتیب کا کام جو کچھ ابتدائی چار صدیوں میں ہوا ہے، وہ اگرچہ نہایت قابل قدر ہے مگر کافی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ اس سلسلے میں کرنا باقی ہے۔ رہی یہ بات کہ علما نے پھر یہ کام کیوں نہیں کیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن علما نے چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کو حرام قرار دیا ہو، ان

---

[1] ملاحظہ ہو ''تفہیمات حصہ دوم'' از مصنف۔

کے متعلق یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ انہوں نے حدیث کی چھانٹ پرکھ کا کام کیوں نہیں کیا۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

کیا ایک فقہی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا گناہ ہے؟

سوال: ہمارے اس زمانے میں مذہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی پہلے سے زیادہ لازمی ہوگئی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کوئی صاحب علم وفضل چار معروف مذاہب فقہ کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنے یا اجتہاد کرنے کا حق دار ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس دلیل سے؟ اور اگر جائز ہے تو پھر طحطاوی میں ایک بڑے صاحب کمال فقیہ کے اس قول کا کیا مطلب ہے؟

المنتقل من مذهب الٰی مذهب باجتهاد وبرهان اثم يستوجب التعزير۔

جواب: میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لیے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید چیز ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بِنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اُصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز۔ اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔ رہا طحطاوی کا وہ فتویٰ جو آپ نے نقل کیا ہے، تو وہ خواہ کتنے ہی بڑے عالم کا لکھا ہوا ہو، میں اس کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک ایک مذہب فقہی سے دوسرے مذہب فقہی میں انتقال صرف اس صورت میں گناہ ہے جب کہ یہ فعل خواہش نفس کی بِنا پر ہو نہ کہ تحقیق کی بِنا پر۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

کس قسم کا اجماع حجت ہے؟

سوال: ایسا اجماع جو کسی صحیح حدیث پر مؤسس ہو، واقعی شرعی حجت ہے اور ایسے اجماع کا منکر یقیناً کافر ہے۔ لیکن ایسا اجماع جو علما نے کسی ایسے مقصد پر کرلیا ہو جو مخبر صادق کے لفظوں سے صراحتاً ثابت نہ ہو یا کسی ایسی حقیقت سے تعلق رکھتا ہو جس کی تصریح شارع علیہ السلام نے نہ کی ہو اور اسے مصلحتاً مجمل ہی رہنے دیا ہو، کیا یہ بھی شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا منکر کافر ہے؟

جواب: اجماع کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ یہاں اس کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنا مشکل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ اجماع سے مراد اُمت کا متفقہ فیصلہ ہے، اور یہ متفقہ فیصلہ لامحالہ دو ہی قسم کے اُمور سے متعلق ہوسکتا ہے۔ ایک قسم کے اُمور وہ جو احکام شرعی میں سے ہوں۔ دوسری قسم کے اُمور

وہ جو دنیوی تدابیر کے قبیل سے ہوں۔ پہلی قسم کے اُمور میں سے کسی امر میں اگر اُمت متفق ہو کر کسی حکم مخصوص کی تشریح کرے اور وہ تشریح کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کو پیش نظر رکھ کر نہ کی گئی ہو، بلکہ اُصولاً شارع کا منشا یا سنت کا طریقہ بالاتفاق متعین کیا گیا ہو، تو ایسا اجماع یقیناً حجت ہے اور ہمیشہ کے لیے حجت ہے۔ اور اگر کسی مصلحت وقتی کو ملحوظ رکھ کر کسی حکم کی تشریح کی گئی ہو تو ایسے اجماع کی پابندی اس وقت تک اُمت پر لازمی ہوگی جس وقت تک وہ مصلحت باقی ہے۔ حالات بدل جانے کے بعد اس کی پابندی لازم نہیں رہے گی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی اجماع کسی حکم شرعی کی تشریح کے متعلق نہ ہو، بلکہ کسی تدبیر دنیوی کے متعلق اُمت نے متفق ہو کر طے کر لیا ہو کہ اس طرح عمل کیا جائے گا، تو اگر اُصول شریعت میں اس طرزِ عمل کے لیے کوئی گنجایش موجود ہو تو ایسا اجماع واجب العمل ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔ نیز یہ کہ ایسا اجماع کبھی دائمی اور ابدی وجوب کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ عین ممکن ہے کہ ایک زمانے کے مسلمان یا ایک ملک یا ایک قوم کے مسلمان کسی تدبیر یا کسی کام پر اتفاق کریں اور دوسرے زمانے میں اسی قوم یا اسی ملک کے لوگ کسی اور امر پر اتفاق کر لیں۔ یہ ملکی اور قومی اور زمانی اجماع صرف ایک خاص زمانے اور خاص ملک یا قوم کے مسلمانوں ہی کے لیے واجب العمل ہو سکتے ہیں۔ بعد کے زمانے والوں یا دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو اگر اِس میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس ہو تو یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ چوں کہ پہلے فلاں خاص امر پر اجماع ہو چکا ہے یا فلاں ملک میں اس پر اتفاق ہو چکا ہے اس لیے اب اس کے بارے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

فرقہ بندی کے معنی:

سوال آپ اپنی جماعت کے لوگوں کو سختی کے ساتھ فرقہ بندی سے منع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں میرا سوال یہ ہے کہ آخر صوم و صلوٰۃ و حج وغیرہ ارکان کو کسی نہ کسی مسلک کے مطابق ہی ادا کرنا ہوگا۔ تو پھر بتائیے کہ کوئی مسلمان فرقہ بندی سے کیسے بچ سکتا ہے؟ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ بموجب آپ کی رائے کے کہ قرآن و حدیث کے موافق جو مسئلہ ملے اس پر عمل کیا جائے، بجز اہل حدیث کے کسی فرقے کے ہاں جملہ جزئیات میں قرآن و حدیث سے مطابقت نہیں پائی جاتی۔ پس میں نے فی الجملہ مسلک اہل حدیث کو اپنے لیے پسند کیا ہے، پھر کیا میں بھی فرقہ بندی کے الزام کا مورد ٹھہروں گا؟

جواب: فقہ میں اپنی تحقیق یا کسی عالم کی تحقیق کی پیروی کرتے ہوئے کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا جس کے لیے شریعت میں گنجایش موجود ہو، فرقہ بندی نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی قباحت واقع ہوسکتی ہے۔ اِس طریقے سے مختلف لوگوں کی تحقیقات اور ان کے طرزِ عمل میں جو اختلاف واقع ہوتا ہے وہ وہ مذموم تفرق واختلاف نہیں ہے جس کی برائی قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ایسے اختلافات خود صحابۂ کرام اور تابعین میں رہ چکے ہیں۔ دراصل فرقہ بندی جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ فروع کے اختلافات کو اہمیت دے کر اُصولی اختلاف بنا دیا جائے اور اس میں اتنا غلو کیا جائے کہ اسی پر الگ گروہ بنیں اور ہر گروہ اپنے مسلک کو بمنزلۂ دین قرار دے کر دوسرے گروہوں کی تکفیر و تضلیل کرنے لگے، اپنی نمازیں اور مسجدیں الگ کرے، شادی بیاہ اور معاشرتی تعلقات میں بھی علیحدگی اختیار کرے، اور دوسرے گروہوں کے ساتھ اس کے سارے جھگڑے انہی فروعی مسائل پر ہوں، حتیٰ کہ اصل دین کے کام میں بھی دوسرے گروہوں کے ساتھ اس کا تعاون ناممکن ہوجائے۔ اس قسم کی فرقہ بندی اگر پیدا نہ ہو اور فروع کو صرف فروع کی حیثیت ہی میں رہنے دیا جائے تو مسائل فقہیہ میں مختلف مسلکوں کے لوگ اپنے اپنے طریقے پر عمل کرتے ہوئے بھی ایک ساتھ اسلامی نظام جماعت میں منسلک رہ سکتے ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ، نومبر، دسمبر ۴۴ء)

فقہی اختلافات کی بِنا پر نمازوں کی علیحدگی:

سوال: فقہی اختلافات کی بِنا پر بعض صورتوں میں حنفی، اہل حدیث اور شافعی حضرات علیحدہ علیحدہ نماز پڑھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ مثلاً ایک گروہ اوّل وقت نماز پڑھنے کو ترجیح دیتا ہے اور دوسرا تاخیر کو افضل سمجھتا ہے۔ اب ان سب کا مل کر ایک جماعت میں نماز پڑھنا کسی نہ کسی کو افضل نماز سے محروم ہی کرے گا۔ اگر ''افضل نماز'' کی کوئی اہمیت ہے تو پھر آپ کیوں اس ''ایک ہی جماعت'' کے اُصول پر اتنا زور دیتے ہیں؟

جواب: آپ کے نزدیک اگر کسی وقت پر نماز پڑھنا افضل اور اولیٰ ہو اور دوسرے مسلمانوں کے نزدیک کسی دوسرے وقت میں پڑھنا افضل ہو تو اس اختلاف کی بِنا پر جماعت سے الگ ہوکر نماز پڑھنا یا اپنے ہم خیالوں کی جماعت الگ قائم کرنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ افضل وقت کو

چھوڑنے کی برائی سے جماعت کوترک کرنے اور جماعتیں الگ کر لینے کی برائی زیادہ ہے۔

سوال: ایک صاحب نے ہمارے ایک سوال کے جواب میں آپ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ غیر صالح العقیدہ لوگوں کے پیچھے بھی عام مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھ لینی چاہیے اور تفرقے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ نے ایک خط میں ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ جس شخص کے متعلق مشرکانہ عقائد رکھنا بالکل متحقق ہو جائے اس کے پیچھے تو نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے، مگر جس شخص کے عقائد کی حقیقت معلوم نہ ہو اس کی امامت میں نماز پڑھنا چاہیے۔ ان دونوں جوابات میں جو فرق ہے اس کی وجہ سے یہاں بہت پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ ذرا وضاحت کے ساتھ صحیح مسلک کی نشان دہی فرمائیے۔

جواب: آپ کو جو جواب یہاں سے دیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی صریح مشرکانہ فعل یا قول یا عقیدہ جس کے لیے تاویل کی قطعاً گنجایش نہ ہو اور جس کے ماننے والے یا کرنے والے کے لیے یہ فیصلہ کیے بغیر چارہ نہ ہو کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، ایسے قول یا فعل کے مرتکب کے پیچھے نماز نہ پڑھنی چاہیے۔ لیکن عام طور پر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان بحثوں اور مناظروں اور نزاعوں نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ ہر گروہ دوسرے کو گمراہ ٹھہرانے اور اس سے دُور بھاگنے کے لیے دلیلیں ڈھونڈتا ہے اور بات بات پر فرقے بنتے ہیں، مسجدیں الگ ہوتی ہیں اور شادی بیاہ کے تعلقات منقطع ہوتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جو لوگ سب کی اصلاح کے لیے اُٹھے ہوں، ان کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ سب مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور ان میں جو اخلاقی اور اعتقادی خرابیاں پائیں، ان کو ہم دردی اور محبت کے ساتھ دُور کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ نمازیں الگ کر لینے کا فائدہ بجز اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ ہم بھی ایک فرقہ بن کر رہ جائیں گے اور ہمارے اور عام مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی، جسے عبور کرنا محال ہو جائے گا۔

رہا یہ فاندیشہ کہ جس شخص کو آپ اپنے نزدیک گمراہی اور شرک میں مبتلا پاتے ہیں اس کی نماز چوں کہ آپ کے عقیدے کے مطابق مقبول نہیں ہے اس لیے اگر آپ اس کے پیچھے نماز پڑھیں گے تو آپ کی نماز نہ ہوگی، تو یہ اصلاً غلط ہے۔ اوّل تو آپ یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہی نہیں ہیں کہ

کس کی نماز مقبول ہوگی اور کس کی نہ ہوگی۔ ایسے فیصلے کرنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی دعا کریں اور دوسروں کی نماز کی مقبولیت کے لیے بھی۔ دوسرے یہ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ پوری جماعت کی نماز امام کی نماز کے ماتحت ایک مجموعے کی شکل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوتی ہو، اور اگر امام کی نماز مقبول نہ ہو تو سارے مقتدیوں کی نماز بھی غیر مقبول ہو جائے۔ جماعت کی پابندی تو مسلمانوں کو ایک اُمت بنانے کے لیے ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کی نماز انفرادی حیثیت ہی سے خدا کے حضور پیش ہوتی ہے، اور اگر وہ مقبول ہونے کے قابل ہو تو بہر حال مقبول ہو کر رہتی ہے، خواہ امام کی نماز مقبول ہو یا نہ ہو۔

سوال: میرا تعلق جس فرقے سے تھا، اس کے بعض سنجیدہ علما یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آپ فقہی مسلک میں جماعت اسلامی کے ارکان کو آزادی دیتے ہیں اور واقعتاً جزوی معاملات میں مختلف گروہ متحد الخیال ہیں بھی نہیں، تو پھر آپ نماز کی جماعت میں سب کی شرکت کو لازمی کیوں قرار دیتے ہیں؟ خود نماز سے متعلقہ مسائل میں بہت اختلافات ہیں اور ان کی بنا پر لوگ اپنی نمازیں الگ پڑھنا چاہتے ہیں!

جواب: فقہی اختلافات کی بنا پر نمازوں کو الگ کرنے کا کوئی ثبوت سلف میں نہیں ہے۔ یہ فقہی اختلافات صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی تھے اور تابعین کے درمیان بھی اور تبع تابعین کے درمیان بھی۔ لیکن یہ سب لوگ ایک ہی جماعت میں نماز پڑھتے تھے۔ یہی طریقہ ائمۂ مجتہدین کا بھی رہا۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ نماز دین کی بنیادوں میں سے ہے اور فقہی اختلافات بہر حال فروعی ہیں۔ ان فروعی اختلافات کی بنا پر نمازیں الگ کرنا تفرق فی الدین ہے، جس کو قرآن نے گمراہی قرار دیا ہے۔ نمازیں الگ کر لینے کے بعد مسلمانوں کی ایک اُمت نہیں رہ سکتی اور اس کا امکان نہیں ہے کہ جو لوگ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے، وہ دین کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کی سعی میں متحد ہو کر کام کر سکیں گے۔ یہ چیز اب نظری نہیں رہی ہے بلکہ صدیوں کے عملی تجربے نے اسے ثابت کر دیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اپنی فرقی اختلافات کی وجہ سے نمازوں کی علیحدگی پر اصرار کرتے ہیں، وہ دراصل دین کی جڑ پر ضرب لگاتے ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ، نومبر، دسمبر ۴۴ء)

اختلافی مسائل پر اُمت سازی کا فتنہ:

سوال: مجھے مذہبی تنازع اور تفرقے سے فطری بُعد ہے اور وہ تمام جزوی مسائل جن میں اختلاف کی گنجایش خود شریعت میں موجود ہے، ان میں اختلاف کو جائز رکھتا ہوں۔ اسی طرح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملے میں دو یا تین طریقہ ہائے عمل ثابت ہوں تو ان سب کو جائز اور سنت کی حد کے اندر شمار کرتا ہوں۔ مثلاً نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ میں ان دونوں صورتوں پر عمل کر لیتا ہوں، کبھی اس پر اور کبھی اس پر۔ مجھے اپنے اس مسلک پر پورا پورا اطمینان ہے اور میں نے سوچ سمجھ کر اُسے اختیار کیا ہے۔ مگر میرے والد مکرم، جو جماعت اسلامی کے رکن بھی ہیں، محض نماز میں رفع یدین کا التزام چھوڑ دینے کی وجہ سے انہوں نے مجھے یہ نوٹس دے دیا ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر ہمارے تمہارے درمیان سلام کلام کا تعلق برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب یہ قضیہ میرے اور والد مکرم کے حلقۂ تعارف میں بحث کا موضوع بن گیا ہے اور دونوں کی تائید وتردید میں لوگ زورِ استدلال صرف کر رہے ہیں۔

مجھ پر جو بے سروپا اعتراضات عموماً ہو رہے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے: تو حنفی ہو گیا ہے۔ تیرا دو طریقوں پر عمل کرنا دو عملی اور نفاق ہے۔ تم جماعت کی اکثریت سے مرعوب ہو گئے ہو۔ تمہارا اصل مقصود جلبِ زر اور حصولِ عزت ہے، تمہیں احناف نے یہ پٹی پڑھائی ہے۔ تو مودودی صاحب کا مقلد ہے وغیرہ۔

ان اعتراضات میں ایک دل چسپی ترین اعتراض یہ ہے کہ ہمیں پہلے ہی مودودی صاحب سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے نام پر اہل حدیث کو حنفی بنا کے رہیں گے۔ چنانچہ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ یعنی پہلے تو اس جماعت میں آنے والے سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا فقہی مسلک جماعت میں آنے کے بعد بھی برقرار رہے گا، مگر جماعت میں آنے کے بعد ایسے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو خود کوئی احساس تک نہیں ہوتا اور اس کا مسلک سراسر بدل جاتا ہے۔

میں حسب موقع ان سب اعتراضات کے جواب دیتا رہا ہوں لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے امور ذیل کی وضاحت چاہتا ہوں:

۱۔ والدین کے حقوق کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ کیا وہ اولاد سے مسائل کی تحقیق کا اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنے کا حق بھی سلب کر سکتے ہیں؟ کیا میں والدین کی مرضی کے خلاف مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی (یعنی ترک رفع یدین) کرنے پر سخط الرب فی سخط الولدین کی وعید کا مستوجب ہو جاؤں گا؟

۲۔ ازروئے شریعت نماز میں رفع یدین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ترک رفع سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؟

۳۔ کیا جماعت اسلامی کا ایک رکن دوسرے رکن سے اس بنا پر مقاطعہ کر سکتا ہے کہ اس نے مزعومہ مسلکِ اہل حدیث کی خلاف ورزی کی ہے؟

جواب: جس نزاع کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کا حال پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ مجھ کو اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ جماعت اسلامی میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو فقہی مسائل میں تعصب اور تشدد کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہوں گے۔ اگر آپ جیسا قابل اعتماد آدمی ان حالات کا راوی نہ ہوتا اور ایک دوسری اطلاع سے آپ کے بیان کی تائید نہ کی گئی ہوتی تو شاید میں اس بات کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ واقعی ہماری جماعت میں ایسی صورت حال پیدا ہوئی ہو گی۔ بہرحال اب جب کہ اس نزاع نے سر اُٹھا ہی لیا ہے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کی اُصولی اور فقہی اور جماعتی حیثیت کو صاف صاف واضح کر دوں۔

۱۔ اُصولی حیثیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شرعی مسائل میں کسی شخص یا یا گروہ کا کسی خاص طریق تحقیق و استنباط یا کسی مخصوص مذہب فقہی کی پیروی کرنا اور چیز ہے اور اس کا اپنے خاص طریقے یا مذہب کے لیے متعصب ہونا اور اس کی بنا پر جتھا بندی کرنا اور اس سے مختلف مذہب رکھنے والوں سے مغایرت و منافرت برتنا اور اس کی پابندی ترک کرنے والوں کو اس طرح ملامت کرنا کہ گویا ان کے دین میں کوئی نقص آ گیا ہے، بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز کے لیے تو شریعت میں پوری گنجایش ہے، بلکہ خود صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور دین میں اس سے کوئی خرابی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز بعینہٖ وہ تفرق فی الدین ہے جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے، اور اس تفرق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگ فقہی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں، پھر ان مسائل میں ذرا ذرا سے اختلاف پر ان کے

درمیان الگ الگ اُمتیں بنتی ہیں، پھران فروعی بحثوں میں وہ اس قدر اُلجھتے اورایک دوسرے سے بے گانہ ہوجاتے ہیں کہ ان کے لیے امت مسلمہ کی زندگی کے اصل مقصد (یعنی اعلائے کلمۃ اللہ) اوراقامت دین کی خاطرمل کرجدوجہد کرنا غیرممکن ہوجاتا ہے۔

مسلکِ فقہی کے اعتبار سے کسی کا طریق اہل حدیث یاطریق حنفی یاطریق شافعی وغیرہ پر چلنا بجائے خودکسی قباحت کا موجب نہیں ہے۔لیکن اگر یہ چیز آگے بڑھ کر یہ صورت اختیار کرلے کہ مسلمان فی الحقیقت ایک اُمت نہ رہیں، بلکہ اہل حدیث، احناف، شوافع وغیرہ ناموں کے ساتھ الگ الگ مستقل اُمتیں بن جائیں، اورشرعی اعمال کی جوخاص صورتیں ان مختلف گروہوں نے اختیارکی ہیں، وہ ہرایک گروہ کے مخصوص شعائرقرار پاجائیں جن کی بِنا پران گروہوں میں مغائرت اورامتیاز واقع ہو،تو پھر یقیناً یہ دین کوٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے،اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دین اسلام میں اس تقسیم اورتعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔رفع یدین کرنا یا نہ کرنا،آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا، اورایسے ہی دوسرے اُمورصرف اسی وقت تک شرعی اعمال ہیں جب تک کوئی شخص ان کے ترک یافعل کواس بِنا پراختیارکرے کہ اس کی تحقیق میں صاحب شریعت سے ایسا ہی ثابت ہے یا یہ کہ ایسا کرنا دلائل شرعیہ کی بِنا پرارجح اوراَولیٰ ہے۔مگرجب یہی اعمال کسی مخصوص فرقے کے شعاربن جائیں اوران کا ترک یافعل وہ علامت قرار پائے جس کی بِنا پر یہ فیصلہ کیا جانے لگے کہ آپ کس فرقے میں داخل اورکس سے خارج ہیں اور پھرانہی علامتوں کے لحاظ سے یہ طے ہونے لگے کہ کون اپنا ہےاورکون غیر،تو اس صورت میں رفع یدین کرنا اورنہ کرنا، یا آمین زور سے کہنا، یا آہستہ کہنا یا ایسے ہی دوسرے اُمور کا ترک اورفعل دونوں یکساں بدعت ہیں۔اس لیے کہ سنت رسول اللہ میں بجائے خودتوان اعمال کا ثبوت ملتا ہے،لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ ان اعمال کومسلمانوں کے اندرگروہ بندیوں اورفرقہ سازیوں کے لیے علامات اورشعائر بنایا جائے۔ایسا کرنا دراصل حدیث کا نام لے کرصاحب حدیث علیہ السلام کے منشا کے بالکل برعکس کام کرنا ہے اوراس اصل کام کو غارت کرنا ہے جس کے لیے نبیؐ دنیا میں تشریف لائے تھے۔

۲۔ اب اس مسئلے کی فقہی حیثیت کو لیجیے۔رفع یدین کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ مختلف طرزِعمل منقول ہیں:

ا۔ ابن عمرؓ کی روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور تین مواقع پر رفع یدین کرتے تھے۔ افتتاح صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اُٹھ کر۔

ب۔ مالک بن حویرث کی روایت جس میں دو موقعوں پر رفع یدین کا ذکر ملتا ہے۔ افتتاح صلوٰۃ کے وقت اور رکوع سے اُٹھ کر۔

ج۔ وائل بن حُجر کی روایت، جس میں چار مواقع پر اس کا ہونا مذکور ہے۔ افتتاح صلوٰۃ کے وقت۔ رکوع میں جاتے ہوئے۔ رکوع سے اُٹھتے ہوئے۔ سجدے کے موقع پر۔

د۔ ابوحمید ساعدی کی روایت۔ اس میں بھی چار موقع پر رفع یدین کا ذکر ہے، مگر چوتھا موقع سجدے کے بجائے تیسری رکعت میں قعدے سے اُٹھنے پر بیان کیا گیا ہے۔

ر۔ عبداللہ ابن مسعود اور براء ابن عازب کی روایت جس میں صرف ایک مرتبہ رفع یدین کرنے کا ذکر ہے، یعنی افتتاح صلوٰۃ کے موقع پر۔

ان مختلف روایات میں سے (ا) کو امام شافعیؒ، احمد اور ابوثور نے، نیز اہل الحدیث اور اہل الظاہر کی اکثریت نے اختیار کیا اور ایک روایت امام مالک سے بھی یہی ہے کہ وہ اس کو ترجیح دیتے تھے۔ (د) کو اہل الحدیث کے ایک گروہ نے مرجح ٹھہرایا۔ اور (ر) کو ابراہیم نخعی، شعبی، سفیان ثوری، ابوحنیفہ اور تمام فقہائے کوفہ نے ترجیح دی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سوال صرف ترجیح کا ہے نہ کہ رد وقبول کا۔ ائمۂ سلف میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جن مختلف طریقوں کا ذکر مذکورہ بالا احادیث میں آیا ہے، ان میں سے کسی پر حضورؐ نے عمل نہیں کیا تھا۔ بلکہ کہتے صرف یہ ہیں کہ جس خاص طریقے کو ہم نے مرجح قرار دیا ہے، وہ حضورؐ کا عام معمول تھا اور دوسرے طریقوں پر آپؐ کبھی کبھی عمل کر لیتے تھے۔ پس جب معاملے کی حقیقت یہ ہے تو ان طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے، حدیث ہی کی پیروی کر رہا ہے اور اس پر نکیر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اتباعِ پیغمبر پر نکیر کی جاتی ہے، جس کی جرأت مقلدین کو بھی زیبا نہیں، کجا کہ اہل حدیث اس کا ارتکاب کریں۔ پھر اگر کوئی شخص ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر جامد ہونے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان سب طریقوں پر عمل کرتا رہے جو حدیث میں مذکور ہیں تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحیح ومکمل پیروی ہوگی اور لفظ عمل بالحدیث کا اطلاق اس طرز عمل پر زیادہ صحیح معنی میں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتدا ہی میں ایک طریقے کو ترجیح دینے اور باقی سب طریقوں کو ترک کر دینے کے بجائے ان سب

طریقوں کو نماز میں اختیار کرنے کی گنجایش رکھی جاتی تو شاید بعد کے ادوار میں وہ جمود و تعصب پیدا ہی نہ ہوتا جس کی بدولت نوبت یہ آ گئی ہے کہ لوگ نماز کی جس صورت کے عادی ہیں، اس سے ذرا سی بھی مختلف صورت جہاں انہوں نے دیکھی، اور بس وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس شخص کا دین بدل گیا ہے اور یہ ہماری اُمت سے نکل کر دوسری اُمت میں جا ملا ہے۔

یہ رائے جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ صرف میری انفرادی رائے ہی نہیں ہے بلکہ پہلے بھی متعدد اہل تحقیق اسی خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس وقت میرے پاس سفر[1] میں کتابیں موجود نہیں ہیں اس لیے میں زیادہ وسیع پیمانے پر شواہد پیش نہیں کر سکتا، لیکن حجۃ اللہ البالغہ خوش قسمتی سے مل گئی ہے، اس سے چند حوالے یہاں نقل کرتا ہوں۔ شاہ صاحب پہلے تو یہ اُصولی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ:

الاصل ان یعمل بکل حدیث الا ان یمتنع العمل بالجمیع للتناقض۔

(باب القضاء فی الاحادیث المختلفة)

''اُصولی بات یہ ہے کہ آدمی ہر حدیث پر عمل کرے، الا یہ کہ کسی مسئلے میں سب حدیثوں پر عمل کرنا تناقض کی وجہ سے غیر ممکن ہو۔''

پھر آگے چل کر فصل فی عدة اُمور مشکله من التقلید واختلاف المذاهب میں فرماتے ہیں:

ان اکثر صور الاختلاف بین الفقهاء لاسیما فی المسائل التی ظهر فیها اقوال الصحابة فی الجانبین کتکبیرات التشریق وتکبیرات العیدین ونکاح المحرم وتشهد ابن عباس و ابن مسعود والاخفاء بالبسملة وبٰامین والاشفاع والایتار فی الاقامة ونحو ذٰلك، انما هو فی ترجیح احد القولین وکان السلف لا یختلفون فی اصل المشروعیة وانما کان خلافهم فی اولی الامرین و نظیره اختلاف القرّآء فی وجوه القرأة وقد عللوا کثیرًا من هذا الباب بان الصحابة مختلفون وانهم جمیعًا علی الهدٰی۔

واقعہ یہ ہے کہ فقہا کے درمیان اختلاف کی اکثر صورتیں، بالخصوص ان مسائل میں

---

[1] اس خط کا جواب دہلی میں لکھا گیا تھا۔

جن میں صحابہؓ کے اقوال دونوں طرف پائے جاتے ہیں مثلاً تکبیرات تشریق، تکبیرات عیدین، نکاح محرم، تشہد ابن عباس و ابن مسعود، بسم اللہ اور آمین کا اخفا، تکبیر اقامت میں کلمات کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ پڑھنا وغیرہ، ان میں اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ دو اقوال میں سے کس کو کس پر ترجیح ہے۔ ورنہ ان مختلف طریقوں کے بجائے خود مشروع ہونے میں سلف کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان کا اختلاف تو صرف اس اعتبار سے تھا کہ دو مختلف اُمور میں سے اولیٰ کون سا ہے، اور یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے قرأت کی مختلف صورتوں میں قاریوں کے درمیان اختلاف ہے۔ اس معاملے میں بیش تر اُمور کے اختلاف کی وجہ سلف نے یہ بتائی ہے کہ صحابہ کرامؓ خود ان میں مختلف تھے اور ظاہر ہے کہ صحابہ سب کے سب ہدایت پر تھے۔"

پھر باب اذکار الصلوٰۃ وھیئآتھا المندوب الیھا میں فرماتے ہیں:

وھو (ای رفع الیدین) من الھیئآت وفعلہ النبی ﷺ مرۃ وترکہ مرۃ والکل سنۃ واخذ بکل واحد جماعۃ من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم وھذا احد المواضع التی اختلف فیھا الفریقان اھل المدینۃ والکوفۃ ولکل واحد اصل اصیل والحق عندی فی مثل ذٰلک ان الکل سنۃ۔

"اور وہ (یعنی رفع الیدین) نماز کی ان ہیئتوں میں سے ہے جن کو نبیؐ نے کبھی کیا ہے اور کبھی نہیں کیا۔ اور یہ دونوں طریقے سنت ہیں، صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں سے ایک ایک طریقے کو اختیار کیا ہے، اور یہ من جملہ ان معاملات کے ہیں جن میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ لیکن ہر ایک کے لیے ایک ثابت شدہ اصل شریعت میں موجود ہے، اور ایسے مسائل میں میرے نزدیک حق یہ ہے کہ سب مختلف طریقے سنت ہیں۔"

شاہ صاحب کی ان تصریحات کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں آمین کے مسئلے

کے متعلق الگ بحث کروں۔ تاہم اس معاملے میں صاحب الجواہر النقی کا یہ قول نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ:

والصواب ان الخبرين بالجهر بها والمخافة صحيحان وعمل بكل من فعليه جماعة من العلماء۔

۳۔ ہماری جماعت کا ان اختلافی معاملات میں جو مسلک ہے، اس کی توضیح اس سے پہلے بارہا کی جا چکی ہے، اور میں اب ایک مرتبہ پھر اسے صاف صاف الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ اس جماعت میں اہل حدیث، احناف، شوافع اور ایسے ہی دوسرے فقہی طریقوں پر چلنے والے مسلمانوں کے لیے اپنے اپنے فقہی مسلک پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے، بشرطیکہ وہ ان مسلکوں میں سے کسی کے لیے متعصب نہ ہوں اور ان اختلافات کو مغائرت اور جتھا بندی کا ذریعہ نہ بنائیں۔ جماعت کے اندر جو لوگ بھی شامل ہوں، انہیں اسلامی عصبیت کے سوا اور ساری عصبیّتیں اپنے اندر سے نکالنی ہوں گی، خواہ وہ وطنی عصبیّتیں ہوں، نسلی ہوں، طبقاتی ہوں یا گروہی۔ ان کو محبت اور دوستی کے رشتے میں جوڑنے والی چیز اسلام کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ اور ان کے اندر غصہ و نفرت کو بھڑکانے والی بھی اسلام سے دوری کے سوا کوئی دوسری چیز نہ ہو۔ کسی رکن جماعت کے لیے کسی دوسرے شخص کا اہل حدیث یا حنفی یا شافعی مسلک پر ہونا یا اختیار کر لینا نہ تو سبب محبت ہی ہو اور نہ سبب نفرت۔ اس لازمی وضروری شرط کے ساتھ اہل حدیث، اہل حدیث رہتے ہوئے اور حنفی، حنفی رہتے ہوئے' اور شافعی، شافعی رہتے ہوئے' جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص کسی مخصوص فقہی مذہب کے لے متعصب ہو اور اپنے مذہب کے پیروؤں سے محبت اور دوسرے طریقے والوں سے نفرت رکھتا ہو، اور حنفی، شافعی یا اہل حدیث ہو جانے کو جرم سمجھتا ہو اس کے لیے ہماری اس جماعت میں کوئی جگہ نہیں۔

۴۔ میرے متعلق اس نزاع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر میں صبر کرتا ہوں اور اُن لوگوں کے معاملے کو خدا پر چھوڑتا ہوں جنہوں نے بغیر علم و تحقیق کے یہ بدگمانی لوگوں میں پھیلائی کہ میں اہل حدیث کو حنفی بنانے کی سازش کر رہا ہوں۔ کاش وہ لوگ جو فقہی جزئیات میں کتاب وسنت کی پیروی پر بڑا زور دیا کرتے ہیں، اخلاقی معاملات میں بھی کتاب وسنت کی کچھ پیروی کر لیا کریں۔

۵۔ آپ کے والد ماجد نے اس قضیے میں جو رویہ اختیار کیا ہے، اس کی دو حیثیتیں

ہیں: ایک رکن جماعت ہونے کی حیثیت، اور دوسری آپ کے والد ہونے کی حیثیت۔ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے، اس پر میں نمبر ۳ میں روشنی ڈال چکا ہوں، لہٰذا وہ براہ کرم اپنے متعلق فیصلہ کرلیں کہ آیا وہ اپنے رویے کو بدلنا پسند فرماتے ہیں یا جماعت سے علیحدگی۔ رہی دوسری حیثیت، تو اس کے متعلق میں مختصر طور پر صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جہاں تک اُصول دین کا تعلق ہے، والدین کو نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعتقادی ضلالت یا اخلاقی فساد سے روکنے کی کوشش کریں۔ لیکن جہاں تک فقہی معاملات کا تعلق ہے، والدین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اولاد کو اپنے مسلک خاص کی پیروی پر مجبور کریں۔ خصوصاً جب کہ اولاد صاحب علم ہو اور تحقیق کی بِنا پر والدین سے مختلف کسی دوسرے مسلک فقہی کو اختیار کرنا چاہے تو والدین کے لیے یہ مطالبہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے خلاف عمل کرے۔ اس معاملے میں سلف کا صحیح اتباع یہ ہے کہ والدین اور اولاد دونوں کو تحقیق کی آزادی اور اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اس حق کو سلب کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک شخص اہل حدیث یا حنفی یا شافعی ہو تو وہ اپنی آیندہ نسل کو بھی اہل حدیث، حنفی یا شافعی بنانے پر اصرار کرے گا اور دو چار پشتیں گزر جانے کے بعد یہ طریقے محض فقہی مسلک نہ رہیں گے بلکہ نسلی اُمتیں بن جائیں گے جن میں تعصب ہوگا، جمود ہوگا اور آبائی مسلک سے ہٹنا ارتداد کا ہم معنی قرار پائے گا۔ آپ خود اپنے والد ماجد ہی سے دریافت فرمائیں کہ آیا وہ اپنی آیندہ نسل کو اسی فتنے میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟

(ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۴ھ، جولائی، اگست ۴۵ء)

دو شبہات:

سوال: میں نے پورے اخلاص و دیانت کے ساتھ آپ کی دعوت کا مطالعہ کیا ہے جس کے نتیجے میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اُصولاً صرف جماعت اسلامی ہی کا مسلک صحیح ہے۔ آپ کے نظریے کو قبول کرنا اور دوسروں میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اس دور میں ایمان کو سلامتی کے ساتھ لے چلنے کے لیے وہی راہ اختیار کی جاسکتی ہے جو جماعت اسلامی نے اختیار کی ہے۔ چنانچہ میں ان دنوں اپنے آپ کو جماعت کے حوالے کردینے پر تُل گیا تھا، مگر ترجمان القرآن میں ایک دو چیزیں ایسی نظر سے گزریں کہ مزید غور و تامل کا فیصلہ کرنا پڑا۔ میں نکتہ چیں اور معترض نہیں ہوں بلکہ حیران و سرگرداں مسافر کی حیثیت سے، جس کو اپنی منزل مقصود کی محبت چین

نہیں لینے دیتی، آپ سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مشارالیہ مسائل کے متعلق میری گزارشات پر غور فرمائیں:

۱۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بِنا نہیں رکھی جاسکتی جسے مدار کفر وایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ محض گمانِ صحت ہے، نہ کہ علم الیقین''۔

یہ عقیدہ، جہاں تک بندے کا خیال ہے، محدثین کے بالکل خلاف ہے۔ کتب اُصول میں بصراحت موجود ہے کہ جس طرح قرآن مجید مسلمانوں کے لیے قانونی کتاب ہے، اسی طرح حدیث، اور جس طرح قرآن مجید کے احکام، چاہے اصولی ہوں چاہے فروعی، ہمارے لیے حجت ہیں، اسی طرح احادیث بھی حجت ہیں۔ آپ کے طرزِ تحریر سے کسی حد تک حدیث سے بے توجہی معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ ڈاڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ موجود ہیں جن میں آپ نے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم فرمایا ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ ڈاڑھی کو مطلقاً بڑھایا جائے۔ آپ کترنے کی گنجایش نکالنا چاہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ابن عمرؓ کی روایت کے بموجب ایک مشت تک کٹوا دیں۔ اس سے زیادہ کم کرنے کی گنجایش نظر نہیں آتی۔ باقی جو آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ صحابہ وتابعین کے حالات میں ان ڈاڑھیوں کی مقدار کا ذکر کہیں شاذ ونادر ہی ملتا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سلف میں یہ مسئلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا جو آج اسے دے دی گئی ہے، تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ اصل میں قرونِ ماضیہ میں لوگ اس کے اس قدر پابند تھے کہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آج سے چند سال پہلے عام مسلمان ڈاڑھی کے نہ صرف مونڈوانے بلکہ کتروانے تک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پس اس چیز کی وقعت اور قدر لوگوں کے دلوں سے کم نہ کیجیے بلکہ بحال رہنے دیجیے۔

ان دونوں شکوک پر اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیے۔

جواب: آپ کے شبہات کا جواب بالاختصار دے رہا ہوں۔ غالباً یہ چند سطور اطمینان کے لیے کافی ہوں گی:

۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کو میں بھی قرآن کی طرح حجت مانتا ہوں، اور میرے نزدیک جو عقیدہ حضورؐ نے بیان کیا ہو یا جو حکم آپؐ نے ارشاد فرمایا ہو، وہ اسی طرح ایمان واطاعت کا مستحق ہے جس طرح کوئی ایسا عقیدہ یا حکم جو قرآن میں آیا ہو۔ لیکن قول رسولؐ اور وہ روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں، اور نہ ان روایات کو استناد کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلا قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی کے منزل من اللہ ہونے میں تو کسی شک کی گنجایش ہی نہیں ہے، بخلاف اس کے روایات میں اس شک کی گنجایش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبیؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضورؐ کا ہے یا نہیں۔ جو سنتیں تواتر کے ساتھ نبیؐ سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں یا جو روایات محدثین کی مسلمہ شرائط تواتر پر پوری اترتی ہیں، وہ تو یقیناً ناقابل انکار حجت ہیں۔ لیکن غیر متواتر روایات سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا بلکہ صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے اُصول میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ غیر متواتر روایات احکام کی ماخذ تو ہو سکتی ہیں لیکن ایمانیات کی ماخذ نہیں ہو سکتیں۔

(۲) جو باتیں آپ نے ڈاڑھی کے متعلق تحریر فرمائی ہیں، ان پر میں اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں[1] اور اب خواہ مخواہ ایک ہی بات کو متھے جانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ اگر کسی فروعی مسئلے میں میرے دلائل سے آپ کا اطمینان ہو جائے تو بہتر ہے، اور اطمینان نہ ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، آپ اس معاملے میں میری رائے کو غلط سمجھ کر ردّ کر دیں اور جو کچھ خود صحیح سمجھتے ہوں، اس پر عمل کریں۔ اس قسم کے جزوی مسائل میں ہم مختلف رائیں رکھتے ہوئے بھی ایک ہی دین کے پیرو رہ سکتے ہیں اور اس دین کی اقامت کے لیے مل کر کام کر سکتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں جماعت اسلامی میں شامل ہونے ہی والا تھا کہ یہ دو چیزیں میرے سامنے آ گئیں اور انہیں دیکھ کر میں رُک گیا۔ اس رُک جانے کو آپ شاید کوئی تقویٰ کا فعل سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ ذرا غور کریں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ فی الواقع آپ نے تقویٰ کا مفہوم غلط سمجھا ہے اور اسی وجہ سے ایک غیر متقیانہ فعل کو متقیانہ فعل سمجھ کر آپ کر گزرے ہیں۔ آپ کو اعتراف ہے کہ یہ جماعت اصل دین کی اقامت کے لیے بنی ہے جو ہر مومن کے عین ایمان کا مقتضا ضی ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ ''اس دور میں ایمان کو سلامتی کے ساتھ لے چلنے کے لیے

۱۔ یہ بحث فقہیات کے باب میں گزر چکی ہے اور آگے بھی آ رہی ہے۔

صرف جماعت اسلامی ہی کی راہ اختیار کی جاسکتی ہے۔'' اور یہ کہ ''اس نظریے کو قبول کرنا اور اسے پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔'' اب سوال یہ ہے کہ اس تقاضائے ایمان اور اس فرض کی طرف بڑھتے بڑھتے آپ کا صرف اس لیے رک جانا کہ ایک علمی مسئلے کی تعبیر اور ایک جزوی فقہی مسئلے کی تحقیق میں آپ جماعت کے اس خادم کی رائے کو غلط پاتے ہیں، آخر کس قسم کا تقویٰ ہے؟ فقہی و علمی اختلاف تو خیر بہت چھوٹی چیز ہے کہ اس کے لیے فریقین کے پاس شریعت سے دلائل موجود ہوتے ہیں، میں ثابت شدہ سنتوں کے متعلق آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان کی خلاف ورزی دیکھ کر بھی اگر آپ اس فرض سے اجتناب کر جائیں تو کیا یہ پرہیز گاری ہے؟ مثلاً آپ دیکھیں کہ امام نے مسجد میں داخل ہوتے وقت بایاں قدم پہلے رکھا اور یہ دیکھتے ہی آپ جماعت چھوڑ کر مسجد سے پلٹ آئیں، یا آپ دیکھیں کہ اسلامی فوج کے جنرل نے اُلٹے ہاتھ سے پانی پیا یا چھینک آنے پر الحمدللہ نہ کہا اور اس خلافِ سنت حرکت سے متنفر ہو کر آپ میدان جہاد سے پلٹ آئیں تو کیا واقعی اس کو آپ پرہیز گاری سمجھیں گے؟ آپ کو موازنہ کر کے دیکھنا چاہیے کہ اس نے کیا چھوڑا تھا اور آپ نے کیا چھوڑ دیا۔ وہ بڑا غلط کار تھا کہ اس نے ایک پیسا ضائع کیا۔ مگر آپ نے تو اس کے جواب میں خزانہ برباد کر دیا۔ پھر بتائیے کہ زیادہ بڑا غلط کار کون ہوا؟ تاہم یہ آپ کا تصور نہیں ہے بلکہ آج کل دین داری کا عام ڈھنگ یہی ہے کہ اشرفیاں لُٹیں اور کوئلوں پر مہر۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل ۶۵ھ، فروری ۴۶ء)

حدیث اور فقہ:

سوال: ذیل میں آپ کے لٹریچر سے چند اقتباسات دربارۂ مسئلۂ تقلید و اجتہاد مرتب کر کے کچھ استفسارات کیے جاتے ہیں۔ ان سے صرف علمی تحقیق مقصود ہے، بحث مدعا نہیں ہے:

۱۔ ''تمام مسلمان چاروں فقہوں کو برحق مانتے ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ ایک معاملے میں ایک ہی طریقے کی پیروی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے علما نے طے کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو ان چاروں میں سے کسی ایک ہی کی پیروی کرنی چاہیے۔'' (رسالہ دینیات طبع دوم، ص ۱۲۵)

۲۔ ''پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس حدیث کو وہ (یعنی محدثین) صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے

کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے۔ مزید برآں یہ ظن غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ کہ بلحاظ درایت۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری تھا۔ فقہ ان کا اصل موضوع ہی نہ تھا۔ اس لیے فقیہانہ نقطۂ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہائے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے جائز کمال کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہے، اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں: ایک بلحاظ اسناد، دوسرے بلحاظ تفقہ۔'' (تفہیمات مضمون مسلک اعتدال)

۳۔ ''اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ رجال کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں محدثین کے اپنے جذبات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔'' (ترجمان القرآن، جلد ۱۰، عدد، ص ۱۱۰)

۴۔ ''رہا فقیہانہ نقطۂ نظر، تو وہ ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا۔ اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا''..... ''اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے، حالاں کہ معنی کے لحاظ سے وہ زیادہ قابل اعتبار نہیں اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں، حالاں کہ وہ معناً صحیح ہے''..... ''مگر جو لوگ شریعت میں نظر رکھتے ہیں، ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطۂ نظر فقیہانہ نقطۂ نظر سے بارہا ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہا و مجتہدین نے ملحوظ رکھا ہے۔ روایت کو بالکلیہ رد کرنا بھی غلطی ہے اور روایات پر ہی اعتماد کرنا بھی غلطی ہے۔ بلکہ مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہی وہ مسلک ہے جو ائمۂ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں، یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے، یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔''

اب ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر میرے حسب ذیل سوالات پر روشنی ڈالیے:

ا۔ مسلمان کا چاروں فقہوں کو ماننا کس نص کے ماتحت ہے؟

ب۔ اسناد حدیث اور تفقہِ مجتہدین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے؟

ج۔ تفقہ مجتہد اور اسنادِ حدیث میں سے کس میں زیادہ ظنّیت ہے؟

د۔ محدث و فقیہ ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے یا نہیں؟

ر۔ کوئی نظیر بتائیں کہ امام ابوحنیفہ نے متن کو ملحوظ رکھ کر ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا اور قوی الاسناد کو چھوڑا ہو۔

س۔ کیا یہ قولِ ائمہ کہ ان کے فیصلوں کے مقابلے میں قوی الاسناد حدیث ہی قابل قبول ہے، صحیح ہے؟

ص۔ درایت کا معیار کیا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر اسناد صحیحہ رکھنے کے باوجود حدیث قوی الاسناد کو رد کر دیا جائے؟ نیز بتایا جائے کہ کس نص نے یہ شرط درایت اور اس کا معیار قائم کیا ہے؟

ط۔ کیا کسی مسلمان کو یہ حق ہے کہ خدا اور رسول کا حکم ظن غالب کے بموجب اسے پہنچے اور اس میں درایت کی مداخلت کر کے اس سے گریز کرے اور اپنے تفقہ کی بنا پر اس کی مخالفت کرے، جب کہ اس کے تفقہ میں بھی خطا کا امکان ہے؟

جواب: (الف) چاروں فقہوں کا برحق ماننا کسی نص کے ماتحت نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ چاروں فقہی مذاہب کتاب وسنت سے استنباط کرنے میں اُن اُصولوں کو اختیار کرتے ہیں جن کے لیے شریعت میں گنجایش اور بنیاد موجود ہے۔ چاہے جزوی اُمور میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو، اور جزوی اُمور میں ان سے اختلاف کرنے کے لیے کسی کے پاس کتنے ہی معقول وجوہ موجود ہوں، لیکن اصولاً استنباط احکام کے وہی طریقے ان مذاہب میں استعمال کیے گئے ہیں جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں اور جن سے خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے استنباطِ مسائل میں کام لیا تھا۔

ب۔ اسناد حدیث اور تفقہ مجتہد میں سے کسی کو کسی پر مطلقاً تفوق نہیں دیا جا سکتا۔ اسناد حدیث اس بات کی ایک شہادت ہے کہ جو روایت نبیؐ سے ہم کو پہنچ رہی ہے، وہ کہاں تک قابل اعتبار ہے۔ اور تفقہِ مجتہد ایک ایسے شخص کی فیصلہ کن رائے (Judgement) ہے جو کتاب وسنت میں گہری بصیرت رکھنے کے بعد ایک رپورٹ کے متعلق اندازہ کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قابل قبول ہے اور کہاں تک نہیں، یا اس رپورٹ سے جو معنی اخذ ہوتے ہیں، وہ نظامِ شریعت میں کہاں تک نصب (Fit) ہو سکتے ہیں اور کہاں تک غیر متناسب (Unfit) ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں، جس طرح عدالت میں شہادتیں اور جج کا فیصلہ دونوں کی الگ حیثیت ہے۔ یعنی نہ مطلقاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جج کا فیصلہ شہادتوں پر بہر حال مقدم ہے اور

نہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ شہادتیں ضرور جج کے فیصلے پر مقدم ہوتی ہیں۔اسی طرح محدث کی شہادت اور فقیہ کی اجتہادی تحقیق دونوں میں کسی کو بھی مطلقاً دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

ج۔ تفقہِ مجتہد میں بھی خطا کا امکان ہے اور اسناد حدیث میں بھی۔پس میرے نزدیک لازم ہے کہ ایک ذی علم آدمی مجتہدین کے اجتہادات اور احادیث کی روایات دونوں میں نظر کر کے حکم شرعی کی تحقیق کرے۔رہے وہ لوگ جو حکم شرعی کی خود تحقیق نہیں کر سکتے تو ان کے لیے یہ بھی صحیح ہے کہ کسی عالم کے اوپر اعتماد کریں،اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو مستند حدیث مل جائے،اس پر عمل کریں۔

د۔ ایک آدمی بیک وقت محدث اور فقیہ ہوسکتا ہے اور ایسا شخص نرے محدث یا نرے فقیہ کے مقابلے میں اُصولاً قابل ترجیح ہے۔لیکن میرا یہ جواب صرف اُصولی حیثیت سے ہے۔کسی شخص خاص پر اس کا انطباق کرنے میں لازماً یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا تفقہ میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو حفظ حدیث میں ہے۔

ر۔ اس وقت میرے پیش نظر مطلوبہ نظیر نہیں ہے اور ویسے بھی نظیریں پیش کرنے سے بحث کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔

س۔ ائمۂ مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات صحیح الاسناد حدیث متن کے اعتبار سے کمزور پہلو رکھتی ہے اور کتاب وسنت سے جو دوسری معلومات ہم کو حاصل ہوئی ہیں،ان کے ساتھ اس کا متن مطابقت نہیں رکھتا۔ایسے حالات میں ناگزیر ہوجاتا ہے کہ یا اس حدیث کی تاویل کی جائے اور یا اسے ردّ کیا جائے۔

ص۔ درایت سے مراد وہ فہمِ دین ہے جس کو قرآن مجید میں ''حکمت'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ حکمت شریعت کی صحیح پیروی کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو درجہ ''حذاقت'' کا فن طب میں ہے۔ جن لوگوں نے اس میں سے کم حصہ پایا ہو یا جنہیں اس کی قدر و قیمت کا احساس نہ ہو،ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ جیسا لکھا پائیں،ویسا ہی عمل کریں۔لیکن جنہیں اس میں سے کچھ حصہ ملا ہو،وہ اگر اس بصیرت سے جو انہیں اللہ کے فضل سے کتاب وسنت میں حاصل ہوئی ہو،کام نہ لیں تو میرے نزدیک گنہگار ہوں گے۔

میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں آپ کو حکمت اور فقہ اور فہم دین کا کوئی ایسا

معیار بتا سکوں جس پر آپ ناپ تول کر دیکھ لیں کہ کسی نے ان میں سے حصہ پایا ہے یا نہیں، اور پایا ہے تو کتنا پایا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب کی حذاقت کا، جوہری کی جوہر شناسی کا اور کسی صاحبِ فن کی فنی مہارت کا کوئی نپا تلا معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کے حدود معین نہ کیے جا سکنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ چیز سرے سے لاشے ہے یا شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ط۔ اس سوال کا جواب اوپر کے جوابات میں ضمناً ہے۔ صرف اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ درایت کے استعمال میں خطا کا امکان ہے، لیکن ایسا ہی امکان کسی حدیث کو صحیح اور کسی کو ضعیف اور کسی کو موضوع قرار دینے میں بھی ہے۔ اگر کوئی مسلمان درایت کے استعمال میں غلطی کر کے مجرم ہو جاتا ہے تو وہ احادیث کے مرتبے کا تعین کرنے میں غلطی کر کے بھی ویسا ہی مجرم ہوگا۔ حالاں کہ شریعت انسان کی استعداد اور اس کے ممکنات کی حد تک ہی بار ڈالتی ہے اور اسی حد تک اسے مسئول قرار دیتی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

تجریحات اسلامی نظام جماعت میں آزادی تحقیق:

سوال: ''تفہیمات'' کا مضمون ''مسلک اعتدال'' جس میں صحابہ کرامؓ اور محدثین کی باہمی تجریحات کو نقل کیا گیا ہے اور اجتہادِ مجتہد اور روایت محدث کو ہم پلا قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، اس مضمون سے حدیث کی اہمیت کم اور منکرین حدیث کے خیالات کو تقویت حاصل ہوتی ہے، یہ رائے نہایت درجہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کے سوالات اگر آپ کے نزدیک بنیادی اہمیت نہیں رکھتے تو جماعت اسلامی کی ابتدائی منزل میں محدثین و فقہا اور روایت و درایت کے مسئلے پر قلم اُٹھانا مناسب نہیں تھا۔ اس مسئلے کے چھیڑ دینے سے غلط فہمیاں پھیل نکلی ہیں۔ اب بہتر یہ ہے کہ بروقت ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے، کیوں کہ حدیث کی اہمیت کو کم کرنے والے خیالات جس لٹریچر میں موجود ہوں، اسے پھیلانے میں ہم کیسے حصہ لے سکتے ہیں، حالاں کہ نظم جماعت اسے ضروری قرار دیتا ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریریں مع تنقید اخبارات و رسائل میں شائع کر دی جائیں۔

جواب: فقہی مسائل میں اجتہاد و استنباط کے اصول اور طریقوں کے متعلق غالباً پہلے بھی کبھی

کوئی شخص ایسی بات نہیں کہہ سکا ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف کی گنجایش نہ ہو اور جس پر سب لوگ متفق ہو جائیں۔ اور اگر آپ غور کریں تو آپ کو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان اختلافات کے لیے کافی گنجایش خود کتاب اللہ اور ذخیرۂ احادیث میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے سلف صالحین کے درمیان ہر دور میں اختلافات ہوئے ہیں۔ پھر کیا ان اختلافات کا منشا یہی تھا کہ اصل دین کی دعوت اور اقامت کے لیے بھی مسلمان کبھی ایک جماعت نہ بن سکیں؟ اور اگر صدیوں میں کوئی ایسی جماعت کبھی بنے تو فقہی مسائل پر کلام کرنا چھوڑ دیا جائے؟ یا نہیں تو پھر سارے فقہی اختلافات کو پہلے صاف کیا جائے؟

اگر آپ کا نقطۂ نظر یہی ہے تو مجھے اس پر افسوس ہے اور سوائے اس کے کہ میں اس کو بدقسمتی سمجھوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے تو پھر براہ کرم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ ہماری یہ جماعت اصل دین کی دعوت و اقامت کے لیے کھڑی ہوئی ہے اور اس کام میں تمام ان فقہی مسالک کے آدمیوں کو مجتمع ہو جانا چاہیے جن کے اُصول اور طریقوں کے لیے قرآن و حدیث میں بنیادیں موجود ہیں۔ لیکن یہ اجتماع اسی طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کو مسائل فقہیہ میں اصولی گنجایشوں کی حد تک تحقیق کی آزادی حاصل رہے، اور یہ آزادیِ تحقیق ان مختلف المسلک لوگوں کے درمیان ایسی نزاع کی موجب نہ بنے جو نفس اجتماع برائے اقامت دین میں مانع ہو۔ اسی وجہ سے میں اُس بحث کو ٹال رہا ہوں جسے آپ لوگ بار بار چھیڑ رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ فقہیات کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑے کرتے رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا متحد ہونا اور اصل دین کے لیے مل کر کام کرنا غیر ممکن ہو گیا ہے، وہی ذہنیت بار بار بروئے کار آئے چلی جا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمام دین کی اصل و اساس بس وہی اُمور ہیں جو آپ معرض بحث میں لا رہے ہیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ان چیزوں پر بحث کرنے کے لیے اتنا وقت حاصل نہیں ہے جتنا آپ حضرات کو حاصل ہے۔ اس لیے مختصر مختصر جوابات اپنے خطوط میں دیتا رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا منشا یہی ہے کہ میں اور سب کام چھوڑ کر انہی بحثوں میں اُلجھ جاؤں تو بسم اللہ، ایک اور مفصل مضمون روایت اور اجتہاد کی توضیح میں لکھ دوں گا۔ مگر یقیناً اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ آپ حضرات کو اطمینان ہو جائے، بلکہ ہوگا یہ کہ جماعت کے اندر اور باہر کے تمام اہل حدیث حضرات میرے ساتھ اس بحث میں اُلجھ جائیں گے

اور ہمارے لیے ایک نصب العین پر جمع ہو کر کام کرنا محال ہو جائے گا۔ پھر یہ فساد اس مقام پر بھی ختم نہیں ہوگا، بلکہ جب ان بحثوں کا دروازہ کھلے گا تو میرے وہ مضامین بھی زیر بحث آجائیں گے جن پر کچھ حنفی حضرات آپ لوگوں کی طرح بگڑے بیٹھے ہیں، اور ایک دوسرے محاذ پر ایسی ہی ایک اور جنگ شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ ایک مرتبہ پھر مجھے سوچ کر لکھیے کہ کیا یہی آپ کا منشا ہے۔

رہی یہ بات کہ اگر یہ باتیں بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں تو جماعت کی ابتدائی زندگی میں ان پر قلم اٹھانا مناسب نہ تھا، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب تک میں نے کوئی چیز ایسی نہیں لکھی ہے جس پر کسی نہ کسی گروہ کو چوٹ نہ لگی ہو اور اگر میں یہ فیصلہ کرلوں کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو ناگوار ہو تو شاید کچھ بھی نہ لکھ سکوں۔ مگر یقین کیجیے کہ اس معاملے میں جتنا ناکام میں ہوا ہوں، اس سے شاید بہت زیادہ ناکام آپ حضرات ثابت ہوں گے۔ اگر آپ اس دعوت کے لیے کام کرنے کھڑے ہوں تو غالباً چند صفحے بھی ایسے نہ لکھ سکیں گے جو اہل حدیث حضرات کے سوا کسی دوسرے گروہ کو ناگوار ہوئے بغیر رہ سکتے ہوں۔ پس خوب سمجھ لیجیے کہ اصل چیز ان مباحث سے پرہیز نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص جو کچھ لکھے یا کہے وہ معقولیت کو برقرار رکھتے ہوئے، حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے، شان تحقیق کے ساتھ لکھے اور دوسرے لوگ جو اس کے سننے والے یا پڑھنے والے ہیں، ان کے اندر کچھ قوت تحمل، کچھ وسعت قلب، کچھ رواداری اور کچھ اصول وفروع کی تمیز موجود ہو۔

آپ کا یہ خیال تو بہت ہی عجیب وغریب ہے کہ جب لٹریچر میں کوئی وجہ اختلاف موجود ہے تو اسے کیسے پھیلایا جاسکتا ہے۔ ذرا مجھے کوئی ایسا لٹریچر بتا دیجیے جس میں تمام چیزیں تمام لوگوں کے منشا کے مطابق ہی ہوں۔ موجودہ دور میں نہیں، متقدمین کے دور میں ہی بتلا دیجیے۔

اگر اس بحث کا فیصلہ اس طرح ہو سکے کہ آپ یا آپ کے ہم خیال حضرات میں سے کوئی صاحب میری تحریروں پر ایک تنقید لکھ کر شائع کر دیں تو میں اس کو دل سے پسند کروں گا اور اس تنقید کے جواب میں ایک حرف بھی نہ لکھوں گا، تاکہ کسی طرح اس قضیے کا خاتمہ تو ہو۔

(ترجمان القرآن، رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

احادیث کی تحقیق میں اسناد اور تفقہ کا دخل:

سوال: خط وکتابت کے کئی مراحل طے ہو چکے ہیں، لیکن ابھی تک کوئی اطمینان بخش صورت

ظاہر نہ ہوئی۔ تاہم اس خط سے محض ایک سوال کے حل پر ساری بحث ختم ہوسکتی ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ حدیث وفقہ کا ہم پلّا ہونا، اسناد حدیث میں خامیوں کا پایا جانا وغیرہ مضامین آپ کی نظر میں بنیادی ہیں یا فروعی؟ اگر اُصولی اور بنیادی ہیں جیسا کہ جماعت کے مستقل کتابی لٹریچر میں اس کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے تو پھر کسی مخالفت کا اندیشہ کیے بغیر جماعت اہل حدیث روایت کے باب میں جو غلو رکھتی ہے، اس کی اصلاح وتنقید کے لیے پورا زور قلم صرف کیجیے، جیسا کہ آپ نے لیگ اور کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے کیا ہے۔ باقی رہا جماعت کے اندر اور باہر بحث کا دروازہ کھل جانے کا اندیشہ، تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ کیوں کہ اب سے پہلے بھی اخبار اہل حدیث امرتسر میں ''تصدیق اہل حدیث'' کے عنوان سے اس پر تنقید ہو چکی ہے اور اب بھی ایک مولوی صاحب..... میں تفہیمات کے اقتباسات (مسلک اعتدال) سنا سنا کر جماعت اسلامی کے ہم خیال اہل حدیث افراد میں بد دلی پیدا کر رہے ہیں، اور پوری طرح فتنے کا سامان پیدا ہو گیا ہے اور جماعتی ترقی میں مزاحمت ہو رہی ہے۔

لیکن اگر یہ مضامین فروعی اور ضمنی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ آپ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے، تو پھر تفہیمات جیسی اُصولی اور اہم کتاب اور مستقل لٹریچر کی صورت میں ان پر افہام وتفہیم کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے لیے صرف ترجمان کے صفحات کافی تھے۔ افسوس کہ جس چیز کو آپ فروعی تحریر فرماتے ہیں، وہی جماعت کی توسیع کے راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ خود آپ ہی دستور جماعت کی دفعہ ۵، جز (د) میں تحریر فرماتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے رکن کے لیے ان تمام بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا ضروری ہے جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غیر اہم کو اہم بنایا جا رہا ہے اور اس کے لیے تفہیمات کے صفحے کے صفحے سیاہ کیے گئے ہیں؟ کیا اس سے بڑھ کر بنیادی اصلاح کا کام باقی ہی نہ رہا تھا۔

پھر یہاں دو جدا جدا چیزیں ہیں جنہیں مخلوط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فقہی جزئیات کی تعمیل میں کتاب وسنت کے ماتحت مختلف ہونا الگ معاملہ ہے اور اسے برداشت کیا جا سکتا ہے، یعنی اس بارے میں بنیادی اُمور کے اشتراک واتحاد کے لیے رواداری برتی جا سکتی ہے۔ لیکن اُصولی طور پر روایت نبویؐ اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابل برداشت ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف ہو سکتا ہے، خود اکابر حنفیہ بھی اس کے قائل نہیں،

نیز امام ابوحنیفہؒ نے بھی اس قسم کے عقیدہ وخیال سے تبرّی اور بیزاری ظاہر کی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ اور شامی)۔

اب اس کش مکش کو رفع کرنے کی یہی صورت ہے کہ ''مسلک اعتدال'' والا مضمون آیندہ تفہیمات کے ایڈیشن میں شائع نہ کیا جائے اور ترجمان القرآن میں ایک مہذب ومؤدّب تنقیدی مضمون کی اشاعت کا موقع مرحمت فرمایا جائے۔ یہ تنقید ہم دردانہ اور جماعتی ترقی کے لیے ہوگی، مخالفانہ اور معاندانہ نہ ہوگی۔ واللّٰہ علٰی ما نقول شھید۔ ترجمان القرآن کی قدیمی وسعت ظرفی اور عالی ہمتی سے اس قسم کی اُمید وابستہ رکھنا بے جا نہ ہوگا۔

جواب: میں تو سمجھا تھا کہ میرے آخری خط سے آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ لیکن اب اس عنایت نامے کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ میں آپ کو مطمئن کرنے میں کام یاب نہیں ہوسکا ہوں۔ آپ نے اب جو سوال کیا ہے، اس کے سلسلے میں میرا بھی ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ میری کتابوں میں جنہیں آپ مستقل لٹریچر فرماتے ہیں، فروع وجزئیات کے متعلق صرف یہی ایک ''مسلک اعتدال'' والی بحث آپ کو نظر آئی ہے یا اور بھی کسی مقام پر میں نے جزئیات وفروع سے بحث کی ہے؟ اگر دوسرے مقامات پر بھی ایسی بحثیں ہیں اور یقیناً ہیں تو جزئیات وفروع سے عدم تعرض اور کلیات واُصول تک تقریر وگفتگو کو محدود رکھنے پر اصرار کی ضرورت آپ کو صرف اسی جگہ کیوں محسوس ہوئی؟

پھر آپ کا یہ ارشاد کہ جزئیات وفروع پر سرے سے میری کتابوں میں بحث ہی نہ ہونی چاہیے، بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ شاید کوئی شخص بھی مجرد کلیات تک اپنی بحثوں کو محدود رکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ کبھی کلیات واصول کی توضیح میں اسے جزئیات سے بحث کرنی ہوگی، کبھی لوگوں کے شکوک وشبہات اور استفسارات کے جواب میں اس کی ضرورت پیش آئے گی، اور کبھی خود تحقیق مسائل کے سلسلے میں بہت سے جزئیات کو زیر بحث لانا پڑے گا۔ اور جب یہ چیزیں بحث میں آئیں گی تو لامحالہ بہت سے اُمور ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی گروہ کے مسلک سے مختلف ہوں گے، اس لیے سرے سے آپ کا یہ مطالبہ ہی صحیح نہیں ہے۔

افسوس یہ ہے کہ آپ نے میرے پچھلے خطوط پر غور نہیں کیا۔ میں نے ان میں یہ بات عرض کی تھی کہ اقامت دین کی جدوجہد میں مختلف المسلک جماعتوں کو اکٹھا کرنے کے لیے یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ یا تو مسائل فقہیہ پر تحقیق کی آزادی سب لوگوں سے سلب کر لی جائے یا پہلے ان

سارے مسائل کو طے کر کے ایک مسلک کی جماعت بنانے کی کوشش کی جائے۔اس کے بجائے صحیح یہ ہے کہ تحقیق مسائل میں سب کے لیے آزادی رہے اور صرف تحقیق ہی کے لیے نہیں بلکہ اس کے اظہار و بیان کے لیے بھی آزادی رہے اور کسی کا مسلک کسی پر مسلط نہ کیا جائے۔اس سلسلے میں دستور کی جس دفعہ کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس کا منشا وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھا ہے، بلکہ اس کا منشا مناظرے اور معرکے بند کرنا ہے۔

میری پچھلی تحریروں سے جو عجیب عجیب معنی آپ نے پیدا کیے ہیں، ان پر مجھے افسوس بھی ہے اور حیرت بھی۔ تعجب ہے کہ آپ دوسرے شخص کے مسلک کو سمجھنے کی کوشش کے بجائے خود اپنی بدگمانی سے ایک بات وضع کر کے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔آپ کا یہ فقرہ کہ ''اُصولی طور پر روایت نبوی اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابل برداشت ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف ہوسکتا ہے'' یقیناً میرے مسلک کی ترجمانی نہیں ہے۔آپ خود ہی انصاف سے غور کیجیے کہ تفہیمات میں حدیث کے متعلق جو مضامین میں نے لکھے ہیں اور اپنی دوسری کتابوں اور مضامین میں جس طرح میں حدیث سے استدال و احتجاج کرتا رہا ہوں، کیا ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد میرے متعلق یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجایش نکل سکتی ہے کہ میرا ذرّہ برابر بھی کوئی میلان منکرین حدیث کے مسلک کی طرف ہے یا ہوسکتا ہے؟ پھر اگر آپ مجھے مومن یا مسلمان سمجھتے ہیں تو آخر کس طرح آپ نے میرے متعلق یہ گمان کرلیا کہ میں کسی روایت کو فی الحقیقت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مان لینے کے بعد پھر اس پر کسی کے تفقہ یا اپنے اجتہاد یا کسی امام کے قول کو ترجیح دے سکتا ہوں؟ ترجیح تو درکنار، اگر میں دونوں کو مساوی بھی سمجھوں بلکہ اس کا خیال بھی کروں تو مومن کیسے رہ جاؤں گا؟

دراصل آپ لوگ جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، وہ یہی ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اجتہاد و تفقہ کو حدیثِ رسولؐ پر ترجیح دیتے ہیں یا دونوں کو ہم پلّا قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ اصل واقعہ یہ نہیں ہے۔اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک سند کسی

حدیث کی صحت معلوم کرنے کا واحد ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جن سے کسی روایت کے حدیث رسولؐ ہونے کا ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ متن پر غور کیا جائے، قرآن وحدیث کے مجموعی علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے، اس کا لحاظ بھی کیا جائے، اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملے سے متعلق ہے، اس معاملے میں قوی تر ذرائع سے جو سنت ثابتہ ہمیں معلوم ہو، اس پر بھی نظر ڈالی جائے۔ علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر ہم کسی حدیث کی نسبت نبیؐ کی طرف کر دینا درست نہیں سمجھتے۔ پس ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ حدیث رسول اور اجتہادِ مجتہد میں مساوات ہے یا نہیں۔ بلکہ اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ روایات کے ردوقبول اور ان سے احکام کے استنباط میں ایک محدث کی رائے بلحاظ سند، اور ایک مجتہد کی رائے بلحاظ درایت کا مرتبہ مساوی ہے یا نہیں؟ یا یہ کہ دونوں میں سے کس کی رائے زیادہ وزنی ہے؟ اس باب میں اگر کوئی شخص دونوں کو ہم پلّا قرار دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ لیکن آپ لوگ اس کو گناہ گار بنانے کے لیے اس پر خواہ مخواہ یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ حدیث کو حدیث رسولؐ مان لینے کے بعد پھر کسی مجتہد کی رائے کو اس کا ہم پلّا یا اس پر قابل ترجیح قرار دیتا ہے، حالاں کہ اس چیز کا تصور بھی کسی مومن کے قلب میں جگہ نہیں پا سکتا۔

محدثین جن بنیادوں پر احادیث کے صحیح وغلط یا ضعیف وغیرہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، ان کے اندر کمزوری کے مختلف پہلوؤں میں اپنے مضمون ''مسلک اعتدال'' میں بیان کر چکا ہوں۔ جن اُمور کو میں نے وہاں نظیر میں پیش کیا ہے وہ بیش تر علامہ ابن عبدالبر کی کتاب ''جامع بیان العلم'' سے ماخوذ ہیں۔ آپ براہ کرم مجھے بتائیے کہ فی الواقع کمزوری کے وہ پہلو فن حدیث میں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہیں تو پھر آخر آپ حضرات ہم سے محدثین کی آرا پر ایمان لے آنے کا مطالبہ کیوں اس شدومد سے کرتے ہیں؟ محدثین کو بالکل ناقابل اعتنا تو ہم نے کہا نہیں ہے، نہ کبھی ہم اس کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس حدیث کی تحقیق میں سب سے پہلے ہم یہی دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے حدیث کا کیا حال ہے اور اس معاملے میں جس پائے کے محدث نے اس کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہو، اس کے مرتبے کے لحاظ سے ہم اس کی رائے کو

پوری پوری وقعت بھی دیتے ہیں۔لیکن فن حدیث کی ان کمزوریوں کی بِنا پر، جن کا میں نے ذکر کیا ہے، ہم اس امر کا التزام نہیں کر سکتے کہ محض علم روایت کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات پر پورا پورا اعتماد کر کے ہر اس حدیث کو ضرور ہی حدیث رسولؐ تسلیم کر لیں جسے اس علم کی رُو سے صحیح قرار دیا گیا ہو۔آپ ہماری اس رائے سے اتفاق نہ کریں جس طرح ہم آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن عدم اتفاق کا یہ نتیجہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ ہم پر اس جرم کا الزام لگا دیں جو فی الواقع ہم نے نہیں کیا ہے۔

آپ اگر ''مسلک اعتدال'' پر علمی تنقید فرمائیں تو میرے لیے باعث شکر گزاری ہوگا۔مجھ پر میری غلطی واضح ہو جائے تو مجھے اس سے رجوع کرنے میں ہرگز تامّل نہ ہوگا۔

(ترجمان القرآن۔ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ۔نومبر، دسمبر ۴۴ء)

جزئیاتِ شرع اور مقتضیاتِ دین:

سوال: اجتماع[1] میں شرکت کرنے اور مختلف جماعتوں کی رپورٹیں سننے سے مجھے اور میرے رفقا کو اس بات کا پوری طرح احساس ہو گیا ہے کہ ہم نے جماعت کے لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ میں بہت معمولی درجے کا کام کیا ہے۔اس سفر نے گزشتہ کوتاہیوں پر ندامت اور مستقبل میں کامل عزم و استقلال اور اخلاص کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔دعا فرمائیں کہ جماعتی ذمہ داریاں پوری پابندی اور ہمت و جرأت کے ساتھ ادا ہوتی رہیں۔

اس امید افزا اور خوش کن منظر کے ساتھ اختتامی تقریر[2] کے بعض فقرے میرے بعض ہم درد رفقا کے لیے باعث تکدر ثابت ہوئے اور دوسرے مقامات کے مخلص ارکان و ہم دردوں میں بھی بددلی پھیل گئی۔عرض یہ ہے کہ منکرین خدا کا گروہ جب اپنی بے باکی اور دریدہ دہنی کے باوجود حلم، تحمل اور موعظۂ حسنہ کا مستحق ہے تو کیا یہ دین داروں کا متقشف تنگ نظر طبقہ اس سلوک کے لائق نہیں ہے؟ کیا ان کے اعتراضات و شبہات حکمت و موعظۂ حسنہ اور حلم و بردباری کے ذریعے دفع نہیں کیے جا سکتے؟ اختتامی تقریر کے آخری فقرے کچھ مغلوبیت جذبات کا پتا دے رہے تھے۔

---

[1] جماعت اسلامی کا وہ اجتماع عام مراد ہے جو ۱۹۴۵ء میں بمقام دارالاسلام (متصل پٹھان کوٹ) منعقد ہوا تھا۔

[2] یہ تقریر روداد جماعت اسلامی حصہ سوم کے آخر میں درج ہے اور ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' کے نام سے الگ بھی شائع ہو چکی ہے۔

تقریر کی صحت میں کلام نہیں، صرف اندازِ تعبیر اور طرزِ بیان سے اختلاف ہے۔ قرآن کا اُصول تبلیغ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ سے اخذ کیا جاسکتا ہے، اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ساری مشکلات حل ہوسکتی ہیں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ آپ کی عام عادت تبلیغ و تفہیم میں حکیمانہ ہے۔ اسی بنا پر اس دفعہ خلافِ عادت لب ولہجہ کو سخت دیکھ کر تعجب ہوا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ حکمت و مصلحت شرعی کا تقاضا ہے کہ فروعی مسائل اور ظواہر سنن کی تغییر وتبدیل پر ابتداءً اصرار نہ کیا جائے اور نہ خود عملاً ایسا طرز اختیار کیا جائے جس سے مسلمانوں میں توحش وتنفر پیدا ہو۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتلِ منافقین اور تغییر بنائے کعبہ سے محترز رہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اِعفا اور تقصیرِ لحیہ کے بارے میں سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے اور جو طرزِ عمل آپ نے اختیار کیا ہے، اس کی گنجایش نکلتی ہے۔ ادھر مقدار قبضہ تک اعفا کے جواز سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ پھر کیا یہ مناسب اور حکیمانہ فعل نہ ہوگا کہ عوام کو توحش سے بچانے کے لیے آپ بھی اسی جواز پر عمل کرلیں، کیوں کہ ظاہری وضع قطع میں جو غلو کی صورت ہے، اس کی اصلاح بنیادی اُمور اور مہمات مسائل کے ذہن نشین کرانے کے بعد بھی ہوسکتی ہے۔ جماعت اسلامی سے مخلصانہ وابستگی اور دلی تعلق کی بنا پر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ غور فرمائیں گے۔

جواب: مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ اہل دین کے ساتھ بھی چاہتے ہیں کہ وہی سلوک کیا جائے جو منکرین کے ساتھ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ آپ نے فقط نرمی ہی کو تقاضائے حکمت سمجھا ہے، حالاں کہ قرآن وسنت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے مان لینے والوں سے جب خلافِ حق باتوں کا صدور ہو تو ان کے ساتھ ان لوگوں کی بہ نسبت مختلف برتاؤ کیا جاتا ہے جو سرے سے حق کو نہ ماننے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول نے جہاں بعض مواقع پر انتہائی نرمی برتی ہوتی ہے اور وہ عین مقتضائے حکمت ہے، بعض دوسرے مواقع پر سخت لب ولہجہ بھی اختیار کیا ہے اور تیز وتند الفاظ سے بھی کام لیا ہے اور وہ بھی مقتضائے حکمت ہی رہا ہے۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے آخری تقریر میں کہی ہیں، کیا ان میں کوئی لفظ خلافِ حق تھا؟ نیز یہ کہ اس تقریر میں جو باتیں کہی گئی ہیں، کیا فی الواقع اس مرحلے پر ان کا کہنا ضروری نہیں تھا؟ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو آپ اسے ضرور تحریر فرمائیں۔ لیکن اگر آپ یہ

سمجھتے ہیں کہ باتیں جو کہی گئی ہیں، وہ حق تھیں اور لوگوں کو اصل مقتضیات دین کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس وقت انہیں صاف صاف بیان کرنے کی ضرورت بھی تھی تو پھر لب ولہجہ کی شکایت فضول ہے۔ میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں جذبات سے مغلوب ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ نرمی اور سختی جو کچھ بھی اختیار کرتا ہوں، جذبات کی بِنا پر نہیں، بلکہ ٹھنڈے دل سے یہ رائے قائم کرنے کے لیے اختیار کرتا ہوں کہ اس موقع پر واقعی ایسا کرنا چاہیے۔

آپ کے سامنے صرف اپنا قریبی ماحول ہے، مگر مجھ پر جس ذمہ داری کا بار ہے اس کی وجہ سے میں پوری جماعت اور تحریک کے حالات پر نگاہ رکھتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس موقع پر میں مقتضیات دین کو صاف اور واضح طریقے پر بیان نہ کر دوں اور ان لوگوں کی غلطی کو بالکل کھول کر نہ رکھ دوں جو فروع کو اب تک اصل دین بنائے بیٹھے ہیں اور دین کے اصلی تقاضوں سے غفلت برتتے رہے ہیں تو اس کا نتیجہ ہماری تحریک کے حق میں نہایت مہلک ہوگا۔ کیوں کہ اس قسم کا ایک اچھا خاصا گروہ ہماری تحریک سے محض سطحی طور پر متاثر ہو کر ہماری طرف کھنچنے لگا ہے لیکن اپنے سابق تعصّبات اور اپنی سابق غلطیوں میں سے کسی چیز میں بھی ذرّہ برابر ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ اُلٹا ہم سے طالب ہے کہ ہم بھی ان غلطیوں میں مبتلا ہو کر وہی خرابیاں برپا کریں جو یہ لوگ اصلاح کے نام سے کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر اس مرحلے پر میں صاف صاف ان کو متنبہ نہ کر دیتا تو مجھے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ جماعت کے اندر آ کر یا جماعت کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے جن سے کام بننے کے بجائے اُلٹا خراب ہوتا۔

دراصل جو باتیں میری اس تقریر کو سننے کے بعد اس گروہ کے لوگوں نے کی ہیں، ان سے تو مجھے یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ یہ لوگ فی الواقع دین کے کسی کام کے نہیں اور یہ کہ ان کا ہمارے قریب آنا ان کے دُور رہنے، بلکہ مخالفت کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ جو لوگ قرآن وسنت کے لحاظ سے میری تقریر کے اندر کوئی لفظ بھی قابل گرفت نہیں بتا سکتے، بلکہ اس کے برعکس جو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ جس چیز کو میں نے دین کا اصل مدعا بتایا ہے، واقعی قرآن وسنت کی رُو سے دین کا اصل مدعا وہی ہے، اور جن چیزوں کو میں مقدم ومؤخر کر رہا ہوں، وہ واقعی مقدم ومؤخر ہیں، مگر اس کے باوجود جنہیں میری اس تقریر پر اعتراض کرنے اور بددلی اور رنجش کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، وہ آخر کس قدر عزت کے مستحق ہیں کہ ان

کے جذبات وخیالات کا لحاظ کیا جائے۔ ایسے لوگ دراصل بندۂ حق نہیں، بلکہ بندۂ نفس ہیں۔ ان کے اندر خدا کا اتنا خوف نہیں ہے کہ اپنی غلطیوں پر متنبہ ہونے کے بعد اپنی اصلاح کریں اور حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اسے قبول کریں۔ اس کے بجائے وہ شکایت یہ کرتے ہیں کہ حق بات انہیں صاف صاف کیوں کہہ دی گئی اور کہنے والا انہی تعصّبات میں کیوں مبتلا نہیں ہے جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر منکرین میں سے ہوتے تو ہم ان کی رعایت کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے، مگر یہ لوگ اپنی اس نفس پرستی کے باوجود حق پرستوں کی صف اوّل میں کھڑے ہیں اور دین داری کا ڈھونگ رچاتے ہیں، اس لیے نہ یہ کسی رعایت کے مستحق ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے دُور ہو جانے پر کوئی ایسا شخص افسوس کر سکتا ہے جو حق کے لیے کام کرنا چاہتا ہو۔ یہ لوگ جو کچھ اب تک مذہب کے نام پر کرتے رہے ہیں، اس سے دین کی کوئی بات بن نہیں آئی ہے بلکہ کچھ بگڑتا ہی رہا ہے۔ اب میں نے چاہا کہ ان کو صاف صاف بتاؤں کہ اگر واقعی دین کی بات بنانا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ کیا ہے اور تمہارے فہم دین میں کیا قصور ہے جس کی وجہ سے تم اب تک کچھ نہیں کر سکے۔ اگر یہ لوگ واقعی دین کے ساتھ کوئی قلبی تعلق رکھنے والے ہوتے تو میری باتیں سن کر ان کی آنکھیں کھل جاتیں اور ان کے اندر توبہ وانابت کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن اس کے بجائے یہ لوگ اُلٹا مجھ سے بگڑ گئے اور اب بھی ان کے نزدیک مرجع یہی ہے کہ انہی تعصّبات اور جزئیات پرستیوں میں مبتلا رہیں جن میں اب تک مبتلا رہے ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ لینے کے بعد میں بہت خوش ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ فتنہ پسند گروہ قریب آنے کے بجائے دُور جا رہا ہے۔

اگر خدانخواستہ میں اس اجتماع کے موقع پر ان باتوں کو صاف صاف بیان کرنے میں کوئی کسر اُٹھا رکھتا تو البتہ یہ میری ایسی کوتاہی ہوتی جس پر میں بعد میں افسوس کرتا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان لوگوں کو یہ توفیق ہی نہیں دینا چاہتا کہ یہ لوگ اس کی دین کی کوئی خدمت کریں۔ جن فتنوں کی یہ خدمت کرتے رہے ہیں، اللہ نے بھی غالباً یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کو انہی فتنوں کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

ڈاڑھی کے متعلق جو آپ نے تحریر فرمایا ہے، اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ میں اپنے عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سنت بنا دینے تک نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو

اصطلاح شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا بدعت ہے اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم ومعروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریف دین کی موجب ہوئی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیے۔ پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کے قائم وجاری کرنے کے لیے آپ معبوث ہوئے تھے، درآں لے کہ جو اُمور آپ نے عادتاً کیے ہیں، انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز منشا نہ تھا۔ یہ تحریف جو دین میں کی جارہی ہے، اگر میں اس کے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں، اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا جس کے لیے اللہ کے ہاں مجھ سے سخت باز پرس ہوگی اور اس باز پرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آسکے گا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اخروی خطرے میں ڈالوں۔

سوال: ''حالیہ اجتماع[1] دارالاسلام کے بعد میں نے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب بھی اقامت دین کے فریضے کو فوق الفرائض بلکہ اصل الفرائض اور اسی راہ میں جدوجہد کرنے کو تقویٰ کی رُوح سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ ''مظاہر تقویٰ'' کی اہمیت کی نفی میں جو شدت آپ نے اپنی اختتامی تقریر میں برتی تھی وہ ناتربیت یافتہ اراکین جماعت میں ''عدم اعتنا بالسنۃ'' کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہوگی اور میں دیانتاً عرض کرتا ہوں کہ اس کے مظاہر میں نے بعد از اجلاس ملاحظہ کیے۔ اس شدت کا نتیجہ بیرونی حلقوں میں اوّلاً تو یہ ہوگا کہ تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔ کیوں کہ اس سے پہلے بھی بعض داعیین تحریک نے ''استہزاء بالسنۃ'' کی ابتدا اسی طرح کی تھی کہ بعض مظاہر تقویٰ کو اہمیت دینے اور ان کا مطالبہ کرنے میں شدت اختیار کرنے کی مخالفت جوش وخروش سے کی۔ دوسرے یہ کہ شرارت پسند عناصر کو ہم خود گویا ایک ایسا ہوائی پستول فراہم کردیں گے جو چاہے درحقیقت گولی چلانے کا کام ہرگز نہ کرسکے مگر اس کے فائر کی نمایشی آواز

---

[1] اشارہ ہے اسی اجتماع کی طرف جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ نیز جس تقریر پر اس خط میں گفتگو کی گئی ہے وہ بھی وہی تقریر ہے جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے، یعنی ''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں''۔

سے حق کی طرف بڑھنے والوں کو بدکایا جاسکے گا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملات میں عوام کے مبتلائے فتنہ ہوسکنے کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ بیت اللہ کی عمارت کی اصلاح کا پروگرام حضورؐ نے محض قوم کی جہالت اور جدید العہد بالاسلام ہونے کے باعث ملتوی کردیا تھا اور پھر اتنی احتیاط برتی کہ کبھی کسی وعظ اور خطبے میں لوگوں کو اس کی طرف توجہ تک نہیں دلائی، بجز اس کے کہ درون خانہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ نے اس کا تذکرہ ایک دفعہ کیا۔

علاوہ بریں مظاہر تقویٰ کے معاملے میں بھی دوسرے مسائل کی طرح خود داعی و مصلح اوّل صلوٰۃ اللہ علیہ کے ذاتی اسوہ کا اتباع ہی راہِ ہدایت ہے۔ اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد یہ روایت مدنظر رکھیے کہ "کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کث اللحیۃ یملا صدرہ" اس اسوۂ رسول کا اتباع کرتے ہوئے اگر آپ افراط وتفریط کی اصلاح کریں تو پھر اِدھر تو معترضین کو عیب چینی کے مواقع کم ملیں گے اور اُدھر مغربیت زدہ لوگوں کے لیے طغیان نفس وابائے اطاعت کے لیے کم تر مواقع حاصل ہوں گے۔ اسی بنا پر میں نے بوقت ملاقات عرض کیا تھا کہ آپ کا ذاتی تعامل باعفاء اللحیہ ودیگر پہلوؤں سے تکمیل ظواہر سنن بالیقین دین کے لیے مفید ہوگا۔ اس کا خیال ہے کہ اِدھر مذہبی مخالفین کا گروہ ہے جس کی اصلاح اس انداز سے کرنی ہے کہ مختلف اُمور دین کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر انہیں ان کی صحیح حیثیت اور ان کی صحیح اہمیت سے آگاہ کرنا ہے، لیکن دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جس کے نزدیک مظاہر تقویٰ کے معاملے میں سنت انبیا خصوصاً ڈاڑھی کی سنت کا اتباع کرنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ ذریعۂ نفرت وتمسخر ہے۔ اس گروہ کی اصلاح بھی تو آخر ہمارے ہی ذمے ہے، تو پھر کیا یہ فرض پورا کرنے کے لیے وہی اثباتی شدت زیادہ کارآمد نہیں ہے جو مظاہر تقویٰ کے تحفظ میں قدیم دین دار طبقے کی تلقینات کی رُوح تھی؟

مزید یہ کہ ہم اسلام کی اساسی حقیقتوں ہی کو جب پوری وسعت سے نہیں پھیلا چکے ہیں اور ابھی بے شمار بندگان خدا کے سینوں میں اُترنے کی مہم سر کرنی باقی ہے، تو کیا بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم فروعی اُمور کے کانٹوں سے دامن بچا کر بڑھتے جائیں اور اصل مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے اپنا ایک لحظہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ ہم لوگ جن کا دن رات واسطہ متلاشیانِ اعوجاج ومبتغیان فتنہ وتاویل سے ہے، صرف انھی زائد از ضرورت مسائل میں اُلجھ کر رہ جائیں گے اور اصل مقصد فوت ہوجائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ "مظاہر تقویٰ" وغیرہ قسم کے مباحث پر

تحریروں اور تقریروں میں درشت اور شدید طریقے سے بحث نہ کی جائے۔

جواب: آپ نے جو اُمور تحریر فرمائے ہیں، ان میں سے بیش تر کے جواب میں نے زبانی عرض کر دیے تھے اور اب بھی اپنے ان زبانی جوابات پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم ایک دو امور اس سلسلے میں ایسے ہیں جن پر مختصراً کچھ اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

آپ نے بارہا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مظاہر تقویٰ کے متعلق میں نے کوئی شدت برتی ہے جو سنت کے استہزا کی تمہید بن سکتی ہے اور بعض لوگوں کے لیے سنت سے بے اعتنائی کی موجب ہوئی ہے۔ کیا آپ براہِ کرم یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سے الفاظ تھے جن کو آپ شدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر الفاظ آپ کو یاد نہ ہوں تو آپ تھوڑا صبر فرمائیں۔ میں اپنی اس تقریر کو قلم بند کرا کے ان شاء اللہ عن قریب شائع کروں گا، اس وقت آپ اسے پڑھ لیجیے گا اور میرے وہ الفاظ نشان لگا کر میرے پاس بھیج دیجیے گا جن میں شدت پائی جائے۔ اسی طرح جن ارکان جماعت سے آپ کا تبادلۂ خیال ہوا اور آپ نے یہ محسوس کیا کہ میری اس تقریر کی بدولت ان میں سنت سے عدم اعتنا پیدا ہوا ہے، اگر آپ کو ان کے نام یاد ہوں یا کم سے کم یہی یاد ہو کہ وہ کس جگہ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے تو مجھے لکھ دیجیے تاکہ میں پوری طرح تشخیص کر سکوں کہ آیا ان کے متعلق آپ کا اندازہ غلط تھا، یا میرے متعلق ان کا اندازہ۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اس جماعت میں داخل ہونے کے بعد جن لوگوں کے چہرے پر ڈاڑھی آئی ہے، اتباع سنت کی تبلیغ کا دعویٰ رکھنے والے حضرات میں سے کسی کی تبلیغ سے ان کے چہرے کبھی ڈاڑھی سے مزین ہو سکتے تھے؟ حالاں کہ جماعت میں آنے کے بعد ہم نے کبھی ان سے ڈاڑھی یا دوسرے مظاہر تقویٰ کے متعلق اشارتاً بھی نہیں کہا کہ وہ فلاں چیز پر عمل کریں۔ باوجود اس کے ان لوگوں نے جو کبھی خواب میں بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کے چہرے پر ڈاڑھی ہو، خود بخود ڈاڑھیاں رکھ لیں اور اپنے فیشن تبدیل کرنے شروع کر دیے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم نے اسی اصل چیز کی تعلیم و تلقین پر سارا زور صرف کیا جو پوری دین دارانہ زندگی کی جڑ ہے، یعنی خدا اور رسولؐ کی وفاداری و اطاعت، اس کے بعد ہمیں کسی چیز کی الگ الگ تلقین کی ضرورت نہ رہی۔ جس جس بات کے متعلق ان کو معلوم ہوتا گیا کہ خدا و رسول کا حکم یہ ہے یا خدا اور رسول کو یہ پسند ہے، اسے اختیار کرنے پر وہ اپنے نفس کو مجبور کرتے چلے

گئے اور جس جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا گیا کہ یہ خدا اور رسولؐ کو ناپسند ہے اسے وہ خود بخود چھوڑتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں ان کے اندر وہی تبدیلیاں نہیں ہوئیں جو آپ لوگوں کے نزدیک اتباع سنت رہی ہیں۔ بلکہ وہ تبدیلیاں بھی ہوئیں جن کے مقتضائے دین ہونے کے تصور سے بہت سے دورِ آخر کے پیشوایان دین تک خالی رہے ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد جب آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ تیری باتوں سے لوگوں میں سنت سے عدمِ اعتنا اور استہزا کی کیفیت پیدا ہوگی یا ہوئی تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ میں نے تو مجبور ہو کر بلکہ تنگ آ کر صاف صاف بات اس وقت کہی ہے جب کہ ایک گروہ نے اپنے طرزِ عمل سے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ایک طرف تو وہ ہماری دعوت پر لبیک کہتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے، مگر دوسری طرف جزئیات کو اُصول وکلیات پر مقدم رکھنے اور تقریر، تحریر اور بحث وجدال کا سارا زور جزئیات پر ہی صرف کرنے کی پرانی بیماری اس کو ابھی تک لگی ہوئی ہے، اس سے مجھے خطرہ ہوا کہ اس بیماری کو لیے ہوئے اگر یہ گروہ جماعت میں آ گیا تو یہاں پھر وہی سب کچھ ہونے لگے گا جو باہر مذہبی میدان میں ہوتا رہا ہے۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہ بتا دینا پڑا کہ ایسے لوگ ہمارے کسی کام کے نہیں ہیں اور ہماری دعوت کا مزاج ان کی افتادِ مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اگر اپنے دماغ کی اصلاح کر کے اور اپنے فہم دین کو درست کر کے آنا چاہیں تو چشمِ ما روشن، دلِ ما شاد! لیکن اگر وہ جماعت میں آ کر یا جماعت میں رہ کر وہی سب کچھ کرنا چاہتے ہیں جو اس سے پہلے کرتے رہے ہیں اور جس کی بدولت دین کا کچھ کام بنانے کے بجائے کچھ بگاڑتے ہی رہے ہیں، تو بہتر ہے کہ وہ ہماری اس جماعت کو خراب کرنے کے بجائے اپنے پرانے مشاغل باہر ہی رہ کر جاری رکھیں۔

اس وجہ سے جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ میں نے کہا، خوب سوچ سمجھ کر ہی کیا اور کہا۔ خدا کے فضل سے میں کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے، نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلاف حق نہیں کہا اور جو کچھ کہا، اس کا کہنا خدمت دین کے اس مرحلے پر ناگزیر تھا۔ اس کے کہنے پر نہیں، بلکہ نہ کہنے پر مجھے اندیشہ تھا کہ میں ماخوذ ہوں گا۔ اب جو باتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں، ان میں بھی کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے جس سے مجھے اپنی اس رائے میں ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

میں نے آپ سے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب تحریراً بھی عرض کرتا ہوں کہ میں دین کو جو کچھ سمجھتا ہوں اور شریعت کے متعلق جو کچھ مجھے علم ہے، اس کی بنا پر میرا فرض ہے کہ نہ صرف اپنے قول سے بلکہ اپنے عمل سے بھی ان غلطیوں کی اصلاح کروں جو شریعت کے بارے میں لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ محض لوگوں کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس میں وہ مجھے رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اس غلط فہمی میں ڈالنا کہ شریعت کے اصل تقاضے وہی ہیں جو انہوں نے سمجھ رکھے ہیں، میرے نزدیک گناہ ہے۔ میں اسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط، بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنت رسولؐ یا اسوۂ رسولؐ ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا علیہم السلام معبوث کیے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے، بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آیندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

آپ کو اختیار ہے کہ میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں، لیکن جب تک میں اپنے مطالعۂ کتاب وسنت کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں، اس وقت تک آپ لوگوں کا یہ مطالبہ کرنا کہ میں اپنے عقیدہ وعلم کے خلاف آپ لوگوں کی مزعومہ سنتوں کو اختیار کروں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ پھر جب ایسا نہ کرنے کی صورت میں آپ لوگ مجھے یہ اندیشہ دلاتے ہیں کہ لوگ مجھ سے بدگمان ہوں گے اور یہ جیز ان کے اس دعوت کی طرف آنے میں مانع ہوگی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگ میری دعوت الی اللہ کے جواب میں مجھ کو اُلٹی دعوت الی الناس دینا چاہتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر حق اور غیر حق کی اتنی تمیز بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ میں جس چیز کی طرف انہیں بلا رہا ہوں وہ دین میں کیا مقام رکھتی ہے اور وہ جن باتوں کی وجہ سے میری دعوت کو قبول کرنے میں تامل یا انکار کر رہے ہیں، ان کا دین میں کیا درجہ ہے، ایسے ناحق شناس اور خدا پرستی کے بھیس میں اپنے تخیلات کو پوجنے والے لوگ آخر کس وزن اور قدر کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات اور ان کے

خیالات کی کوئی رعایت کی جائے۔ (ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل، جمادی الثانیہ ۶۴ھ، مارچ، جون ۴۵ء)

سنت اور عادت کا اُصولی فرق:

سوال: آپ نے مظاہر تقویٰ پر اپنے خیالات کی توثیق فرماتے ہوئے سنت و بدعت کے بارے میں یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں کہ ''سنت و بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو میں غلط، بلکہ دین میں تحریف سمجھتا ہوں جو آپ کے ہاں رائج ہیں''۔ عرض ہے کہ یہ مسئلہ دراصل اُصولی ہے۔ اس پر اگر اطمینان بخش فیصلہ ہو جائے تو بہت سے جزوی مسائل، بلکہ اکثر نزاعات اور ذہنی اُلجھنیں ختم ہو جائیں۔ لہٰذا سنت اور عادت کی ایسی جامع تعریف فرما دیجیے جو مانع بھی ہو اور اس کے ساتھ ہی بدعت کے متعلق بھی اپنی تحقیق سے ممنون فرمائیں۔

مزید توضیحِ مقام کے لیے عرض ہے کہ آپؐ کا یہ ارشاد کہ:

''آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے، اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنت رسولؐ یا اسوۂ رسولؐ ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسولؐ کو بعینہٖ وہ سنت سمجھ رہے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا علیہم السلام مبعوث کیے جاتے رہے'' میرے حسب حال نہیں ہے۔ اگرچہ میں مطلق اعفائے لحیہ کو سنت رسول سمجھتا ہوں، مگر اسے غرضِ بعثت و مقصدِ رسالت تو آج سے دس سال قبل بھی نہیں سمجھتا تھا اور نہ اب ہی اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ میں تو یہ یقین رکھتا ہوں کہ مقصد بعثت فقط ایک ہی سنت ہے اور وہ ہے اقامت دین، یا قیامِ اطاعت الٰہیہ۔ باقی اُمور علیٰ حسب المدارج اہمیت رکھتے ہیں۔ اس سنت کے ہم پلّا دیگر سنتیں تو کیا، فرائض شرعیہ مثلاً عمارت مسجد حرام اور سقایۃ الحاج وغیرہ اُمور بھی نہیں ہیں۔ اور میرے نزدیک یہی وہ سنت ہے جس کے احیا کو مأۃ شہید کے اجر کا ہم پلّا قرار دیا گیا ہے۔ ہاں حضورؐ کے ذاتی اسوۂ اعفائے لحیہ وغیرہ کو سنت مابعد الفرائض الشرعیہ تا حال سمجھتا ہوں اور اسی کی توثیق یا تصحیح کے لیے فوق الصدر استفسار پیش خدمت ہے۔

جواب: سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے، وہ سب سنت ہے۔ لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے

لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک شخص ہونے کے، جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کیے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں، اور ایسی صورت میں یہ فرق وامتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جز سنت ہے اور کون سا جز عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔

اُصولی طور پر یوں سمجھیے کہ انبیا علیہم السلام انسان کو اخلاق صالحہ کی تعلیم دینے اور زندگی کے ایسے طریقے سکھانے کے لیے آتے رہے ہیں جو فطرة اللّٰه التی فطر الناس علیها کے ٹھیک ٹھیک منشا کے مطابق ہوں۔ان اخلاق صالحہ اور فطری طریقوں میں ایک چیز تو اصل ورُوح کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسری چیز قالب ومظہر کی حیثیت۔ بعض اُمور میں رُوح اور قالب دونوں اسی شکل میں مطلوب ہوتے ہیں جس شکل میں نبی اپنے قول وعمل سے ان کو واضح کرتا ہے، اور بعض اُمور میں رُوح اخلاق وفطرت کے لیے نبی اپنے مخصوص تمدنی حالات اور اپنی مخصوص افتادِ مزاج کے لحاظ سے ایک خاص عملی قالب اختیار کرتا ہے اور شریعت کا مطالبہ ہم سے صرف یہ ہوتا ہے کہ ہم اس روحِ اخلاق وفطرت کو اختیار کریں۔رہا وہ عملی قالب جو پیغمبر نے اختیار کیا تھا، تو اسے اختیار کرنے یا نہ کرنے کی شرعاً ہم کو آزادی ہوتی ہے۔پہلی قسم کے معاملات میں سنت رُوح اور قالب دونوں کے مجموعے کا نام ہے، اور دوسری قسم کے معاملات میں سنت صرف وہ رُوح اخلاق وفطرت ہے جو شریعت میں مطلوب ہے، نہ کہ وہ عملی قالب جو صاحبِ شریعت نے اس کے اظہار کے لیے اختیار کیا۔

مثال کے طور پر دین کا منشا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ذکر کریں۔اس کے لیے نبی نے بعض اعمال تو ایسے اختیار کیے جن کی روح اور عملی قالب دونوں سنت ہیں اور دونوں کی پیروی ہم پر لازم ہے، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔اور بعض طریقے آپ نے ایسے اختیار کیے جن کی رُوح تو ہمارے اعمال میں ضرور پائی جانی چاہیے لیکن قالب کی ہو بہو پیروی کرنا لازم نہیں ہے، بلکہ آزادی دی گئی ہے کہ ہم اس رُوح کے ظہور کے لیے جو عملی قالب مناسب سمجھیں اختیار کرلیں، مثلاً دُعائیں اور وہ عام اذکار جو حضورؐ وقتاً فوقتاً کرتے تھے، ہم پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہم بعینہٖ انہی الفاظ میں دعائیں مانگیں جن الفاظ میں حضور مانگتے تھے۔البتہ سنت کی پیروی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان دعاؤں کے طرز اور ان کی معنوی خصوصیات کو ملحوظ رکھیں اور جن الفاظ میں بھی دعائیں مانگیں ان کے

اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کی رُوح موجود ہو۔ اسی طرح اذکار میں سنت صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے مختلف حالات واعمال میں خدا کو یاد کرتا رہے۔ اس سے استفادہ کرے، اس سے مدد مانگے، اس کا شکر ادا کرے اور اس سے طلب خیر کرے۔ اس سنت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں ان مختلف اذکار کے ذریعے سے ظاہر اور جاری کیا جو حدیث میں مذکور ہیں۔ اگر کوئی شخص ان اذکار کو لفظ بلفظ یاد کر کے اسی طرح ان کا التزام کرے جس طرح حدیث میں بیان ہوا ہے، تو یہ مستحسن یا مستحب تو ہو سکتا ہے لیکن اسے اتباع سنت کا لازمی تقاضا نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس سنت کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے کسی دوسرے طریقے سے اس پر عمل درآمد کرے اور اس کے لیے دوسرے الفاظ اختیار کر لے تب بھی وہ بدستور متبع سنت رہے گا اور اس پر خلاف وزریِ سنت کا الزام عائد نہ ہوگا۔

یہی فرق تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی ہے۔ مثلاً لباس میں جن اخلاقی وفطری حدود کو قائم کرنا نبی کے مقاصد بعثت میں تھا وہ یہ ہیں کہ لباس ساتر ہو، اس میں اسراف نہ ہو، اس میں تکبر کی شان نہ ہو، اس میں تشبّہ بالکفار نہ ہو، وغیرہ۔ اس روحِ اخلاق وفطرت کا مظاہرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس لباس میں کیا، اس میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کی پیروی جوں کی توں کرنی چاہیے، جیسے ستر کے حدود اور اسبالِ ازار سے اجتناب اور ریشم وغیرہ کے استعمال سے پرہیز۔ اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا، نہ ان کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ اس حدیث کی رو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہنتے تھے، اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لیے آیا کرتی ہیں کہ کسی شخص خاص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم ورواج کو دنیا بھر کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سنت بنا دیں۔

سنت کی اس تشریح کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاح شرعی میں سنت نہیں ہیں، ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے دینا من جملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

اب خاص اس ڈاڑھی کے معاملے کو لے لیجیے جس پر اس بحث کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس معاملے میں جس روحِ اخلاق وفطرت کو اللہ تعالیٰ ہماری عملی زندگی میں نمایاں دیکھنا چاہتا ہے، وہ

صرف یہ ہے کہ مونچھیں کم کی جائیں اور ڈاڑھی بڑھائی جائے۔ اسی کی ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی ہے اور یہی سنت ہے۔ اب رہی اس کی عملی صورت، تو اس کا کوئی تعین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد سے نہیں فرمایا، حالاں کہ کوئی امر اس میں مانع نہیں تھا کہ آپ اعفائے لحیہ کی مقدار اور قصِ شارب کی حد واضح طور پر مقرر فرما دیتے یا کم از کم یہی فرما دیتے کہ ڈاڑھی اور مونچھ کی ٹھیک وہی وضع رکھو جو میری ہے، جس طرح نماز کے متعلق حضورؐ نے فرما دیا کہ اسی طرح پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ پس جب کہ آپؐ نے اس معاملے میں کوئی حد مقرر نہیں کی اور صرف ایک عام ہدایت دے کر ہم کو چھوڑ دیا تو اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ جو روح اخلاق وفطرت اس معاملے میں مطلوب ہے، اس کا منشا پورا کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی اور ضروری ہے کہ آدمی ڈاڑھی رکھے اور مونچھ کم کرے۔ اگر کوئی مقدار بھی اس کے ساتھ ضروری ہوتی اور اس مقدار کا قائم کرنا بھی حضورؐ کے مشن کا کوئی جز ہوتا تو آپ ہرگز اس کے تعین میں کوئی کوتاہی نہ کرتے۔ مجمل حکم کے دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملے میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اعفائے لحیہ اور قصِ شارب کی جو صورت اپنے مذاق اور صورتوں کے تناسب کے لحاظ سے مناسب سمجھیں، اختیار کریں۔

اب اگر ایک شخص مونچھوں کے بال مونڈ ڈالتا ہو اور دوسرا شخص انہیں اس حد تک کُتر ڈالنا چاہتا ہو کہ کھانے اور پینے میں مونچھوں کے بال آلودہ نہ ہوں، تو ان دونوں کو اپنے عمل میں آزادی ہے اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرے نزدیک حکم کا منشا اُس طریقے سے پورا ہوتا ہے جو میں نے اختیار کیا ہے، لیکن ان میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی اس رائے کو تمام دوسرے انسانوں کے لیے شریعت بنانے کی کوشش کرے اور اس کے خلاف جو شخص عمل کر رہا ہو اس کو ملامت کرے۔ اگر وہ اسے شریعت بنانے کی کوشش کرے گا اور اس کے خلاف عمل کرنے والوں کو ملامت کرے گا تو یہ بدعت ہوگی۔ کیوں کہ جو چیز سنت نہیں ہے، اس کو وہ زبردستی سنت بنا رہا ہے۔ سنت صرف قصِ شارب ہے، نہ کہ اس کی کوئی خاص صورت جو کسی شخص نے اپنے استنباط واجتہاد سے یا اپنے رجحان طبع سے اختیار کی ہو۔

اسی طرح ڈاڑھی کے معاملے میں جو شخص حکم کا یہ منشا سمجھتا ہو کہ اسے بلا نہایت بڑھنے دیا جائے، وہ اپنی اس رائے پر عمل کرے، اور جو شخص کم سے کم یک مشت کو حکم کا منشا پورا کرنے کے

لیے ضروری سمجھتا ہو وہ اپنی رائے پر عمل کرے، اور جو شخص مطلقاً ڈاڑھی رکھنے والے کو (بلا قید مقدار) حکم کا منشا پورا کرنے کے لیے کافی سمجھتا ہو، وہ اپنی رائے پر عمل کرے، ان تینوں گروہوں میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ استنباط واجتہاد سے جو رائے اس نے قائم کی ہے، وہی شریعت ہے اور اس کی پیروی سب لوگوں پر لازم ہے۔ ایسا کہنا اس چیز کو سنت قرار دینا ہے جس کے سنت ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اور یہی وہ بات ہے جس کو میں بدعت کہتا ہوں۔

رہا یہ استدلال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا اور اس حکم پر خود ایک خاص طرز کی ڈاڑھی رکھ کر اس کی عملی صورت بتا دی، لہٰذا حدیث میں حضورؐ کی جتنی ڈاڑھی مذکور ہے اتنی ہی اور ویسی ہی ڈاڑھی رکھنا سنت ہے، تو یہ ویسا ہی استدلال ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حضورؐ نے ستر عورت کا حکم دیا اور ستر چھپانے کے لیے ایک خاص طرز کا لباس استعمال کر کے بتا دیا، لہٰذا اسی طرز کے لباس سے تن پوشی کرنا سنت ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو میرے نزدیک آج متبعین سنت میں سے کوئی شخص بھی اس سنت کا اتباع نہیں کر رہا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تمدن ومعاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اُصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لیے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں، کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے، اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جس میں آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لیے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

(ترجمان القرآن۔ صفر ۶۵ھ، جنوری ۴۶ء)

.....☆☆☆.....

عام مسائل

مفتوح فاتح کی عدالت میں:

سوال: آج کل جنگی مجرموں (War Criminals) کو کیفر کردار تک پہنچانے کا بہت چرچا ہے۔ اسلام کا اس ضمن میں کیا حکم ہے؟

جواب: یہ ''جنگی مجرم'' کی اصطلاح بھی ایک عجیب اصطلاح ہے جسے یورپ کے مکارانہ اخلاق نے موجودہ زمانے میں ایجاد کیا ہے۔ اس کی اصلیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک قوم جس سے کسی دوسری قوم کی لڑائی محض قومی اغراض کے لیے ہوئی تھی، جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے جنگی وسیاسی لیڈروں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ لڑائی دونوں طرف سے اقتدار اور منفعت طلبی کی خاطر ہوئی تھی۔ ایک دنیا پر پہلے مسلط ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے تسلط کو اور ان فائدوں کو جو اس جابرانہ وظالمانہ تسلط کی بدولت اسے حاصل ہو رہے تھے، محفوظ رکھے۔ دوسرا بعد میں آیا اور اس نے پہلے کے تسلط واقتدار کو اپنی راہ میں رکاوٹ دیکھ کر اسے ہٹانا چاہا۔ اس لحاظ سے دونوں کی لڑائی کسی پاکیزہ اخلاقی غرض پر مبنی نہ تھی۔ لیکن اب جب کہ ایک فریق غالب آ گیا تو وہ اپنے اس غصے اور اس انتقامی جذبے کو جو اس کے دل میں محض اس لیے بھڑکا تھا کہ مخالف فریق نے اس کے اقتدار کو چیلنج کیوں کیا، اخلاق کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم تو نہیں مگر ہمارا فریق مخالف ایک ڈاکو اور بدمعاش تھا اور اس نے دنیا کے امن کو غارت کیا (گویا کہ خود انہوں نے دنیا کے امن کو کبھی غارت نہیں کیا تھا) اس نے بستیوں پر ظلم ڈھائے (گویا کہ ظلم وستم ڈھانے کا ارتکاب خود ان سے کبھی نہ ہوا تھا)، اور اس نے عہد وپیمان توڑے (گویا کہ یہ ہمیشہ عہد وپیمان کے بڑے پابند تھے)، اس لیے اس کے بڑے بڑے لیڈر اور فوجی کمانڈر مجرم ہیں اور انہیں اسیر جنگ کے بجائے اخلاقی مجرم کی حیثیت سے سزا دی جانی چاہیے۔ حالاں کہ فی الواقع جس قومی جذبے میں یہ خود سرشار ہیں اور ان کے لیڈر جس جذبے کے تحت اپنی قومی سربلندی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں، اسی جذبے سے ان کی مخالف قوم کے لیڈر بھی سرشار تھے اور اپنی قوم کے لیے سربلندی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور کوشش کے طریقوں میں اخلاقی نقطۂ نظر سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ اب اصل

غرض تو صرف یہ ہے کہ حریف قوم کے اندر جن لوگوں نے قومی جذبے کو بھڑکایا تھا اور جو اس امر کی قابلیت رکھتے تھے کہ اپنی قوم کو منظم کر کے اور اس کے وسائل کو ترقی دے کر میدان مقابلہ میں استعمال کر سکیں، انہیں ختم کر دیا جائے، تا کہ یہ قوم ہمارے اقتدار اور ہمارے تسلط علی الارض کو چیلنج کرنے کے قابل نہ ہو سکے، لیکن اس خالص انتقامی جذبے کی گھناؤنی صورت کو اخلاقی عدل کی خوش نما نقاب سے چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

یہ اخلاقی عدل کا ڈھونگ جس طرح ایک فریق کام یاب ہو جانے کے بعد رچا سکتا ہے، بعینہٖ اسی طرح دوسرا فریق بھی فتح یاب ہونے کے بعد رچا سکتا تھا، اور اس صورت میں بھی اخلاقی حیثیت سے یہ ایک نہایت ذلیل قسم کا مکر و فریب ہی ہوتا۔ میں حیران ہوں کہ موجودہ تہذیب نے دنیا کی بڑی بڑی متمدن اور ذی عزت قوموں اور ان کے مدبرین سلطنت کے اندر کس قسم کی بے حیائی پیدا کر دی ہے اور ان قوموں کے علما و فضلا اور فلاسفۂ اخلاق کی اخلاقی حس کو کیسا کند کر دیا ہے کہ ایسی ایسی صریح مکارانہ باتیں علی الاعلان کی جاتی ہیں اور کسی کو ان کے اندر نہ شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ کوئی ان کے گھناؤنے پن کو محسوس کرتا ہے۔ کون صاحبِ عقل و تمیز آدمی، جو عدل کے معنی کا ذرہ برابر شعور رکھتا ہو، یہ تصور کر سکتا ہے کہ جنگ کا ایک فریق عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر دوسرے فریق کے ساتھ واقعی انصاف کر سکے گا؟ اگر انفرادی زندگی میں کسی مقدمے کا ایک فریق دوسرے فریق کے لیے جج نہیں بن سکتا تو قومی زندگی میں آخر ایک فریق جنگ دوسرے فریق جنگ کے لیے جج کیسے بن سکتا ہے؟

آپ پوچھتے ہیں کہ اسلام کا اس معاملے میں کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسلام اس قسم کے مکر کو مکر ہی سمجھتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے تمام وہ لوگ جو فریقین جنگ میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ آئیں، اسیر جنگ ہیں اور اسیران جنگ کے متعلق اسلام کے احکام جو کچھ ہیں وہ واضح طور پر میں اپنی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' میں بیان کر چکا ہوں۔ لڑائی کے بعد عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مجرم کی حیثیت سے دشمن کو بلانا اور اس کا فیصلہ کرنے کے لیے خود بیٹھ جانا بہت بڑے پیمانے کی اخلاقی بے حیائی چاہتا ہے اور اسلام وہ دین ہے جو حیا کو محض شعبۂ اخلاق ہی نہیں بلکہ شعبۂ ایمان قرار دیتا ہے۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل جمادی الثانیہ ۶۴ھ، مارچ جون ۴۵ء)

میدان جنگ میں قحبہ گری کے انتظامات اور اسلام:

سوال: آج کل جنگ میں جہاں سپاہیوں کو وطن سے ہزاروں میل دور جانا پڑتا ہے اور ان کی واپسی کم از کم دو سال سے پہلے ناممکن ہو جاتی ہے، سوشل قباحتیں مثلاً زنا وغیرہ کا پھیل جانا لازمی ہے، کیوں کہ جنگ کے جذبے کی بیداری کے ساتھ تمام جذباتِ سفلی بھی بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لیے یا قابو میں لانے کے لیے فوجیوں کے لیے رجسٹرڈ رنڈیاں بہم پہنچانے کی اسکیم پر عمل ہو رہا ہے اور ان کے دلوں کو خوش رکھنے کے لیے (WACI) دفتروں میں ملازم رکھی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قابل نفرین ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی تردید کے بعد اسلام اس عقدے کے حل کا کیا طریق بناتا ہے؟ کنیزوں کا سسٹم کس حد تک اس قباحت کا ازالہ کر سکتا ہے اور کیا وہ بھی ایک طرح کی جائز قحبہ گری (Prostitution) نہیں ہے؟

جواب: آپ کے سوال میں ایک پیچیدگی ہے جسے شاید آپ نے اپنا سوال تحریر کرتے وقت محسوس نہیں کیا۔ آپ جس مسئلے کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں، اس میں آپ کے پیش نظر تو ہیں موجودہ زمانے کی فوجیں اور ان کی ضروریات، لیکن اس کا حل چاہتے ہیں آپ اسلام سے۔ حالاں کہ اسلام جن فوجوں کی ضروریات کا ذمہ لیتا ہے وہ اُس کی اپنی فوجیں ہیں نہ کہ فسّاق وفجّار اور جبابرہ کی فوجیں۔

موجود زمانے کی فوجوں کا حال یہ ہے کہ انہیں محض لڑنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اور جو سلطنتیں ان کو تیار کرتی ہیں، ان کے پیش نظر کوئی پاکیزہ اخلاقی نصب العین نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنی فوج تیار کرتی ہیں تو ان کے اندر صرف وہ اخلاقیات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو قوم کا جھنڈا بلند کرنے اور بلند رکھنے کے لیے درکار ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان اخلاقیات میں طہارت اخلاق کے عنصر کا کوئی مقام نہیں ہے اور اگر وہ اپنی محکوم قوموں میں سے اپنی اغراض کے لیے فوجیں تیار کرتی ہیں تو انہیں صرف اس اخلاق کی تربیت دیتی ہیں جو پالتو شکاری کتوں میں پیدا کیا جاتا ہے، یعنی یہ کہ روٹی دینے والے کے وفادار رہیں اور شکار اس کے لیے ماریں، نہ کہ اپنے لیے۔ اس کے سوا کسی دوسرے اخلاق کی اہمیت سرے سے ان ''مہذب'' قوموں میں ہے ہی نہیں۔ رہیں زنا، شراب، جوا اور دوسری قسم کی بداخلاقیاں، تو نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک وہ ان کے ہاں پوری

قوم کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ نیز جب کہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر ہی یہ ہے کہ ''بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فوجوں میں کسی قسم کا اخلاقی انضباط پایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی فوجیں مار دھاڑ کے فنون میں تو انتہائی کمال کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن طہارت اخلاق کے نقطۂ نظر سے پستی کی اس حد تک گری ہوئی ہوتی ہیں جس کا مشکل سے ہی کوئی انسان تصور کرسکتا ہے۔ انہیں کھانے کے لیے دل کھول کر راشن دیا جاتا ہے۔ پینے کے لیے خم شراب کا منہ ہر وقت کھلا رکھا جاتا ہے۔ خرچ کرنے کے لیے پیسے بھی کافی دیے جاتے ہیں۔ پھر سانڈوں کی طرح انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنی خواہشات نفس جہاں اور جس طرح چاہیں، پوری کرتے پھریں۔ حکومتیں خود بھی ان کے لیے قحبہ خانے تیار رکھتی ہیں، قوم کی لڑکیوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ ملک وقوم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی خاطر اپنے جسم رضا کارانہ طور پر پیش کرنے کو قومی ایثار اور سرمایۂ افتخار سمجھیں۔ اور اس پر بھی جب ان انسانی نروں کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے نہیں ہو سکتے تو ان کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ انسانی گلے میں جہاں بھی مادائیں ان کو نظر آئیں، ان سے ''بزور'' یا ''بزر'' ان کے جسم خرید لیں یا چھین لیں۔ اس طرح جن فوجوں کو پالا گیا ہو، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب وہ دشمنوں کے ممالک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوں گی، تو وہاں ان کی شہوانی ضروریات کتنی بڑھ جاتی ہوں گی اور کس قیامت خیز صورت میں وہ پوری کی جاتی ہوں گی۔

اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ ایسی فوجوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کا حل اسلام کیسے بتا سکتا ہے۔ انہیں مغرب ہی کے مادّہ پرستانہ اخلاق نے پیدا کیا ہے اور ان کے شرم ناک مسائل کا حل بھی وہی پیش کرسکتا ہے۔ اسلام جن فوجوں کو تیار کرتا ہے وہ سیاسی ومعاشی جغرافیے کے اوراق پھاڑنے اور جوڑنے کے لیے تیار نہیں کی جاتیں، بلکہ صرف اس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دنیا اگر خدا کی اطاعت سے پھری ہوئی ہو اور دعوت وتبلیغ سے راہ راست پر نہ آئے تو اسے بزور شمشیر اتنا بے زور کر دیا جائے کہ وہ کم از کم فتنہ وفساد سے تو باز آجائے۔ اس متعین مقصود کے لیے جو فوجیں جہاد کرتی ہیں، ان کا جہاد فی سبیل النفس نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور وہ میدان جنگ میں بھی اسی جذبۂ عبادت کے ساتھ جاتی ہیں جس کے ساتھ وہ صحن مسجد میں قدم رکھتی ہیں۔ پھر اس میدان میں ان کو اُتارنے سے پہلے تزکیۂ نفس اور تطہیر اخلاق کے ایک پورے کورس سے انھیں گزارا جاتا ہے۔ انہیں

خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی سرکوبی کا کام سکھانے کے ساتھ یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو، اگر وہ خدا سے پھرا ہوا ہو، کس طرح زیر کریں اور دوسروں کو احکام الٰہی کا مطیع بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو کس طرح خدا کا مطیع بنائیں۔ انہیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ میدان جنگ میں قدم قدم پر خدا کو یاد کرتے ہوئے بڑھیں، عین لڑائی کی حالت تک میں نماز اپنے وقت پر ادا کریں اور دن ان کے گھوڑے یا ٹینک کی پشت پر گزریں تو راتیں مصلّے پر۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تربیت یافتہ فوج جو ایک پاکیزہ اخلاقی مقصد کے لیے لڑے اور اپنے عقیدے کے مطابق زمانۂ جنگ کو زمانۂ عبادت سمجھتی ہوئی رقبہ جنگ میں رہے، اس کی شہوانی ضروریات موجودہ فوجوں کی ضروریات جیسی نہیں ہوسکتیں اور نہ وہ اپنی ان ضروریات کو پورا کرنے میں ان فوجوں کی طرح آزادی کی خواہش مند ہوسکتی ہے۔

اگرچہ بعض روایات کے مطابق زمانہ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو جائز رکھا تھا (جسے عرب میں پہلے جائز سمجھا جاتا تھا) لیکن یہ بات ثابت ہے کہ بہت جلدی آپؐ نے اس کو ممنوع قرار دے دیا۔

اس میں شک نہیں کہ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوئی ہوں، ان سے تمتع کرنے کی اجازت اسلام میں دی گئی ہے، مگر سخت جاہل ہے وہ شخص جس نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ جس طرح آج کل ناخدا ترس فوجیں غنیم کے ملک میں گھسنے کے بعد عورتوں کو آزادانہ پکڑتی پھرتی ہیں اور جہاں جس سپاہی کو جو عورت مل جاتی ہے، وہ اس سے زنا کر ڈالتا ہے، ایسی ہی اجازت اسلام نے بھی اپنی فوجوں کو دے دی ہے۔ دراصل یہ اجازت چند شرائط کے ساتھ ہے:

اوّل تو عورتوں کا پکڑنا فی نفسہٖ مقصود کی حیثیت نہیں رکھتا کہ خواہ مخواہ فوج کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کی خاطر دشمن قوم کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح پکڑ لایا جائے، بلکہ عہد نبویؐ اور زمانۂ خلافت راشدہ کی نظیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں جب کبھی گرفتار ہوں گی، دو ہی صورتوں میں ہوں گی۔ ایک اس صورت میں جب کہ وہ دشمن کے لشکر میں ہوں۔ اس صورت میں جس طرح لشکر کے مرد گرفتار ہوں گے، اسی طرح عورتیں بھی گرفتار کر لی جائیں گی۔ دوسرے اس صورت میں جب کہ کوئی شہری آبادی اسلامی فوج کا مقابلہ کرے اور عنوۃً (By Storm) فتح ہو۔ اس صورت میں اسلامی فوج کے کمانڈر کو حق ہے کہ ضرورت سمجھے تو پوری آبادی کو گرفتار

کر لے۔ نیز اس صورت میں جو عورتیں اور بچے ایسے رہ جائیں جن کے سر پرست مرد مارے جا چکے ہوں، ان کو بھی اسلامی فوج اپنے چارج میں لے لے گی۔

پھر جو عورتیں ان صورتوں میں سے کسی صورت میں فوج کے قبضے میں آجائیں، انہیں کوئی سپاہی اس وقت تک ہاتھ نہیں لگا سکتا جب تک کہ اسلامی حکومت اس امر کا فیصلہ نہ کر لے کہ انہیں لونڈیاں بنا لینا ہے، اور جب تک کہ ان کو فوج میں باقاعدہ تقسیم نہ کر دیا جائے۔ اور یہ فیصلہ صرف اس صورت میں کیا جائے گا جب کہ غنیم سے فدیے پر، یا اسیران جنگ کے تبادلے پر کوئی معاملہ طے نہ ہوا ہو۔

اس طرح جو عورت حکومت کی جانب سے کسی مرد کی ملک میں باقاعدہ دے دی گئی ہو، اس پر صرف وہی ایک مرد تصرف کر سکے گا، اور اس کے لیے بھی قانون یہ ہے کہ استبرا رحم کی خاطر وہ اس وقت تک صبر کرے جب تک کہ اس عورت کو ایک مرتبہ حیض نہ آجائے۔ یہ اس غرض کے لیے ہے تا کہ اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اور اگر حاملہ ہو تو پھر وضع حمل تک اس کو صبر کرنا چاہیے۔ اس دوران میں وہ اس سے مباشرت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

پھر جو عورت اس طریقے سے کسی شخص کی ملک میں دی گئی ہو، وہ اگر اس سے تمتع کرے تو جو اولاد اس کے بطن سے پیدا ہوگی، وہ اس شخص کی جائز اولاد قرار پائے گی اور اس کی وارث ہوگی، نیز اولاد کی ماں بن جانے کے بعد پھر وہ شخص اس عورت کو بیچنے کا مجاز نہ رہے گا، اور اس کے مرنے کے بعد وہ خود بخود آزاد ہو جائے گی۔

یہ ہے جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں کے بارے میں اسلام کا اصل قانون۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام حالت جنگ میں اپنی فوجوں کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اخلاقی قیود میں کسی قسم کی ڈھیل پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام تو ان پر یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ جائز تعلق کے مواقع میسر آنے تک بہر حال وہ ضبط نفس سے کام لیں، خواہ ایسا موقع میسر آنے میں کتنی ہی مدت لگ جائے۔

دوسری طرف احادیث و آثار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ دیکھنا بھی اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ اس کے سپاہی زیادہ مدت تک اپنی عورتوں سے علیحدہ رہ کر، اور ان کی عورتیں زیادہ دیر تک اپنے مردوں سے جدا رہ کر کہیں بداخلاقیوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ یہی غرض تھی جس کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حرمت نساء المجاهدين على القاعدين كحرمتة امهاتكم

''مجاہدین کی بیویاں پیچھے رہنے والے مردوں کے لیے ویسی ہی حرام کی گئی ہیں جیسی خود ان کی مائیں ان پر حرام ہیں۔''

اور یہ کہ:

ما من رجل من القاعدين يخلف رجلًا من المجاهدين فى اهله فيخونه فيهم الا وقف له يزم القيٰمة فياخذ من عمله ما يشاء، فما ظنكم۔

''پیچھے رہ جانے والے مردوں میں سے جو شخص مجاہدین میں سے کسی کے بال بچوں میں اس کا جانشین ہو اور پھر وہ ان کے معاملے میں اس کے ساتھ کسی قسم کی خیانت کرے، وہ قیامت کے روز کھڑا کیا جائے گا اور اس مجاہد کو حق دیا جائے گا کہ اس شخص کے عمل میں سے جو کچھ چاہے لے لے۔ پھر تمہارا کیا گمان ہے کہ وہ اس کے پاس کچھ چھوڑ دے گا؟''

اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے مدینے کے دو خوب صورت نوجوانوں کو صرف اس لیے شہر سے منتقل کر دیا کہ آپ نے بعض عورتوں کی زبان سے ان کے حسن کی تعریف سن لی تھی اور آپ کو اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں یہ چیز ان عورتوں کے حق میں فتنہ نہ بن جائے جن کے شوہر جہاد پر گئے ہوئے ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص کسی عورت سے تشبیب[1] کرے گا، اس کو درّے لگائے جائیں گے۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے جب ایک مرتبہ ایک مجاہد کی بیوی کو اپنے شوہر کے فراق میں مشتاقانہ اشعار گاتے ہوئے سنا تو آ کر پہلا حکم جو آپ نے جاری کیا وہ یہ تھا کہ آیندہ سے سپاہیوں کو اتنی طویل مدت تک ان کی بیویوں سے جدا نہ رکھا جائے جس سے ان کے کسی بداخلاقی میں ملوث ہو جانے کا احتمال ہو۔ بالفاظ دیگر فوج میں رخصت (Furlough) کا طریقہ اسلامی حکومت میں جاری ہی اس غرض کے لیے کیا گیا تھا کہ حکومت اپنے سپاہیوں اور ان کی عورتوں کے اخلاق کی حفاظت کرنا چاہتی تھی۔

رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا کنیزوں کے استعمال کی اجازت ایک طرح کی جائز قحبہ گری نہ تھی؟ تو

---

[1] یعنی اپنے اشعار میں اُس سے اظہار عشق کرے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو آپ قحبہ گری کے معنی نہیں جانتے یا کنیزوں سے تمتع کا اسلامی قانون آپ کو معلوم نہیں ہے۔ قحبہ گری اس کو کہتے ہیں کہ ایک مرد کسی عورت سے اس کا جسم کرایے پر مستعار حاصل کرے۔ اور آج کل کی ''مہذب'' سوسائٹی میں ایک نئی قسم کی قحبہ گری بھی پیدا ہوگئی ہے جسے ''شوقیہ قحبہ گری'' (Amateurish Prostitution) کہتے ہیں، جس میں یہی عارضی تعلق باقاعدہ طے شدہ کرائے کے معاوضے میں نہیں بلکہ ہدیوں اور تحفوں کے بدلے میں قائم ہوتا ہے اور سوسائٹی میں خاتون محترمہ کی عزت بدستور برقرار رہتی ہے۔ رہا کنیزوں سے تمتع کا اسلامی قانون، تو وہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ دونوں کا مقابلہ کر کے آپ خود دیکھ لیں۔

(ترجمان القرآن، ربیع الاوّل، جمادی الثانیہ ۶۴ھ، مارچ جون ۴۵ء)

ایک ہندو دوست کا خط اور اس کا جواب:

''دیر کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ اس طویل غیر حاضری کی وجہ صرف یہ خیال تھا کہ آپ کی جملہ تصنیفات کو مطالعہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کو آپ کی خدمت میں وضاحت سے پیش کر سکوں گا۔ سو اب آپ کی کلیات کا ایک مرتبہ سرسری مطالعہ کر چکا ہوں۔ فی الحقیقت اپنے مشن کے لیے جہاں تک اخلاص کا تعلق ہے، میں نے آپ کو شری..... کے بعد واحد پہلا اور آخری رہنما پایا ہے۔ ''آخری'' کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ شری..... جی جنہیں میں موجودہ دور میں ہندوؤں کی عظیم ترین شخصیت سمجھتا ہوں، کی ذات بابرکات کے لیے اپنے دل میں انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود، میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے مشن کی تکمیل ہندو قوم پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہندو قومیت میں کون سے عناصر شامل ہیں یا ہندو پن کیا ہے؟ اس کی تسلی بخش تفسیر آج تک نہیں ہو سکی۔ گوشت خور بھی ہندو اور گوشت کا تارک بھی ہندو، وید مقدس کو ماننے والا بھی اور ویدوں کا منکر بھی ہندو، گائے کا پجاری بھی ہندو اور گائے کے چمڑے کے جوتے بنانے والا اور گائے کے چمڑے کے ساز وسامان سے گھر کو زینت دینے والا بھی ہندو، بتوں کا بجاری بھی ہندو اور بتوں کا کھنڈن کرنے والا بھی ہندو، آستک بھی ہندو اور ناستک بھی ہندو، کروڑوں دیویوں دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو اور توحید کا قائل بھی ہندو۔ جو قطعی ایک دوسرے کی ضد ہیں! بھائی پرمانند جی نے اسی لیے ہندو کی ایک دو حرفی تعریف کی ہے کہ ''جو اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہے، وہ ہندو ہے۔''

ویر ساور کرنے پولیٹیکل طور پر یہ تشریح کی ہے کہ ''جو اس دیش کو ماتری بھومی اور پنیہ بھومی سمجھتا ہے وہ ہندو ہے۔'' کچھ قوم پرست مسلمان اس ملک کو ماتری بھومی تو ماننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر پنیہ بھومی نہیں! تو اس طرح مسلمانوں کا سوال جوں کا توں رہا، اور ہندستان میں یہی ایک مسئلہ ہے جس کے حل کرنے پر ملک کے بہترین دماغ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے جو حل اس کا تجویز کیا ہے، وہ فی الواقع نہ صرف مسلمان نہ صرف ہندو، نہ صرف ہندوستان، بلکہ تمام بنی نوع انسانی کے لیے یکسانیت رکھتا ہے۔ چند ایک بنیادی اُصول ہیں جن کے ماننے والے ایک طرف، نہ ماننے والے دوسری طرف۔ ایک دوٹوک (Clear Cut) واضح پالیسی ہے۔ (اسی لیے میں نے آپ کے لیے ''آخری'' کا لفظ اوپر استعمال کیا ہے)۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی کلیات کا ایک نظر سے مطالعہ کر لیا ہے۔ آپ نے جو خطبات تعلیمی درس گاہوں میں پڑھے ہیں اور موجودہ یونی ورسٹیوں کو قتل گاہوں (Slaughter Houses) سے مناسبت دے کر حقیقت کا اظہار فرمایا ہے، اس تلخ صداقت کو بے نقاب کر کے آپ نے جس اخلاقی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا ہے، اِس کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔ میں آپ کے ان خطبات کا جب ان کانووکیشن ایڈریسز سے موازنہ کرتا ہوں جو ملک کی چیدہ چیدہ نام ور ہستیوں کے ہیں، جن کے نام کے ساتھ بڑے بڑے سائن بورڈ چسپاں ہیں، تو یقین فرمائیے، میری طبیعت متلانے لگتی ہے۔

ایک طرف آپ کا قرآن کریم سے روشنی لے کر انسان کی فلاح کی خاطر اسلام کو روشناس کرانے کے لیے دعوت عام دینا اور چھوٹے چھوٹے ٹریکٹوں ''سلامتی کا راستہ''، ''دین حق''، ''اسلام کا سیاسی نظریہ''، ''اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر'' وغیرہ لٹریچر کی اشاعت سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا میرے سامنے ہے اور دوسری طرف میں دیکھتا ہوں کہ میری قوم کے لیڈر راستی سے بھٹک کر ادنیٰ مقاصد (Minor Causes) پر اپنی اور ساری قوم کی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک طرف آپ کا خطبات جمعہ تحریر کر کے ایک ایک مسجد میں اپنے نصب العین کو پہنچانے کی سبیل پیدا کرنا ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کے گرسوامی گنیش دت اور پنڈت مدن موہن مالوی بنارس ہندو یونی ورسٹی میں مندر کی تعمیر کے لیے لاکھوں روپیا اکٹھا کرنے کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ آریہ سماج کے بارے میں تو میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر آج رشی دیانند کا ظہور ہو تو وہ سب سے پہلے

آریہ سماج کا سدھار کریں۔ کانگریس کے ہندو رہنماؤں کے بارے میں ایک مرتبہ لاہور کے عام جلسے میں چوہدری خلیق الزماں سابق صدر یو، پی مسلم لیگ نے فرمایا تھا کہ ہندوؤں کے بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔ ٹھیک یہی بات بھائی پرمانند جی فرماتے ہیں کہ ہندوؤں کی بدقسمتی سے شروع سے ہی کانگریس کے ایسے ہندو لیڈروں کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ ڈور رہی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے سیاست کے میدان میں طفل مکتب ہیں۔ جب میں ان حالات پر غور کرتا ہوں تو شاعر کے یہ الفاظ ایک آہِ سرد بن کر بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں ؎

یاسیت کی گرد میں لپٹا ہوا
راستہ تاریک ویراں اور اداس
زندگی بے کیف و رنگ و نور ہے
کارواں منزل سے کوسوں دُور ہے!

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے، میں بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ آپ کے پروگرام نے ملک کی دیگر تمام سیاسی تحریکوں پر سایہ (Shade) ڈال دیا ہے۔ آپ کا سارا لٹریچر دیکھ جانے کے بعد مجھے بجز ایک کے اور کوئی بھی مسئلہ ایسا نظر نہیں آیا جس میں دیانت داری کے ساتھ آپ سے اختلاف کرسکوں۔ مانتا ہوں کہ آپ کا پروگرام ہر پہلو سے مکمل (Complete) اور خود کفایت (Self Sufficient) ہے۔ صرف دو باتیں جو مجھے کھٹکتی ہیں، جناب کی خدمت میں عریاں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ کی تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' کے مطالعے کے بعد میرا یقین تھا کہ سنسکرت زبان پر آپ کا عبور ایک لازمی چیز ہے۔ مگر اس شام سیر کے وقت دوران گفتگو میں آپ کا یہ فرمانا کہ آپ نے سب کچھ ویدوں کے بارے میں انگریزی کتابوں سے لیا ہے، سچ مچ یہ جملہ سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص برقی رو کے چھو جانے سے جھٹکا سا محسوس کرتا ہے۔ جیسے آپ نے فرمایا تھا کہ ایچ جی ویلز کا اسلام کے بارے میں براہ راست کیا علم ہے جو انہوں نے اسلام اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پاکیزہ زندگی پر بے معنی نکتہ چینی کر کے رکھ دی، بعینہٖ آپ کا سنسکرت زبان سے براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے وید بھگوان کے بارے میں آپ کے احساسات مستند نہیں کہے

جاسکتے۔آپ تسلیم کریں گے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں آزادانہ ترجمہ کرنے پر بھی اصل منشا پورا نہیں ہوتا، چہ جائیکہ اسے پھر تیسری زبان میں پیش کیا جائے۔رشی دیانند نے تو مہی دھرا اور رسائن آچاریہ کے وید بھاشیہ کو ہی لغو ٹھہرایا ہے، پھر کہاں آپ ''میکس ملر'' اور دیگر یورپین اصحاب کے ترجمے سے رائے قائم کرتے ہیں۔کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ان نیک اور بلند خواہشات کا جو آپ ہندوؤں کے دل ودماغ سے تعصب دُور کر کے انہیں اسلام سے صحیح طور پر روشناس کرانے کے لیے اپنے دل میں رکھتے ہیں، احترام کرتے ہوئے میں مودبانہ گزارش کروں گا کہ آپ آیندہ اپنی ان کتابوں پر نظر ثانی فرماتے وقت، جن میں خاص طور پر ہندو لٹریچر کے حوالے (References) پائے جاتے ہیں، کسی ایسے شخص کی امداد حاصل کریں جو ہندوابھیاس اور ہندو لٹریچر پر براہ راست عبور رکھتا ہو۔(مجھے ذاتی طور پر ایسے ایک دو اصحاب سے قربت کا فخر حاصل ہے)۔اُمید ہے کہ آپ کی ذات مبارک پر میرا منشا واضح ہو گیا ہوگا۔

آپ نے رسالہ ''اسلام اور جاہلیت'' کے اخیر میں یہ فرمایا ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ جیسے افراد اس نظریے پر تیار ہو گئے تھے، نہ ان سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے، نہ اس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔'' اگر صاف گوئی پر معاف فرمایا جائے تو میں نہایت ادب وانکسار سے گزارش کروں گا کہ آپ نے یہاں طرف داری سے کام لیا ہے، یہاں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔میں صرف ایک بھگوان کرشن کی شخصیت پیش کروں گا، جن کی دوحرفی تقریر نے کہ:

فعل سے وابستگی واجب نہیں تیرے لیے
فرض کی تکمیل کر، خواہش صلہ کی چھوڑ دے

ویرارجن جیسے مجاہد پر ایک ہیبت کا عالم طاری کر دیا اور اس کے بازو میں برقی طاقت پیدا کر دی، اور اس تاریخی واقعے کی یادگار میں گیتا جیسی ممتاز کتاب ظہور میں آئی۔بڑے بڑے مخالف بھی کرشن بھگوان کی زندگی میں کوئی اخلاقی رخنہ نہ پیش کر سکے۔''بھگوان'' کا لفظ میں نے صفتی معنوں میں لیا ہے، اوتار کے معنوں میں نہیں۔آپ نے ایسی شخصیتوں کو نظر انداز کر کے اسلام سے پہلے کی تاریخ کے معاملے میں تعصب کا ثبوت دیا ہے۔سچ بات تو یہ ہے کہ میری آنکھیں ترستی رہیں کہ آپ کسی جگہ کسی ہندو کیرکٹر کا نمونہ پیش کریں، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

آپ نے ''ترجمان القرآن'' میں میرے خطوط اور اپنے جوابات شائع فرما کر اسلامی پریس کے لیے دل چسپی کا سامان مہیا کر دیا۔ دہلی کا ایک روزنامہ ''حکومت الٰہیہ اور پاکستان'' کے عنوان سے ان خطوط کا حوالہ دے کر آپ پر خوب برسا ہے۔ عجیب منطق ہے کہ دیدہ دانستہ عین اسلامی تعلیم کو جھٹلایا جا رہا ہے۔

مرحوم مولانا محمد علی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ''جہاں تک مسلمانوں کے ایمان کا تعلق ہے، میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے بہتر سمجھتا ہوں۔'' لیکن آپ نے اصل اسلام پیش کر کے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کو الم نشرح کر کے نہ صرف مسلمانوں کی، بلکہ تمام انسانیت کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ آپ کے اسلامی لٹریچر کے طفیل وہ محسوس کر رہے ہیں کہ انہیں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا ہو گئے ہیں۔ مگر میری گزارش یہ ہے کہ جب آپ کی حکومت الٰہیہ ہر فرد بشر کے لیے انسانیت کے ناطے سے یکساں جاذبیت رکھتی ہے اور آپ کا منشا بھی یہی ہے کہ بلحاظ مذہب و ملت اسے عوام تک پہنچایا جائے۔ پھر آپ اپنی مساعی (Struggle) کو صرف مسلمانوں تک کیوں محدود رکھتے ہیں؟''

جواب: آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ میں نے سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے براہ راست واقفیت کے بغیر محض یورپین ترجموں کے اعتماد پر اپنی کتاب میں ویدوں سے کیوں بحث کی۔ لیکن آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ ''الجہاد فی الاسلام'' بالکل میرے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے جب مذاہب کے معاملے میں میرا رویہ پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہ احتیاط طبیعت میں پیدا ہوئی تھی جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اب اگر میں اس کتاب کو دوبارہ لکھوں گا تو ہر اس چیز کی جس کی براہ راست واقفیت کا موقع مجھے نہیں ہے، از سر نو تحقیق کروں گا۔ آپ اگر اس تحقیق میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ کوئی ہندو عالم جو محض حامی دین (Defender of the Faith) ہی نہ ہو، بلکہ خود محقق بھی ہو اور محققانہ انصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہو، اگر میری کتاب کے اس حصے پر جو ہندوؤں سے متعلق ہے، تنقید کر کے مجھے بتائے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے تو اس سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں ہندو مذہب کے مقصد جنگ اور قوانین جنگ کو بناوٹ کے بغیر، جیسے کہ بجائے خود وہ ہیں، پیش کیا گیا ہو تو مزید باعث شکر گزاری ہوگا۔ ''بناوٹ

کے بغیر'' کی شرط میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ آج کل عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مذہب پر، جیسا کہ وہ بجائے خود ہے، ایمان نہیں رکھتے مگر قومی عصبیت کی خاطر اس مذہب کو اور اپنے مذہبی طرز عمل کو ''معقول'' بنانے کے لیے وہ اکثر موجودہ نظریات کے مطابق ایک نیا مذہب گھڑتے ہیں اور پرانے مذہب کے نام سے اسے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس طریقے سے سخت نفرت ہے خواہ اسے مسلمان برتیں یا ہندو یا کوئی اور۔ میرا خود بھی یہ طریقہ ہے اور میں پسند بھی صرف ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہوں جو اصل مذہب کو، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، ویسا ہی رہنے دیں اور ویسا ہی اسے پیش کریں، پھر اگر وہ ماننے کے لائق ہو تو اسے مانیں اور ماننے کے لائق نہ ہو تو اسے رد کر دیں۔

دوسری چیز جس کی آپ نے شکایت کی ہے، اس پر آپ کو بجائے مجھ سے شکایت کرنے کے خود ہندوؤں سے شکایت کرنی چاہیے تھی اور مجھے بھی اس معاملے میں ان سے شکایت ہے۔ انہوں نے خود اپنے بزرگوں کی سیرتوں کو محفوظ نہ رکھا بلکہ ان کی حقیقی زندگیوں کو افسانوں سے خلط ملط کر دیا، اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح انہوں نے بھی اپنی اخلاقی کمزوریوں کو درست ثابت کرنے کے لیے بدترین اخلاقی کمزوریاں اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کر دیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے جن بڑے بڑے اشخاص کی طرف نگاہیں اس توقع سے اُٹھتی ہیں کہ انہیں اخلاقی پاکیزگی اور عظمت انسانیت کے نمونے کی حیثیت سے لیا جا سکے گا، ان سب کے واقعات زندگی تاریخی حیثیت سے مشتبہ بھی ہیں اور افسانویت سے آلودہ بھی۔ اور جن مآخذ کی سند سے ان کے روشن پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں، انہی کی سند سے ایسے تاریک ترین پہلو بھی آ منے آجاتے ہیں جنہیں کسی بڑے انسان کی طرف منسوب کرنا تو درکنار، کسی گھٹیا انسان کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے، نہ کہ کسی قومی یا مذہبی تعصب کی وجہ سے میں مجبوراً عربی تاریخ کے صرف ایک ہی دور کو کمال انسانیت کے نمونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں، کیوں کہ وہ تاریخی حیثیت سے نہایت معتبر ہے۔ افسانویت کا اضافہ کرنے کی اگر اس میں کوشش کی بھی گئی ہے تو تاریخی تنقید کے ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے اس آلودگی کو پورے منصفانہ طریقے سے چھانٹ کر الگ کیا جا سکتا ہے، اور پھر وہاں کسی اخلاقی گندگی کا سرے سے نام ونشان ہی نہیں ملتا۔ یہ تو خدا کی دین ہے جس کے نصیب میں آ

جائے۔ اگر عرب نسل کے ایک مختصر گروہ کو یہ فضل نصیب ہوگیا تو اس پر کسی افسوس کی ضرورت نہیں اور نہ افسوس کرنے سے کچھ حاصل ہے۔ بلکہ اگر آپ ہندوستانی یا ہندو کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انسانیت کے لیے جو چیز قابل فخر ہے، اس پر آپ کو بھی اسی طرح فخر کرنا چاہیے جس طرح ایک عرب فخر کرسکتا ہے، کیوں کہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے جو تاج کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کو پہنایا گیا، وہ ہم سب انسانوں کے لیے تاج فخر ہی ہے، خواہ وہ کسی عرب انسان کے سر پر نظر آئے یا ہندوستانی انسان کے سر پر! (ترجمان القرآن۔ ربیع الاوّل، جمادی الاخریٰ ۶۴ھ، مارچ جون ۴۵ء)

گائے، تناسخ اور گرنتھ صاحب:

سوال: حسب ذیل اُمور کے متعلق اپنی معلومات کی روشنی میں حقیقت کی طرف رہنمائی فرمائیے:

(۱) گائے کی تعظیم وتقدیس جو ہندو بھائیوں میں رائج ہے، اس کی وجہ سے سیکڑوں دفعہ ہندو مسلم فسادات واقع ہو چکے ہیں۔ آخر یہ کیا مسحوریت ہے کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے معقول عالم موجود ہیں لیکن کوئی اس مسئلے کی نوعیت پر غور نہیں کرتا، حتیٰ کہ گاندھی جی جیسے فہمیدہ اور جہاں دیدہ لیڈر بھی مذہبیت کی اسی کشتی پر سوار ہیں جسے عوام نے ایسے ہی چند مسائل پر جوڑ ملا کر تعمیر کیا ہے۔ آپ اس گائے کی پوجا پر روشنی ڈالیں اور واضح کریں کہ یہ کب سے شروع ہوئی اور کیسے پھیلی، تو ممکن ہے کہ کچھ حق پسند ہندو مطمئن ہو جائیں اور اپنی قوم کی اصلاح کریں۔

(۲) تناسخ کا عقیدہ ہندو قوم کے ہاں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوؤں کے سوا کوئی دوسری قوم بھی اس کی قائل ہوئی ہے یا نہیں، تاہم یہ عقیدہ بھی سنجیدہ تنقید کا مستحق ہے۔

(۳) سکھ قوم کی مذہبی کتاب ''گرنتھ'' صرف اخلاقی پند ونصائح کا مجموعہ ہے اور اس کو بلحاظ موضوع ومباحث گلستاں، بوستاں وغیرہ کتابوں کی صف میں رکھا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب کے صالح اور صوفی منش بزرگوں کے ارشادات ونصائح اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ کتاب کو مدوّن کرنے والے کا منشا کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس منشا کے بالکل خلاف اب یہ ایک قوم کی الہامی کتاب بن گئی ہے۔ حالاں کہ اس میں نہ تو تمدنی مسائل سے بحث ہے، نہ معاشرت سے کوئی سروکار، نہ معاشیات وسیاسیات میں اس میں کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ مگر میری

عقل کام نہیں کرتی کہ تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ تک کیوں کر اس پر مطمئن ہیں؟

جواب: آپ نے جو استفسارات کیے ہیں، ان میں سے ہر ایک مفصل بحث چاہتا ہے، لیکن میرے لیے اس وقت ان چیزوں پر تفصیلی بحث کرنا مشکل ہے۔ نمبروار تینوں مسئلوں پر مختصراً اظہار خیال کرتا ہوں:

(۱) ہندو مذہب کے متعلق میری معلومات اتنی زیادہ وسیع نہیں ہیں کہ میں اس کے کسی مسئلے پر تحقیقی بحث کرسکوں، اور بغیر کافی معلومات کے کسی چیز پر بحث وتنقید کرنا مناسب نہیں ہے۔ جو تھوڑی بہت واقفیت مجھے حاصل ہے، اس کی بِنا پر میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ قدیم عہد میں جس کو ویدک عہد کہا جاتا ہے، گائے کی تقدیس کا عقیدہ موجود نہ تھا، یا اگر تھا تو بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ چنانچہ اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ اس دور میں ہندو گائے کی قربانی کیا کرتے تھے۔ علم الاقوام کی رو سے بھی یہ ثابت ہے کہ قدیم آریہ قوم خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب سے تعلق رکھتی تھی، جس میں گاؤ پرستی قطعاً مفقود تھی۔ بعد میں اس کا سابقہ اس مادری تہذیب سے ہوا جو ہندوستان کی دراوڑی قوموں اور عراق، مغربی ایشیا اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس تہذیب کی حامل اقوام زراعت پیشہ تھیں اور ان میں گائے کی تقدیس پائی جاتی تھی۔ پس تحقیق اسی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کو مصر سے گاؤ پرستی کی چھوت لگی۔ اسی طرح قدیم آریوں کو بھی یہ چھوت ہندوستان آکر لگی ہے۔ جہاں تک گائے کی پوجا کا تعلق ہے وہ تو ہندوؤں کے ایک خاص طبقے میں ہی پائی جاتی ہے لیکن اس کی تقدیس پوری ہندو قوم میں پھیلی ہوئی ہے، بلکہ جو لوگ ہندوؤں سے نکل کر اسلام یا عیسائی مذہب میں داخل ہوئے ہیں ان کے بھی ایک اچھے خاصے عنصر میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر محض اس لیے پایا جاتا ہے کہ ان کی تبدیلی ذہن پوری طرح نہیں ہوئی۔

خاص طور پر اس عقیدے کی تردید کے لیے کچھ کہنا غالباً مفید نہ ہوگا، کیوں کہ ایک غلط عقیدہ بہت سے دوسرے غلط عقائد کے ساتھ ہم رشتہ ہوتا ہے اور ایک ان سب کی اصل جڑ ہوا کرتی ہے۔ جب تک اصل اور شاخوں کے پورے سلسلے کی اصلاح نہ کی جائے، محض کسی ایک شاخ کو درست کرنے کی کوشش کام یاب نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے تمام غلط عقائد کی جڑ یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے نظام اور اُس میں اپنے صحیح مقام اور مالک کائنات کے ساتھ اپنے اور دوسری

موجودات کے تعلق کی نوعیت کو سمجھنے میں غلطی کرتا ہے۔اس ابتدائی اور بنیادی غلط فہمی سے نتیجے کے طور پر بے شمار غلط فہمیوں کا ایک سلسلہ پیدا ہو جاتا ہے جو سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہیں اور ایک پورا نظام فکر اور نظام زندگی پیدا کر دیتی ہیں۔اگر کوئی شخص اس بات کو سمجھ لے کہ اس ساری کائنات کا ایک ہی خالق اور ایک ہی مالک ومتصرف اور ایک ہی حاکم ومدبر ہے اور انسان دنیا میں اس کے خلیفہ ونائب کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے اور دنیا کی ساری چیزیں انسان کے لیے خادم بنائی گئی ہیں تو ایسا شخص شرک اور مخلوق پرستی اور مادّی یا روحانی یا خیالی چیزوں کی تقدیس کے ہر شائبے سے خود بخود پاک ہو جائے گا اور اس کے دل میں ایک خدا کے سوا کسی کی عبودیت اور کسی کی تقدیس کے لیے جگہ باقی نہ رہے گی۔پھر اگر کسی شخص میں صحیح قسم کا معقول پسندانہ رویہ (True Rationalism) موجود ہو تو وہ موروثی تعصّبات اور قومی ونسلی تعصّبات اور شخصی ونفسیاتی تعصّبات سے خود بخود خالی ہو جائے گا اور اپنی فکر اور اپنے عمل کو پوری بے لوثی کے ساتھ اس طریقے پر قائم کرے گا جو سراسر معقول ہو۔

آپ کو اس بات پر تعجب ہے کہ ہندوؤں میں بڑے بڑے معقول آدمی موجود ہیں جو وسیع علم اور وسیع نظر رکھتے ہیں مگر پھر بھی ان عقائد اور خیالات میں مبتلا ہیں جو سرسری نظر میں بھی جاہلیت کے عقائد اور خیالات محسوس ہوتے ہیں۔اس قسم کا تعجب آپ نے آخری سوال کے سلسلے میں بھی ظاہر کیا ہے۔لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ صورت حال محض کسی ایک قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔دنیا میں بہت سے غلط فکری اور اعتقادی نظام پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے پیروؤں میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور نہایت ذکی وفہیم اور اپنے مسلک کی مخصوص گمراہیوں کے سوا دنیا کے تمام دوسرے معاملات میں غایت درجے معقول ہوں گے۔اس کے باوجود ان لوگوں کا ایسی ایسی گمراہیوں میں مبتلا ہونا جن میں سے بعض تو ان کے مخصوص مسلک کو ماننے والوں کے سوا دوسرے تمام لوگوں کو صریحاً غیر معقول محسوس ہوتی ہیں، بظاہر ایک حیران کن معاملہ نظر آتا ہے۔مگر اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں رہتی۔اس صورت حال کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انسانوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اپنی عقل اور علم کے استعمال کو زیادہ تر اپنے دنیوی کاروبار اور اپنی جسمانی زندگی کے معاملات ومسائل تک محدود رکھتے ہیں اور اس کی کچھ زیادہ پروا

نہیں کرتے کہ جن فکری واخلاقی بنیادوں پرانہوں نے اپنی زندگی کوتعمیر کررکھا ہے یا جن بنیادوں پر تعمیر شدہ زندگی انہوں نے پہلے سے پائی ہے،ان کے متعلق تحقیق کرلیں کہ وہ بجائے خود صحیح بھی ہیں یا نہیں اوران سے بہتر بنیادیں کہیں ان کومل سکتی ہیں یا نہیں۔اوراس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں میں بہت ہی کم آدمی ایسے ہیں جونسلی،قومی،شخصی اورنفسانی تعصّبات سے آزادہوکرخالص علمی تحقیق اورخالص معقولیت پراپنے طرزفکروعمل کی بِنارکھنے کے لیے آمادہ ہوں،اگرچہ اس کے مدعی آپ کوبہت ملیں گے۔

(۲) تناسخ کاعقیدہ ہندوؤں کے سوابعض دوسری قوموں میں بھی پایا گیا ہےاوراب بھی پایا جاتا ہےاور ہندوستان سے باہربھی بعض فلسفیانہ نظاموں میں اس کانشان ملتا ہے۔لیکن ہندوستان میں جتنی زیادہ گہری جڑیں اس نے پکڑی ہیں،اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی۔اس عقیدے کی اصل دوسوال ہیں جن کوانسان نے ہمیشہ حل کرنے کی کوشش کی ہےاور جواکثراپنے آپ کومختلف شکلوں میں آدمی کے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ پہلاسوال یہ ہے کہ دنیا میں مصائب اورآفات (جن میں موت بھی شامل ہے) کیوں پائے جاتے ہیں؟سراسر راحت،لذت،خوشی،سلامتی وعافیت اورابدی زندگی ہی کیوں نہیں ہے؟اوردوسراسوال یہ ہے کہ انسانی اعمال کے طبعی نتائج تو اس دنیامیں ایک مقررضابطے کے تحت نکلتے نظرآتے ہیں،لیکن اخلاقی نتائج (جن کے ظاہرہونے کا انسانی فطرت آپ سے آپ مطالبہ کرتی ہے) کیوں ایک مقررضابطے کے مطابق ظاہرنہیں ہوتے؟اگروہ سب یاان کاایک جزظاہرہونے کے لیے رُکاہواہےتواس کے ظہورکی شکل کیا ہے؟

ان دونوں سوالات کے بہت سے مختلف جوابات مختلف فلسفیانہ نظاموں میں ملتے ہیں مگران سب پراس مختصربحث میں گفتگونہیں کی جاسکتی۔

ہندوستان کے فلاسفہ نے،جن کے تصورات آگے چل کرمذاہب کی شکل اختیارکرگئے،ان سوالات کوکرم اورتناسخ کے عقیدے کی شکل میں حل کیا ہے۔وہ اس دنیا کودارالامتحان کے بجائے ایک دارالعذاب اورایک طرح کے جیل خانے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں،حیات جسمانی کوفی الاصل مصیبت سمجھتے ہیں،اورجسم اورجسمانیات کے ساتھ انسان کے تعلق کواس بات کی وجہ قراردیتے ہیں کہ روح قیدِجسم سے چھوٹ چھوٹ کربار بارپھراسی قیدخانے میں واپس آتی ہے۔ان کے نزدیک مصائب اورآفات اورآلام اوراسی طرح خوش حالیاں اورکام یاب زندگیاں ان برے یا اچھے

اعمال کا نتیجہ ہیں جو رُوح نے اس وقت کیے تھے جب وہ موجودہ زندگی سے پہلے قید جسم میں تھی۔ مزید برآں ان کا خیال یہ ہے کہ اعمال کے جو اخلاقی نتائج ایک زندگی میں پوری طرح یا اپنی اصلی شکل میں ظاہر نہیں ہوتے، ان کے ظہور کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انسان اسی دنیا میں بار بار آ کر ان کو وصول کرتا رہے۔

یہ ایک وسیع نظام فکر ہے جس کا محض ایک خلاصہ میں نے یہاں بیان کیا ہے۔ یہ پوری زندگی کے متعلق انسان کے نقطۂ نظر اور زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اس کے رویے کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے تمام فکری و عملی نتائج پر یہاں بحث کرنا مشکل ہے۔ میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ دراصل یہ قیاسی فلسفوں (Speculative Philosophies) کے قبیل کی چیز ہے، اور اس قسم کے تمام فلسفیانہ نظامات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے سامنے جو مسائل آتے ہیں، ان کو وہ محض تخیل اور منطق اور اٹکل سے کسی ایسے طور پر حل کر لینے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کو اپنی حد تک اپنے پیش نظر مسائل کا اطمینان بخش اور دل کو لگتا ہوا جواب مل جائے، قطع نظر اس سے کہ علم، تجربہ، مشاہدہ اور آثار کائنات سے اس کی کوئی شہادت ملے یا نہ ملے۔ قیاسی فلسفی اس شہادت کی سرے سے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ اسے تو فقط اپنے پیش نظر سوالات کا ایسا جواب درکار ہوتا ہے جس پر وہ اور اس کے طرز پر سوچنے والے لوگ مطمئن ہو جائیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ایسے قیاسات کا امر واقعی اور حقیقت نفس الامری کے مطابق ہونا کچھ ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بہت کم توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ تو ایک تیر ہے جو اندھیرے میں اٹکل سے چلایا جاتا ہے، نشانے پر لگے یا نہ لگے۔ تیر چلانے والے کو خود بھی اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتا کہ کسی جگہ اس کے لگنے سے ''کھٹ'' کی آواز بھی آتی ہے یا نہیں۔ اس کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اپنے قیاس سے اس نے جس کو نشانے کا صحیح رُخ سمجھا، اس طرف اپنی حد تک ٹھیک ٹھیک شست باندھ کر تیر چلا دیا۔ ایسی تیر اندازی کا نشانے پر لگنا جتنا کچھ متوقع ہو سکتا ہے اتنی ہی کچھ قیاسی فلسفوں کے مطابق حقیقت ہونے کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔

بہت سے قائلین تناسخ خود بھی اپنے عقیدے کی اس خامی کو محسوس کرتے ہیں اور یہ اسی کی تلافی کی کوشش ہے جو کبھی کبھی اخبارات میں کسی ایسی بچی یا بچے کے ظہور کی اطلاع کی شکل میں رونما ہوتی رہتی ہے جو اپنے پچھلے جنم کے حالات سناتی یا سناتا ہے۔ لیکن اوّل تو یہی ایک عجیب

بات ہے کہ ایسے بچے صرف ہندوؤں ہی میں پیدا ہوتے ہیں اور ہندو اخبارات تک ہی ان کی خبر پہنچتی ہے۔ دوسری اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے فلسفے کی تائید میں تجربے و مشاہدہ کے فقدان کی تلافی کے لیے کہیں ایک آدھ ایسے بچے کی پیدائش کو کافی سمجھ لیتے ہیں، حالاں کہ ان کے نظریے کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ سارے ہی بچے ایسے پیدا ہوں۔ اگر وہ سزا یا جزا جو انسان کو ایک جنم کے اعمال کی بنا پر دوسرے جنم میں ملتی ہے، طبعی جزا و سزا نہیں بلکہ اخلاقی جزا و سزا ہے تو ہر انسان کو اس کا شعور حاصل ہونا چاہیے کہ وہ کس چیز کی جزا یا سزا پا رہا ہے، کیوں کہ تمام اخلاقی اعمال لازمی طور پر شعوری اعمال ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ بھی لازماً شعوری ہی ہونا چاہیے۔

اس طریق کے برعکس جن لوگوں نے عقل اور اس کے مطالبات اور فطرت اور اس کے تقاضوں اور آثار کائنات اور اس کے اشاروں کو نظر انداز کر کے ٹھیٹ ظاہر بینی کے ساتھ، اور ایک بڑی حد تک مذہبی طرز فکر سے انکار کی خواہش کے ساتھ، تجربہ و مشاہدہ پر اپنی رائے کی بنیاد رکھی ہے، انہوں نے پہلے سوال کی کنہ کو پہنچنے کی تو ضرورت ہی محسوس نہیں کی بلکہ اپنی تحقیق و رائے کو ''کیوں ہے'' کے سوال کے بجائے بڑی حد تک صرف ''کیا ہے'' کے سوال تک محدود رکھا۔ رہا دوسرا سوال، تو اس کے متعلق انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے نفس کو اس جواب ہی پر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سارے اخلاقی نتائج بس اسی دنیا کی ایک ہی زندگی میں ظاہر ہو لیتے ہیں جو موت پر ختم ہو جاتی ہے، اور اگر بالفرض وہ ظاہر نہیں ہوتے تب بھی بہر حال موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے کیوں کہ وہ براہ راست ہمارے تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آئی۔ لیکن انسان خواہ کتنی ہی کوشش کرے، اس جواب سے اس کے قلب کا اطمینان کسی طرح ممکن نہیں۔

اب رہا یہ امر کہ انبیا علیہم السلام کے لائے ہوئے دین میں ان دونوں سوالات کا کیا جواب ہے اور وہ کن دلائل سے معقول ترین جواب ہے، تو اس پر میں اپنے مضامین مثلاً ''رسالۂ دینیات''، ''اسلامی تہذیب اور اس کے اُصول و مبادی''، ''زندگی بعد موت''، ''اسلام اور جاہلیت'' اور تفسیر سورۂ اعراف میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں۔ لہٰذا یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ تمام مابعد الطبیعیاتی مسائل میں یہ اُصول مشترک ہے کہ ان کا کوئی حل بھی، خواہ وہ نفی کی شکل میں ہو یا اثبات کی شکل میں، ایسا قطعی

الثبوت نہیں ہوسکتا جیسے دو اور دو کا چار ہونا قطعی الثبوت ہے کہ اس کو مان لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایسے مسائل کا زیادہ سے زیادہ معقول حل، جس کے مطابق حقیقت ہونے کا اغلب گمان کیا جاسکتا ہو، صرف وہی ہوسکتا ہے جو عقل اور فطرت کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کو پورا کرتا ہو، جس کی طرف آثار کائنات اور تجربات ومشاہدات میں واضح اشارات پائے جاتے ہوں، جس سے زندگی کے ان تمام مسائل کو حل کیا جاسکتا ہو جو اس خاص مسئلے سے دور یا قریب کا تعلق رکھتے ہیں، جس پر عقلاً کسی اعتراض کی گنجایش نہ ہو، جس کے مان لینے سے کچھ دوسرے ناقابل حل مسائل نہ پیدا ہوتے ہوں، جنہیں کسی دوسرے طریقے سے رفع کرنا ممکن نہ ہو، اور جس کے خلاف کوئی ثبوت نہ دیا جاسکتا ہو۔ عقل زیادہ سے زیادہ ان سوالات کے کسی حل کو اغلب (Most Probable) سمجھنے کی حد تک ہی ہمیں لے جاسکتی ہے۔ اس کے آگے یقین حاصل کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ ایسا حل پیش کرنے والوں کی زندگیوں کو، ان کے پیش کردہ پورے نظام فکر وعمل کی معقولیت کو اور ان کے کام اور اس کے نتائج کو دیکھ کر ان پر ایمان بالغیب لایا جائے۔

(۳) گرنتھ صاحب کا مطالعہ میں نے خود تو نہیں کیا۔ جس حد تک میں نے مطالعہ کرنے والوں سے معلومات حاصل کی ہیں، ان کی بنا پر میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ سکھ مذہب محض ایک صوفیانہ مذہب ہے اور اس میں انسان کی زندگی کے بڑے بڑے مسائل مثلاً تمدن ومعاشرت، سیاست ومعیشت، عدالت وقانون، صلح وجنگ وغیرہ کے متعلق کوئی ایسی ہدایت موجود نہیں ہے جس پر دنیا میں ایک سوسائٹی اور ایک اسٹیٹ کی تعمیر ہوسکے۔ لیکن جس وجہ سے سکھوں کے تعلیم یافتہ اور صاحب فکر وفہم لوگ اپنی جستجوئے حق اور تلاش ہدایت کو معطل کیے ہوئے اس مذہب پر قانع ہیں، اس کی تشریح میں پہلے سوال کے جواب میں کر چکا ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ صفر ۶۵ھ، جنوری ۴۶ء)

علم ظاہر اور علم باطن:

سوال: اسلاف کی کتابیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''علم باطنی'' ایک ایسا علم ہے جو قرآن وحدیث وغیرہ علوم سے جدا محض ریاضات ومجاہدات سے حاصل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اُمت مسلمہ میں بکثرت انسان ایسے ہوئے ہیں جن کی زندگیوں میں یہ ترتیب ملتی ہے کہ پہلے انہوں نے

کتاب وسنت اور فقہ وکلام وغیرہ علوم کی تحصیل کی اور ان کو ''علم ظاہری'' کا خطاب دیا۔ اس کے بعد'' علوم باطنی'' کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے لیے سخت ریاضتیں کیں تب کہیں جا کر انہیں ''روحانی'' علوم حاصل ہوئے اور ان کو انہوں نے ہمیشہ علوم ظاہری پر ترجیح دی۔ براہ کرم کچھ اس پر روشنی ڈالیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے علم باطنی کی کیا تعریف ہے؟ اس کی حقیقت کیا تھی؟ اس میں کتنی رنگ آمیزیاں ہوئیں؟ کیا یہ علم ریاضات ومجاہدات کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا؟ اور کیا علوم ظاہری کی تحصیل کے بغیر بھی یہ علم حاصل ہوسکتا ہے؟

جواب: آپ کا سوال بہت تفصیل طلب ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر میں بارہا اپنے مضامین میں روشنی ڈال چکا ہوں۔ اگر چہ براہ راست اس خاص موضوع پر کچھ نہیں لکھا ہے۔

ظاہر سے مراد اگر احکام شریعت ہوں اور باطن سے مراد حکمت دین، یا ظاہر سے مراد احکام شرعی کی تعمیل ہو اور باطن سے مراد یہ ہو کہ آدمی اس اعتقادی واخلاقی روح کو سمجھے اور اپنے نفس اور سیرت وکردار میں اسے جاری وساری کرے جو احکام شرعی کی تعمیل میں درحقیقت مطلوب ہے، تو یقیناً ظاہر اور باطن کی یہ تفریق درست ہے، لیکن اس تفریق کے لحاظ سے باطن کا سرچشمہ بھی وہی ہے جو ظاہر کا سرچشمہ ہے، یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت۔ یہی تلاوت قرآن، یہی مطالعۂ سیرت پاک اور یہی صلوم وصلوٰۃ اور دوسرے شرعی احکام، جس طرح ظاہر کی اصلاح کے لیے کافی ہیں، اسی طرح باطن کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہیں۔ اس غرض کے لیے ان چیزوں سے الگ کسی مجاہدہ وریاضت کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اگر باطن سے مراد وہ فلسفے ہیں جو یونان اور روم اور ایران اور ہند سے آئے اور تصوف کے نام سے مسلمانوں میں رائج ہوگئے، تو وہ چاہے جس چیز کا باطن بھی ہوں، بہر حال اسلام کا باطن تو نہیں ہیں۔ جو مشقیں اور ریاضتیں اس غرض سے کی جاتی ہیں کہ ان فلسفوں کی رو سے جس شے کو ''حقیقت'' سمجھا گیا ہے، اس کا مشاہدہ حاصل ہو اور آدمی کشف اور خرق عادت اور صدور عجائب پر قادر ہو جائے، ان کی شکلیں چاہے اسلامی نماز روزے سے ملتی جلتی ہی کیوں نہ ہوں، اور ان میں اسلامی اصطلاحات کا استعمال ہی کیوں نہ کیا جاتا ہو، بہر حال وہ اسلامی عبادات کی تعریف میں نہیں آتیں، کیوں کہ ان کی غرض اسلامی عبادات کی غرض سے، اور ان کا ضابطہ سنت نبوی کے مقرر کردہ ضابطے سے مختلف ہے۔ (ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۶۵ھ، اپریل ۴۶ء)

حبش پر مسلمانوں کے حملہ آور نہ ہونے کی وجہ:

سوال: مصر کے مفتوح ہو جانے کے بعد خلافت راشدہ کے زمانے میں حبش کی جانب فتوحات کے لیے قدم کیوں نہ بڑھایا گیا؟ کیا محض اس وجہ سے کہ وہاں کے ایک سابق حکمران نے مسلمانوں کو پناہ دی تھی اور ایک سابق بادشاہ مسلمان ہو گیا تھا؟

جواب: اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس مکمل مواد موجود نہیں ہے۔ البتہ ابوداؤد اور مسند امام احمد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد ملتا ہے جس میں حبش کے متعلق آپ نے یہ پالیسی متعین فرما دی تھی کہ **دعوا الحبشه ما دعو کم** دوسری روایت کے الفاظ ہیں: **اترکوا الحبشة ما ترکو کم** یعنی ''حبش کے لوگ جب تک تمہیں چھوڑے رکھیں، تم بھی انہیں چھوڑے رکھو۔'' معلوم ہوتا ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے خلفائے راشدین کے دور میں حبش کی طرف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس ارشاد میں جو مصلحت تھی، ممکن ہے کہ اس میں کسی حد تک اس بات کا لحاظ بھی ہو کہ اہلِ حبش نے مسلمانوں کو ان کی مصیبت کے وقت جو پناہ دی تھی، اس کی رعایت کی جائے اور اپنی طرف سے ان کے خلاف پہل نہ کی جائے تا کہ دنیا کو کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہو سکے کہ مسلمان ایک احسان فراموش جماعت ہیں۔ لیکن اس کی ایک اور وجہ بھی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ حبش کی جغرافی پوزیشن اور اس کی سابق تاریخ کو دیکھتے ہوئے غالباً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خیال فرمایا ہوگا کہ اسلام کے جغرافی مرکز، یعنی حجاز کے تحفظ کے لیے حبش سے تعلقات کا درست رہنا ضروری ہے۔ اسی مصلحت سے آپ نے یہ ہدایت فرمائی ہوگی کہ جہاں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے، وہ پُر امن طریقے سے اس ملک میں پھیلائی جاتی رہے، لیکن جنگ سے حتیٰ الامکان پرہیز کیا جائے۔ (ترجمان القرآن۔ رجب شعبان ۶۳ھ، جولائی اگست ۴۳ء)

کائناتی اور حیاتی ارتقا:

سوال: آپ نے رسالہ ترجمان القرآن جلد ۴، عدد ۶، صفحہ ۳۹۶ تا ۳۹۷ میں اسلامی تہذیب اور اس کے اُصول ومبادی کے زیرِ عنوان نظام عالم کے انجام کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اسے سمجھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ ''اس نظام کے تغیرات وتحولات کا رُخ ارتقا کی جانب ہے۔ ساری گردشوں کا مقصود یہ ہے کہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں۔'' وغیرہ۔ آخر یہ کس قسم کا ارتقا

ہے؟ حیوانی زندگی میں؟ جماداتی یا انسانی زندگی میں؟ یا مجتمعاً تمام نظام عالم کی زندگی میں یہ ارتقا کارفرما ہے؟ نیز اگر ہر بگاڑ سے ارتقائی اصلاح ظاہر ہوتی ہے تو پھر تو وہی بات ہوئی جو ہیگل نے (Thesis and Antithesis) اور ڈارون نے (Survival of the Fittest) میں پیش کی ہے۔ براہ کرم مدعا کی وضاحت کیجیے۔

جواب: جس ارتقا کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ ہیگل اور ڈارون دونوں کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ ہیگل تو تصورات اور خیالات کی نزاع کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسی نزاع کی بدولت تصورات کا ارتقا ہوتا ہے اور ڈارون حیات کے ارتقا کا ذکر کرتا ہے اور اس کے نزدیک یہ ارتقا تنازع للبقا (Struggle for Existance)، انتخاب طبعی (Natural Selection) اور بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے اصول سہ گانہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف میں نے آپ کی دریافت کردہ عبارت میں جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ قدرت الٰہی کم تر درجے کی چیزوں سے تخلیق کی ابتدا کر کے بتدریج بلند تر درجے کی چیزیں پیدا کرتی رہی ہے۔ مثلاً جمادات پہلے پیدا کیے گئے، اس کے بعد نباتات، پھر حیوانات، اور حیوانات میں بھی کم تر درجے کے حیوانات پہلے پیدا کیے گئے اور پھر بتدریج اعلیٰ قسم کے حیوانات پیدا کیے جاتے رہے، یہاں تک کہ بلند ترین نوع یعنی انسان کو پیدا کیا گیا۔ قدرت کا یہی قاعدہ اس عالم پر بحیثیت مجموعی بھی جاری ہونا چاہیے، یعنی موجودہ نظام عالم بحیثیت مجموعی ناقص ہے، لہٰذا اس کے بعد ایک دوسرا نظام عالم ہونا چاہیے جو اس سے کامل تر ہو، اور اسی نظام کا نام عالم آخرت ہے۔ گویا میرے نزدیک موجودہ نظام عالم کے بعد عالم آخرت کا آنا قدرت کے قانون ارتقا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۴ھ، جنوری فروری ۴۵ء)

.....☆☆☆.....

معاشی مسائل

سرکاری نرخ بندی پر چند سوالات:

سوال: حکومت ایک جماعت کو کچھ اشیا ازاں قیمت پر مہیا کرتی ہے۔ دوسری جماعت کے افراد اس رعایت سے محروم رکھے جاتے ہیں۔ پھر کیا مؤخر الذکر طبقے کا کوئی فرد پہلی جماعت کے کسی فرد کے ذریعے حکومت کی اس رعایت سے استفادہ کرسکتا ہے؟ مثلاً مروّت یا دباؤ سے رعایت پانے والی جماعت کا کوئی فرد محروم رعایت جماعت کے کسی فرد کو کوئی چیز اپنے نام سے کم قیمت پر خرید کر دے سکتا ہے؟ یا اس کی کسی پرانی چیز کو نئی چیز سے بدلوانے کا شرعاً مجاز ہے؟

جواب: آپ نے جس معاملے کا ذکر کیا ہے وہ دراصل دو مختلف پہلو رکھتا ہے، جن کا حکم الگ الگ ہے۔

اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ کسی خاص گروہ کے لیے نرخوں میں جو رعایت کی گئی ہے، اس سے دوسرے لوگ فائدہ اُٹھائیں۔ یہ بات حکومت کے قانون کی رُو سے ناجائز ہو تو ہو، اخلاقاً اس میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت اس وقت قیمتوں کا چڑھاؤ کسی اصلی گرانی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض ایک مصنوعی چڑھاؤ ہے جو حکومت اور ملک کے سرمایہ دار طبقے نے بالکل ارادتاً پیدا کیا ہے[1]۔ عام باشندے اس گرانی سے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت کردیے گئے ہیں۔ بعض خاص گروہوں کے ساتھ جو رعایت کی جارہی ہے، درحقیقت تمام باشندگان ملک اس کے مستحق تھے، لیکن حکومت نے ملک میں عام گرانی پیدا کرکے اپنی خاص خدمات انجام دینے والوں کے لیے کچھ رعایتیں اس غرض سے رکھ دی ہیں کہ ان رعایتوں کے لالچ سے لوگوں میں ان خدمات کی طرف میلان پیدا ہو اور جن خادموں کے ساتھ یہ رعایات کی گئی ہیں وہ حکومت کے احسان مند ہوں۔ یہ غرض بجائے خود ناجائز ہے، اس لیے اگر کوئی اس بندش میں رخنہ پیدا کرے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کا مجرم ہوگا۔ تاہم زبردستی کا قانون ایک الگ چیز ہے جس کے لیے کسی اخلاقی بنیاد کی ضرورت نہیں۔

معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ پرانی چیز دے کر کسی خفیہ طریقے سے نئی چیز اس کے بدلے میں حاصل کرلی جائے۔ یہ البتہ ایک خلاف اخلاق فعل ہے جس سے ہر ایمان دار آدمی کو اجتناب کرنا چاہیے۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔

سوال: آج کل کنٹرول کا زمانہ ہے، مگر کوئی مال دکان دار کو کنٹرول نرخ پر دستیاب نہیں ہوتا۔ وہ چور بازار (Black Market) سے مال خرید کر گاہکوں کو سپلائی کرتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے مال کو کنٹرول ریٹ پر بیچنے میں اسے خسارہ ہوتا ہے۔ لامحالہ وہ زیادہ نرخ لگاتا ہے، مگر بعض لوگ اس خرید وفروخت کو بے ایمانی اور فریب قرار دیتے ہیں اور پولیس بھی اس پر گرفت کرتی ہے۔ اس باب میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب: اخلاقی حیثیت سے حکومت کو تسعیر (نرخ بندی) (Price Control) کرنے کا اس وقت تک کوئی حق نہیں ہے جب تک کہ وہ اپنی مقرر کردہ قیمتوں پر لوگوں کو مال دلوانے کا انتظام نہ کرے۔ اس چیز کا انتظام کیے بغیر محض اشیا کے نرخ مقرر کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے پاس اشیا کے ذخائر ہوں وہ ان کو چھپا دیں اور پھر یا تو ان کا بیچنا بند کر دیں یا قانون کی گرفت سے بچتے ہوئے خفیہ طور پر زائد قیمتوں پر بیچیں۔ جو حکومت اس نتیجے سے محض عقلاً ہی واقف نہیں ہے بلکہ تجربے اور مشاہدے کی رو سے بھی واقف ہو چکی ہے، وہ اگر اس پر بھی نرخ مقرر کرنے کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو اسے اخلاقاً یہ مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ عام خریدار اور بیوپاری اس کے مقرر کردہ نرخوں کی پابندی کریں۔

اس وقت یہ صریح طور پر نظر آ رہا ہے کہ عام خریدار اور چھوٹے چھوٹے خردہ فروش تاجر اگر بڑے صاحب ذخیرہ تاجروں سے حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر کوئی چیز لینا چاہتے ہیں تو انہیں کچھ نہیں ملتا، اور اگر وہ ان سے چور بازار کی قیمتوں پر مال خریدتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں رہتا کہ اسی مال کو آگے کھلے بازار میں حکومت کے مقرر کردہ نرخوں پر فروخت کر سکیں۔ ایسی حالت میں جو شخص اپنی روزی کمانے یا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے چور بازار سے مال خریدتا ہے وہ ہرگز کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب نہیں کرتا، اور اگر وہ آگے اس طرح کے مال کو سرکاری نرخ سے زیادہ قیمتوں پر فروخت کرتا ہے، تب بھی وہ کسی قاعدے سے اخلاقی مجرم نہیں ہے۔ ایسے شخص کو گرفتار کر کے اگر اسے سزا دی جائے گی تو یہ حکومت کا مزید ایک ظلم ہوگا۔

جماعت اسلامی کے ارکان میں سے جو لوگ تاجر ہیں، انہیں ایسی صورت پیش آئے تو ان کو چاہیے کہ کچہری میں وکیل کے بغیر حاضر ہوں، معاملے کی اس صورت کو صاف صاف مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دیں، اور پھر بلا تامل اس سے کہیں کہ اگر اس صورت حال میں بھی آپ کی حسِ

انصاف ہمیں مجرم سمجھتی ہے تو ضرور سزا دیجیے، ہم آپ کی ان عدالتوں سے بالاتر ایک عدالت سے توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار وہ ہمارا اور آپ کا انصاف ضرور کرے گی۔

''تسعیر'' کے سلسلے میں چوں کہ ذکر آ گیا ہے اس لیے میں مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں اسلام کی پالیسی کیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں قیمتیں چڑھ گئیں۔ لوگوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپ قیمتیں مقرر فرما دیں۔ آپؐ نے جواب دیا:

ان السعر غلأوہ ورخصہ بید اللّٰہ وانی ارید ان القی اللّٰہ ولیس لاحد عندی مظلمۃ یطلبنی بھا۔

''قیمتوں کا چڑھنا اور گرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے (یعنی قدرتی قوانین کے تحت ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ اپنے خدا سے ملوں تو اس حال میں ملوں کہ کوئی شخص میرے خلاف ظلم و بے انصافی کی شکایت کرنے والا نہ ہو۔''

اس کے بعد آپ نے مسلسل اپنے خطبوں میں، بات چیت میں، اور لوگوں سے ملاقاتوں میں یہ فرمانا شروع کیا کہ:

الجالب مرزوق والمحتکر ملعون

''ضروریات زندگی کو بازار میں لانے والا خدا سے رزق اور رحمت پاتا ہے اور ان کو روک رکھنے والا خدا کی لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔''

من احتکر طعامًا اربعین یومًا یرید بہ الغلاء فقد برئ من اللّٰہ وبری اللّٰہ منہ۔

''جس نے چالیس دن تک غلہ روک کر رکھا تا کہ قیمتیں چڑھیں، تو اللہ اس سے اور اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

بئس العبد لمحتکر ان ارخص اللّٰہ الا سعار حزن وان اغلاھا فرح۔

کتنا برا ہے وہ شخص جو اشیائے ضرورت کو روک کر رکھتا ہے۔ ارزانی ہوتی ہے تو اس کا دل دکھتا ہے، گرانی بڑھتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔

من احتکر طعامًا اربعین یومًا ثم تصدق بہ لم یکن لہ کفارۃ۔

''جس نے چالیس دن تک غلا کو روک رکھا، پھر اگر وہ اس غلاّ کو خیرات بھی کر دے تو اس گناہ کی تلافی نہ ہوگی جوان چالیس دنوں کے دوران میں کر چکا ہے۔''

اس طرح نبیؐ احتکار کے خلاف مسلسل تبلیغ و تلقین فرماتے رہے، یہاں تک کہ تاجروں کے نفس کی اصلاح خود بخود ہوگئی اور جو ذخیرے روکے گئے تھے، وہ سب بازار میں آ گئے۔

یہ شان ہے اس حکمران کی جس کی حکومت اخلاق فاضلہ کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اس کی اصل قوت پولیس اور عدالت اور کنٹرول اور آرڈی ننس نہیں ہوتے، بلکہ وہ انسانوں کے قلب و روح کی تہوں میں برائی کی جڑوں کا استیصال کرتا ہے، نیتوں کی اصلاح کرتا ہے، خیالات اور ذہنیتیں بدلتا ہے، معیارِ قدر بدلتا ہے اور لوگوں سے رضا کارانہ اپنے ان احکام کی پابندی کراتا ہے جو بجائے خود صحیح اخلاقی بنیادوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے یہ دنیوی حکام، جن کی اپنی نیتیں درست نہیں ہیں، جن کے اپنے اخلاق فاسد ہیں، اور جن کی حکمرانی کے لیے جابرانہ تسلط کے سوا کوئی دوسری بنیاد بھی موجود نہیں ہے، انہیں جب کبھی اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے جیسے آج کل درپیش ہیں، تو یہ سارا کام جبر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اخلاق کی اصلاح کرنے کے بجائے عامۃ الناس کے اخلاقی بگاڑ میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے، اسے بھی پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ، جولائی اکتوبر ۴۴ء)

سرکاری نرخ بندی کے سلسلے میں مزید ایک سوال:

سوال: آڑھت کے سلسلے میں ہم کو گندم خریدنی پڑتی ہے۔ گندم کی خرید و فروخت کے لیے اس وقت کنٹرول ریٹ مقرر ہے، لیکن اس مقررہ نرخ پر گندم ملنی ممکن نہیں ہے۔ منڈی کے تمام بیوپاری قدرے گراں نرخ سے خرید و فروخت کرتے ہیں مگر رجسٹروں میں اندراج کنٹرول ریٹ کے مطابق کرتے ہیں۔ دکان دار خرید و فروخت میں کنٹرول ریٹ سے زائد جو قیمت لیتا دیتا ہے، اس کا حساب دکان دار کے کھاتوں سے نہیں بلکہ اس کی جیب سے متعلق ہوتا ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ کیا اپنے استعمال کے لیے اور تجارت کے لیے اس ڈھنگ پر گندم خریدنا جائز ہے؟ نیز یہ امر بھی واضح ہونا چاہیے کہ اگر اس قسم کا کوئی معاملہ عدالت کی گرفت میں آ جائے جس کا ہر وقت امکان ہے، تو کیا یہ جائز ہوگا کہ عدالت میں بھی کھاتے کے جھوٹے اندراجات کے

مطابق بیان دیا جائے؟ واضح رہے کہ سچ بولنے سے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت عدالت مقررہ سزا نافذ کردے گی۔

جواب: ان حالات میں آپ اپنے استعمال کے لیے تو بہرحال گیہوں خرید ہی سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس صورت میں حساب رکھنے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ البتہ دکان کے معاملے میں ایک قباحت یہ ہے کہ جس بھاؤ سے فی الواقع مال خریدا جاتا ہے، اس کا کھاتے میں اندراج پُر خطر بنادیا گیا ہے۔ اگر اس کاروبار سے بچنے کی صورت ہو تو بہتر ہے، اور اگر آپ کے لیے بس یہی ایک ذریعہ معاش ہو، اور اس کے سوا کسی دوسرے کام سے رزق پیدا کرنا آپ کے لیے ممکن نہ ہو تو پھر جائز طور پر جو طریق کار آپ اختیار کرسکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اپنے حسابات اپنے واقعی لین دین کے مطابق ہی رکھیں، اور جب گرفتار کیے جائیں تو عدالت میں بالکل ٹھیک ٹھیک بیان دے دیں۔ عدالت سے صاف کہیے کہ اس حکومت نے اپنی غلط پالیسی سے پورے ملک کو جھوٹا بننے پر مجبور کردیا ہے۔ کنٹرول کیا تھا تو کنٹرول ریٹ پر اشیائے ضرورت کی فراہمی کا ذمہ بھی اس کو لینا چاہیے تھا۔ لیکن اس نے یہ انتظام تو کیا نہیں اور نرخ مقرر کردیے۔ اب اگر ہم اس کے مقرر کیے ہوئے نرخوں کے مطابق مال خریدنے پر اصرار کرتے ہیں تو بازار سے ضروریات زندگی فراہم کرنا غیر ممکن ہے۔ کنٹرول ریٹ کا نام لیا جائے تو بائع سرے سے مال ہونے کا ہی انکار کردیتا ہے، اور بلیک مارکیٹ سے اپنی ضروریات پوری کی جائیں تو آپ گلا دبانے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ بہرحال ہم نے جتنے میں مال خریدا ہے ہم تو وہی ظاہر کریں گے۔ آپ کے قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنے کی وہ پالیسی ہم اختیار نہیں کرسکتے جو ملک کے لاکھوں کروڑوں باشندوں نے مجبوراً اختیار کر رکھی ہے۔ آپ کا انصاف اگر ہمیں مجرم سمجھتا ہے تو ضرور سزا دیجیے۔ مگر انصاف کے جن اصولوں سے انسانی عقل عام واقف ہے، ان کی رُو سے تو کنٹرول آرڈی نینس جاری کرنے والے بزرگ سے لے کر نیچے تک وہ سارا عملہ اصل مجرم ہے جو ان احکام کو نافذ کر رہا ہے اور جس کی زبردستی سے سارا ملک جھوٹ اور بے ایمانی کے طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ ربیع الثانی ۶۵ھ، مارچ ۴۶ء)

بکری ٹیکس:

سوال: میں بزازی کا کاروبار کرتا ہوں۔ یکم اپریل ۴۸ء سے ہم پر بکری ٹیکس لگایا گیا ہے اور

ہمیں اختیار دیا گیا ہے کہ یہ ٹیکس اپنے گاہکوں سے وصول کرلیں۔لیکن عام دکان دار نہ تو گاہکوں سے یہ ٹیکس وصول کرتے ہیں اور نہ خود ادا کرتے ہیں۔اس سے بچنے کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنی روزمرہ کی اصل فروخت کا حساب وہ اپنے باقاعدہ رجسٹروں میں درج ہی نہیں کرتے۔حکومت کے کارندوں کو وہ اپنے فرضی رجسٹر دکھاتے ہیں اور جب ان کے رجسٹروں پر کسی شک کا اظہار کیا جاتا ہے تو رشوت سے منہ بند کردیتے ہیں۔دوسرے دکان داروں کے لیے تو یہ جعل اور رشوت آسان ہے مگر ایک ایمان دار تاجر کیا کرے؟ وہ خریداروں سے ٹیکس وصول کرتا ہے تو اس کا مال فروخت نہیں ہوتا کیوں کہ پاس ہی ایک ایسا دکان دار بیٹھا ہے جو ٹیکس لیے بغیر اس کے ہاتھ مال فروخت کرتا ہے۔اور اگر وہ خریدار سے ٹیکس وصول نہیں کرتا تو اسے اپنے منافع میں سے یہ ٹیکس دینا پڑتا ہے۔اس صورت میں بسا اوقات اسے کچھ نہیں بچتا بلکہ بعض چیزوں میں تو نفع اتنا کم ہوتا ہے کہ پورا نفع دے دینے کے بعد تاجر کو کچھ اپنی گرہ سے بھی دینا پڑ جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ ہم تجارت چھوڑ دیں یا فرضی حسابات رکھنے شروع کردیں؟

مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم جو صحیح حسابات رکھتے ہیں، انہیں بھی سرکاری کارندے فرضی سمجھتے ہیں۔کیوں کہ جہاں ۹۹ فی صدی تاجروں کے حسابات فرضی ہوں وہاں ایک فی صدی کے متعلق انہیں یقین نہیں آتا کہ اس کا حساب صحیح ہوگا۔اس لیے وہ اپنے قاعدے کے مطابق ہماری بکری کا اندازہ بھی زیادہ لگا کر ہم سے زیادہ ٹیکس کا مطالبہ کرتے ہیں۔اب کیا ہم اس سے بچنے کے لیے انہیں رشوت دیں؟ یا ایمان داری کی پاداش میں زائد ٹیکس کا جرمانہ بھی ادا کریں؟

جواب: یہ سوال دراصل ہم سے نہیں بلکہ حکومت سے کیا جانا چاہیے تھا۔اس کی پیدا کی ہوئی مشکلات کا حل خود اسی کو تجویز کرنا چاہیے۔اس نوعیت کے سوالات اگر اس کے پاس بھیجے جائیں تو کیا عجب کہ ذمہ داران حکومت کا ضمیر انہیں یہ سوچنے پر مجبور کردے کہ ان کے طریق کار میں آخر وہ کیا غلطی ہے جس کی وجہ سے ساری قوم کو جھوٹ، خیانت اور بے ایمانی کی تربیت مل رہی ہے۔

پھر یہ بھی ایک قابل غور معاملہ ہے کہ پہلے تو ایک بیرونی قوم اپنے مفاد کے لیے ہم پر حکومت کررہی تھی اس لیے لوگوں کو نہ اس پر اعتماد تھا، نہ اس سے کوئی دل چسپی اور محبت تھی، اور نہ اس کا کوئی حق وہ اپنے اوپر مانتے تھے۔مگر اب تو وہ پاکستان بن چکا ہے جس کے عشق میں ساری قوم برسوں سے دیوانی ہورہی تھی، اور اس کا انتظام وہ لوگ سنبھالے ہوئے ہیں جو قوم کے محبوب رہنما

تھے۔اب کیا بات ہے کہ اسی پاکستان کا نظم ونسق چلانے اور اسے مستحکم کرنے اور ترقی دینے کے لیے جب ٹیکس لگائے جاتے ہیں تو قوم کی بہت بڑی اکثریت ان کو ادا کرنے سے جی چراتی ہے؟ کیا اس کی وجہ محض قوم کی بے حسی اور نالائقی ہے؟ یا اس میں کچھ ہمارے سربراہ کاروں کی اپنی کوتاہیوں کا بھی دخل ہے؟ اگر ٹیکس دینے والا یہ دیکھتا کہ پاکستان کے لیے جس ایثار وقربانی کا اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے اُسی ایثار سے حکومت کے کارفرما حضرات خود بھی کام لے رہے ہیں اور اگر ٹیکس دینے والے کو یہ اطمینان ہوتا کہ جو کچھ اس سے لیا جارہا ہے وہ واقعی اس کی اور ملک کی فلاح وبہبود پر خرچ ہوتا ہے نہ کہ چند لوگوں کی عیاشیوں پر، تو کیا پھر بھی وہ اپنی حکومت کے مصارف میں حصہ لینے سے یوں ہی گریز کرتا؟

سائل کو اور اس جیسے تمام ایمان دار تاجروں کو میرا مشورہ ہے کہ اوّل تو وہ حکومت کے ٹیکس پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کریں۔لیکن اگر یہ بالکل ناممکن ہوجائے اور اس طرح ان کے لیے اپنا پیٹ پالنا بھی مشکل ہوجائے تو پھر صرف اس حد تک عام دکان داروں کی تقلید کرسکتے ہیں کہ اپنی بکری کا ایک حصہ رجسٹروں میں درج کریں اور ایک حصہ درج نہ کریں۔مگر سرکاری کارندوں کے سامنے انہیں جھوٹ نہ بولنا چاہیے، نہ ان کو رشوت دینی چاہیے۔ بلکہ ان سے صاف کہنا چاہیے کہ ہمارے حسابات ادھورے ہیں اور ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ آپ ہم پر مقدمہ چلادیں۔ پھر اگر مقدمہ چلایا جائے تو انہیں عدالت کے سامنے بازار کی تمام صورت حال صاف صاف بیان کردینی چاہیے اور یہ بھی بتادینا چاہیے کہ ان حالات نے ایک ایمان دار تاجر کے لیے روٹی کمانا کس قدر دشوار کردیا ہے۔کاش کچھ صاحب ہمت لوگ ایسے ہوں جو اس طریقے پر عمل کرگزریں۔ اس طرح قوم کے ضمیر کو یہ احساس دلانا آسان ہوگا کہ موجودہ غلط نظام حکومت کی وجہ سے کس طرح ایمان دار خطا اور بے ایمانی صواب بن کر رہ گئی ہے۔(ترجمان القرآن۔شوال ۶۷ھ، اگست ۴۸ء)

مکانوں کے کرایوں میں بلیک مارکیٹنگ:

سوال: جس مکان میں میں رہتا ہوں، وہ مجھ سے پہلے ایک کرایہ دار نے پینتالیس روپے ماہانہ کرائے پر مالک مکان سے اس شرط پر لیا تھا کہ دو ماہ کے نوٹس پر خالی کردیں گے۔ان کرایہ دار سے یہ مکان انھی شرائط پر میرے بھائی نے لیا اور میں بھی ان کے ساتھ رہنے لگا۔دو ماہ کے بعد

میرے کہنے پر مالک مکان میرے نام سے رسید کاٹنے لگے۔ آٹھ ماہ تک برابر ہم پینتالیس روپے ماہانہ ادا کرتے رہے اور اس دوران میں کرایے کی زیادتی ہمارے لیے سخت موجب تکلیف رہی اور کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ رینٹ کنٹرولر کے یہاں درخواست دے کر کرایہ کم کرایا جائے، مگر اس صورت پر دلی اطمینان نہ ہوسکا۔ ستمبر میں مالک مکان کو سفیدی وغیرہ کرانے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو کرایہ دار کے فرائض میں سے ہے۔ آس پاس کے لوگوں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے اپنا سکوت توڑتے ہوئے یہ کہا کہ دو ماہ بعد جواب دوں گا (شاید مکان خالی کرانے کی دھمکی اس جواب میں مضمر تھی)۔ اس پر کسی قدر تیز گفتگو ہوئی۔ جس کے نتیجے میں، میں نے رینٹ کنٹرولر کے یہاں کرایہ تشخیص کرنے کی درخواست دے دی۔ وہاں سے سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے کرایہ مقرر کر دیا گیا۔ مگر میرا ضمیر اس پر اب بھی مطمئن نہیں ہے۔

جن صاحب کے ذریعے یہ مکان حاصل ہوا تھا، ان کے اور ان کے عزیزوں کے کہنے سننے سے میں نے یہ صورت منظور کر لی کہ پینتیس روپے ماہوار میں اس شرط پر دوں گا کہ میں مکان میں جب تک چاہوں رہوں، لیکن اگر کبھی مالک مکان نے مکان خالی کرایا تو پھر شروع سے کرایہ سولہ روپے گیارہ آنے ماہوار کے حساب سے محسوب ہوگا اور زائد وصول شدہ رقم مالک مکان کو واپس کرنی ہوگی۔ مالک مکان فی الحال اس شرط پر راضی نہیں ہے، لیکن ظاہر بات ہے کہ ان کو راضی ہونا پڑے گا۔

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے میرے لیے کون سی صورت صحیح ہوگی؟ کیا میں پینتالیس روپے ماہوار دیتا رہوں یا سولہ روپے گیارہ آنے ادا کیا کروں؟ نیز کیا میرے لیے ضروری ہے کہ جب مالک مکان، مکان کے خالی کرنے کا مطالبہ کرے تو لازماً خالی کر دوں یا اس امرِ واقعہ کو جانتے ہوئے کہ اسے مکان کی خود ضرورت نہیں ہے بلکہ محض کرایہ بڑھانے کے لیے دوسرے کرایہ دار کو دینا مطلوب ہے، میرے لیے جائز ہے کہ میں مطالبے کی تعمیل سے انکار کر دوں؟ واضح رہے کہ مکانوں کی غیر معمولی قلت کی بنا پر پینتالیس کے بجائے پچاس روپے دینے والے کرایہ دار بھی مل سکتے ہیں۔

مجھے صاف اور دوٹوک جواب دیا جائے۔ جواب میں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ میں مالک

مکان کو نصیحت کروں یا اس کا ظلم اس پر واضح کروں، کیوں کہ یہ چیز بے کار ہوگی۔

جہاں تک مجھ سے ہوسکا ہے، حقیقت واقعہ جیسی کچھ ہے، میں نے صاف صاف عرض کردی ہے۔

جواب: موجودہ حالات میں بڑے شہروں کے مالکانِ مکان مکانات کی قلت سے اور لوگوں کی، خصوصاً مہاجرین کی حاجت مندی سے انتہائی ناجائز فائدہ اُٹھانے پر تل گئے ہیں۔ان کے ساتھ اگر کوئی شخص معاہدہ کرتا بھی ہے تو برضا ورغبت نہیں بلکہ اسی طرح کی مجبوری سے کرتا ہے جیسی سود پر قرض لینے والے حاجت مند کو لاحق ہوتی ہے۔اس لیے ایسے معاہدات کی کوئی اخلاقی قدر وقیمت نہیں ہے، اور درحقیقت یہ معاہدے اس وجہ سے ہورہے ہیں کہ حکومت کی طرف سے انصاف قائم کرنے اور لوگوں کی ضروریات منصفانہ شرائط پر بہم پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔اب اگر حکومت نے منصفانہ کرائے مقرر کرنے کا کوئی انتظام کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اور دوسرے لوگ اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔جس مکان کا کرایہ از روئے انصاف سولہ روپے ہے، اگر ایک مالک مکان اس کا کرایہ پینتالیس روپے وصول کرتا ہے تو یقیناً وہ لٹیرا ہے۔وہ آخر کون سا اخلاقی حق رکھتا ہے کہ آپ پر اس کا احترام کرنا واجب ہو۔کل جو شخص غلا کی کمی کی وجہ سے بلیک مارکیٹنگ کرنے پر اُتر آئے اور اپنا دس روپے من خریدا ہوا غلّہ اسّی روپے من کے حساب سے بیچنے لگے، تو کیا اس کے بھی حقوق ملکیت کا احترام کیا جائے گا؟ اگر ہم حکومت کی مدد سے ایسے لوگوں کو مناسب شرح پر اپنا مال بیچنے پر مجبور کرسکتے ہیں تو کیوں نہ کریں؟

اسلامی اُصولوں پر بینکنگ کی ایک اسکیم:

سوال: اسلامی اُصولوں پر ایک غیر سودی بینک چلانے کے لیے ایک اسکیم بھیجی جارہی ہے۔ اس کو ملاحظہ فرما کر ہماری رہنمائی کیجیے کہ کیا شرعاً یہ اسکیم مناسب ہے؟ یا اس میں کسی ترمیم واضافہ کی ضرورت ہے؟

اسکیم کا خلاصہ:

مسلمان زمیں دار، تجار اور اہل حرفہ مدتوں سے ساہوکاروں کے پنجے میں پھنستے جارہے ہیں اور ۲۵، ۲۵ فی صدی تک سود ادا کرتے کرتے تباہ ہورہے ہیں۔ بڑے تاجر اور زمیں دار تو خیر بری بھلی طرح پنپ بھی رہے ہیں لیکن کم استطاعت مسلمانوں کا حال سودی قرضوں نے بہت ہی پتلا

کردیا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ ایک مسلم بنک مسلمانوں کو غیر سودی قرض دینے اور زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام کرنے کے لیے قائم ہو۔ابتداءً ایک ضلع میں اس کا تجربہ کیا جائے اور پھر ملک بھر میں اسے پھیلا دیا جائے۔مجوزہ بینک کے لیے ذیل میں چند اُصول ومبادی درج کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ بینک قانون شریعت کا پورا پورا پابند ہوگا اور مفرد اور مرکب ہر طرح کے سود سے دامن پاک رکھ کے کاروبار کرے گا۔اس بینک سے حاجت مند مسلمانوں کو جائدادی کفالتوں پر اور تجارت پیشہ لوگوں کو مضاربت کے اُصولوں پر کاروبار چلانے کے لیے سرمایہ فراہم کیا جائے گا۔قرض دار کو از روئے معاہدہ اس امر کا پابند ہونا پڑے گا کہ وہ اپنے اموال اور کاروباری سرمائے پر ایک خاص عرصے تک باقاعدگی سے بینک کو زکوٰۃ ادا کرے۔اس طریقے سے ایک تو بلا سود سرمایہ حاصل کر کے مسلمان تاجر یا صناع اپنا کاروبار بخوبی چلا سکے گا اور اپنے سرمایے پر سود ادا کرنے والے غیر مسلم حریفوں کا بخوبی مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا، اور دوسری طرف نظام زکوٰۃ کے احیا میں وہ حصہ دار بنے گا جس کے مٹ جانے کی وجہ سے ہمارے عوام کی غریبی اور بے روزگاری لاعلاج ہو کے رہ گئی ہے۔

(۲) یہ بینک چوں کہ بہت ہی سادہ اور پاکیزہ طریق پر عوام سے معاہداتی معاملہ کرے گا، اس لیے یہ بآسانی ممکن ہے کہ حکومت سے قانونی طور پر اس کی توثیق کرالی جائے۔ضرورت ہو تو اسمبلی میں بل پیش کیا جا سکتا ہے۔پہلے زکوٰۃ کی جبری وصولی کے لیے ایک دفعہ حکومت کے سامنے سوال اُٹھایا گیا تھا تو یہ اس وجہ سے نامنظور ہوا تھا کہ اس سے مسلمانوں کی ''متوازی'' حکومت قائم ہوتی ہے۔لیکن ہماری تجویز کے مطابق زکوٰۃ کی جبری وصولی اس معاہدے کے زیر اثر ہوگی جو بینک اپنے مقروض سے طے کرے گا۔کوئی حکومت معاہداتی معاملات کی تصدیق سے انکار نہیں کر سکتی۔

(۳) یہ بینک زکوٰۃ اور دوسرے صدقات کی منظّم وصولی کا فریضہ بھی اپنے ذمے لیتا ہے۔انفرادی طور پر زکوٰۃ تقسیم کر دینا ایک ناقص طریقہ ہے۔شریعت اس کا اجتماعی نظم چاہتی ہے۔لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ مسلم پریس اور پلیٹ فارم کو ہماری اس تجویز کی پوری پوری پشت پناہی کرنی چاہیے۔

(۴) اس بینک کا منظور شدہ اور اداشدہ سرمایہ کم از کم ۵ لاکھ روپے ہوگا جو دس دس روپے کے

پچاس ہزار حصص پر مشتمل ہوگا۔ ۴لاکھ کا سرمایہ مناسب صنعتی کاروبار میں لگا کر کم از کم ۶ فی صدی سالانہ منافع حاصل کیا جاسکے گا۔ بقیہ ایک لاکھ ادنیٰ طبقے کے مسلمان کاری گروں اور پیشہ وروں کو قرضہ دینے کے لیے مخصوص کر دیا جائے گا۔ اور ابتداءً قلّت سرمایہ کی وجہ سے قلیل مدت کے لیے قرضے جاری کیے جائیں گے۔

انتظامی مصارف کو تجارتی سرمایے کے منافع کے ۲۵ فی صدی یعنی چھ ہزار روپیا سالانہ کے اندر اندر پورا کیا جائے گا۔ اخراجات کا تخمینہ حسب ذیل ہے:

ایک منیجر	۲۰۰ روپے ماہوار	۲۴۰۰ سالانہ
ایک اکاؤنٹنٹ	۱۰۰ روپے ماہوار	۱۲۰۰ سالانہ
ایک اسٹینوگرافر	۵۰ روپے ماہوار	۶۰۰ سالانہ
دو کلرک	۳۰ روپے ماہوار	۷۲۰ سالانہ
دو چپراسی	۲۰ روپے ماہوار	۴۸۰ سالانہ
متفرق مصارف		۱۲۰ سالانہ
میزان:		۶۰۰۰ روپے سالانہ

پہلے سال چند ہزار روپے فرنیچر، ٹائپ مشینوں اور آہنی الماریوں وغیرہ پر بھی صرف ہوں گے۔ اس لیے چار لاکھ کے کاروباری سرمایے پر متوقع ۶ فیصدی منافع میں سے ۲ فی صدی الگ کر کے بھی ہم ۴ فی صدی حصہ داروں میں تقسیم کر سکیں گے، اور اگر ان ''امانتوں'' کا منافع بھی محسوب کیا جائے جو ہمارے بینک کے حوالے کی جائیں گی، تو یقیناً حصہ داروں کو زیادہ منافع ملے گا۔

زکوٰۃ کی رقم کو ٹھیک ٹھیک شرعی مصارف پر صرف کیا جائے گا اور دوسرے صدقات بھی مسلمان عوام کی بہبود کے لیے ڈائریکٹروں کی ''شوریٰ'' کے مشورے سے خرچ کیے جائیں گے۔ ڈائریکٹروں کی تجویز کے مطابق منافعوں کا ایک مناسب حصہ فلاح عامہ کے فنڈ میں بھی شامل ہوتا رہے گا۔ ''شوریٰ'' صرف ایسے اصحاب پر مشتمل ہوگی جو با اثر ہوں اور مختلف طبقات کے مفاد کی نمایندگی کر سکیں۔

(۵) بنک اس کا مجاز ہوگا کہ میعادی امانتوں (Fixed Deposits) کی جو رقمیں اس کے پاس ہوں، انہیں صنعتی، تجارتی اور زرعی بیوپاروں میں لگا کر منافع حاصل کرے۔ ایسے منافع میں

سے ایک حصہ امانت داروں کو تقسیم کر دیا جائے گا تا کہ لوگوں میں ہمارے پاس امانتیں رکھوانے کی طرف رغبت پیدا ہو۔

ہمارے بینک کے امتیازات یہ ہوں گے کہ:

ا۔ اس کی اساس لوٹ کھسوٹ کی خواہش پر نہیں بلکہ خدمت اور تعاون کے جذبے پر ہوگی اور اس وجہ سے اس کی کشش ہر اس شخص کے لیے ہے جو نفع اندوزی کی جگہ خدمت کرنا چاہے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم۔

ب۔ یہ بینک ان لوگوں سے بھی زکوٰۃ جمع کرنے کی کوشش کرے گا جو بینک کے مقروض نہ ہوں، مگر زکوٰۃ کو اجتماعی نظم کے ساتھ ادا کرنا چاہیں۔

ج۔ ''میعادی امانتوں'' پر یہ بینک سود نہیں دے گا بلکہ اس کے بجائے ان امانتوں کو کاروبار میں لگا کر منافع حاصل کرے گا اور اس کا حصہ امانت داروں کو دے گا۔

جواب: غیر سودی بینک کی یہ تجویز بجائے خود تو بہت مبارک ہے اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس کا تجربہ ضرور کیجیے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس کاروبار کو زکوٰۃ وصدقات کے ساتھ خلط ملط کر دینا مناسب نہیں ہے۔ کاروباری ادارہ لازماً کاروباری نوعیت ہی کی فکر، صلاحیت اور مصروفیت چاہتا ہے، اور خیراتی ادارہ بالکل ایک دوسرے طرز کی فکر، صلاحیت اور مصروفیت کا طالب ہے۔ ان دونوں چیزوں کو خلط ملط کر دینے سے اندیشہ ہے کہ یا تو خیرات کا پہلو نقصان اُٹھائے گا یا کاروبار کا پہلو۔ لہٰذا اگر آپ زکوٰۃ وصدقات کی تنظیم چاہتے ہیں تو اس کے لیے الگ انتظام سوچیے اور اس غرض کے لیے ایک مستقل ادارہ بنائیے۔ جہاں تک اس کے انتظامی مصارف کا تعلق ہے، اس کا سوال شریعت نے خود ہی پہلے سے حل کر رکھا ہے۔ زکوٰۃ کی تحصیل اور خرچ کا انتظام کرنے والوں کو شرعاً مالِ زکوٰۃ سے تنخواہیں لینے کا حق ہے۔

بینک کے کام میں زکوٰۃ وصدقات کی وصولی اور خرچ کو شامل کر دینے سے ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ دینے والے بینک میں اپنی زکوٰۃ اس لالچ سے داخل کرائیں گے کہ وہاں سے ان کو قرضے حاصل کرنے میں آسانی ہو اور یہ اس ذہنیت کے بالکل خلاف ہے جس کے تحت ایک مسلمان کو زکوٰۃ دینی چاہیے۔

بینک کے لیے تو مناسب صورت یہی ہے کہ اس کو بالکل کاروباری اغراض کے لیے

کاروباری طریقوں پر چلایا جائے۔ مختصراً اس کے اُصول حسب ذیل ہونے چاہئیں:[1]

۱۔ اس کا سرمایہ دو طریقوں سے حاصل ہو۔ ایک شرکا کے حصص (Shares)، دوسرے ان لوگوں کی امانتیں (Deposits) جو سود نہیں لینا چاہتے۔

۲۔ وہ تین قسم کے کام کرے: ایک مختلف صنعتی اور تجارتی کاموں کو سرمایہ فراہم کرنا اور ''حصہ داری'' کے اُصول پر ان کے منافع میں سے اپنا متناسب حصہ وصول کر لینا۔ دوسرے بینک کاری کی وہ ساری جائز خدمات انجام دینا جو آج کل بینک عموماً انجام دیا کرتے ہیں، اور ان کی فیس وصول کرنا۔ تیسرے حاجت مند لوگوں کو قابل اطمینان ضمانتوں یا جائداد کی کفالتوں پر غیر سودی قرض دینا۔ اور اسی طرح تاجروں کی ہنڈیاں بلاسود بُھنانا اور ان کو کم مدت کے قرضے بلاسود دینا۔

۳۔ ان میں سے پہلی دو مدّوں سے جو آمدنی حاصل ہو، وہ بینک کے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد حصہ داروں اور امانت داروں، دونوں قسم کے لوگوں میں متناسب طریقے پر تقسیم کر دی جائے۔

۴۔ اس بینک میں روپیا رکھوانے اور اس کے حصص خریدنے کے لیے تین محرک کافی ہیں: ایک سود سے بچنے کی خواہش، دوسرے حلال منافع حاصل کرنے کی توقع، تیسرے اپنے مال کے تحفظ کا اطمینان۔ (ترجمان القرآن۔ شعبان ۶۵ھ، جولائی ۴۶ء)

کاروبار میں اسلامی اصولِ اخلاق کا استعمال:

سوال: ہم نے غلہ کی ایک دکان کھول رکھی ہے۔ موجودہ کنٹرول سسٹم کے تحت شہروں میں جمعیت ہائے تاجرانِ غلّہ (Foodgrains Association) قائم ہیں۔ ان جمعیتوں کو حکومت کی طرف سے کہا جا رہا ہے کہ وہ اپنی ''فوڈ گرین سنڈیکیٹس'' بنائیں۔ گورنمنٹ ہر سنڈیکیٹ کو اشیائے خوردنی کے پرمٹ دے گی اور آیندہ غلے کا سارا کاروبار صرف سنڈیکیٹ ہی کی معرفت ہوا کرے گا۔ نفع نقصان سب حصہ داروں پر تقسیم ہو جایا کرے گا۔ چنانچہ ہمارے شہر میں ایسی سنڈیکیٹ بن چکی ہے۔ پورے شہر کے غلّے کا کاروبار کئی لاکھ کا سرمایہ چاہتا ہے اور پورا چوں کہ سنڈیکیٹ کے شرکا فراہم نہیں کر سکتے، لہٰذا بینک سے سودی قرض لیں گے اور اس سودی

---

[1] اِس مسئلے پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ''سود حصہ دوم'' از مصنف

قرض کی غلاظت سے جملہ شرکا کے ساتھ ہمارا دامن بھی آلودہ ہوگا۔ ہم نے اس سے بچنے کے لیے یہ صورت سوچی ہے کہ ہم اپنے حصے کا پورا سرمایہ نقد ادا کردیں اور بینک کے قرض میں حصہ دار نہ ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر پورے کاروبار کو سنڈیکیٹ سنبھالنے کے قابل نہ ہوئی تو شاید سنڈیکیٹ ایسے سوداگر مقرر کردے جنہیں ایک چوتھائی سرمایہ سنڈیکیٹ دے گی اور بقیہ تین چوتھائی سوداگر اپنی گرہ سے لگائے گا اور اسے اختیار ہوگا کہ وہ ضروری سرمایہ بینک سے قرض لے، جس کا سود سنڈیکیٹ ادا کرے گی۔ اگر یہ صورت ہوئی تو ہمارا ارادہ ہے کہ ہم پورے کا پورا سرمایہ اپنی گرہ سے لگائیں گے اور بینک کے قرض اور سود سے اپنا کاروبار گندا نہ ہونے دیں گے۔ ہماری ان دونوں تجویزوں کو سنڈیکیٹ نے قبول کرلیا ہے کہ ان میں جو شکل بھی ہم چاہیں، اختیار کرسکتے ہیں۔ اس معاملے میں جتنے لوگوں سے ہماری تفصیلی گفتگو ہوئی اور ہمیں اپنے نصب العین کو ان پر واضح کرنے کا موقع ملا، وہ سب ہمارے اُصول کی بہت قدر کررہے ہیں۔ تمام بیوپاری ہندو ہیں اور بہت حیران ہیں کہ یہ کیسے مسلمان ہیں کہ اپنے اُصول کی خاطر ہر فائدے کو چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ ان پر ہمارے اس رویے کا اخلاقی اثر اس درجے گہرا ہوا ہے کہ اب وہ ہر کام میں ہم سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور ہم پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ ایک تازہ مثال یہ ہے کہ حال میں ایک جگہ سے دس ہزار بوری گندم خریدنے کا فیصلہ ہوا۔ ایک ہندو بیوپاری کو خریداری کے لیے مقرر کیا گیا۔ مگر ایسوسی ایشن کا اصرار تھا کہ اس کے ساتھ ہم میں سے بھی کوئی جائے۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہمیں کاروبار کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں ہے مگر ان کی ضد قائم رہی۔ آخر راقم الحروف کا جانا طے ہوگیا۔ بعد میں جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو ان میں سے ایک شخص نے صاف کہا کہ اور جو کوئی بھی جائے گا، کسی نہ کسی قسم کی بے ایمانی کرے گا مگر آپ لوگوں میں سے جو گیا وہ نہ خود بے ایمانی کرے گا نہ دوسروں کو کرنے دے گا۔

اس سلسلے میں حسب ذیل اُمور کے متعلق آپ کی ہدایت درکار ہے:

۱۔ سرِ دست تو ہمارا اور ان غیر مسلم تاجروں کا ساتھ نبھ رہا ہے، لیکن آگے چل کر اگر یہ ساتھ نہ نبھ سکا تو پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنی ایک الگ ''مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن'' بنالیں اور خدا کی نافرمانی سے ہر ممکن حد تک بچ کر اپنا کاروبار چلائیں؟

۲۔ ہندو مسلم مخاصمت کی وجہ سے یہاں کی فضا حد درجے خراب ہے، اور چوں کہ مارکیٹ پر

ہندوؤں کا قبضہ ہے اس لیے مسلمانوں کو ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں تکلیف پیش آرہی ہے۔ان حالات میں ایک مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن قائم کی گئی ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے حصے کا پورا کوٹا اسی کو ملے۔ہمیں بعض اصحاب مشورہ دے رہے ہیں کہ تم بھی اس میں شامل ہوجاؤ۔مگر ہمیں اس کے اندر قوم پرستانہ کش مکش کی بُو محسوس ہوتی ہے اور اسی بنا پر ہم اس سے پرہیز کررہے ہیں۔کیا یہ رویہ ہمارے لیے مناسب ہے؟

۳۔ بعض ہندو حضرات جو ہمارے اُصول واخلاق کے قدردان ہیں ہمیں بااخلاص یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اگر بینک سے آپ لوگ معاملہ نہ کریں گے تو سنڈیکیٹ کے ساتھ آپ کے لیے کام کرنا مشکل ہوجائے گا بلکہ علیحدہ ہوکر بھی آپ کاروبار نہ چلاسکیں گے۔سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ایسی صورت پیش آجائے تو ہم کیا کریں؟ کیا اضطراراً بینک سے معاملہ کرلیں؟

۴۔ پنجاب انڈسٹری ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے فیکٹری لگانے والوں کو سالانہ گرانٹ ملتی ہے،اس وجہ سے کہ گورنمنٹ انڈسٹری کو فروغ دینا چاہتی ہے۔ہمارے ہاں کھڈیوں کا کارخانہ بھی ہے۔ایک دوست کا مشورہ ہے کہ ہم بھی حکومت سے گرانٹ کی درخواست کریں۔مگر ہمیں شک ہے کہ ارکان جماعت ہوتے ہوئے ہم ایسا کرسکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ شرکت میں سود سے بچنے کا جو اہتمام کیا ہے،اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیے۔اگرچہ اس میں بہت سے نقصانات کے اندیشے آپ کے سامنے آئیں گے اور بہت سے فائدے بھی ہاتھ سے جاتے محسوس ہوں گے،مگر مآلِ کار میں اس کے اتنے فائدے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔اس سے نہ صرف آپ کی اپنی عاقبت درست ہوگی بلکہ ان شاءاللہ بہت سے دوسرے بندگان خدا کو بھی ہدایت نصیب ہوگی۔آپ نے خود بھی چند ہی روز کے تجربے سے دیکھ لیا ہے کہ اگر مسلمان ٹھیک ٹھیک اسلامی اُصولوں پر کام کرے تو اس کا کیسا زبردست اخلاقی اثر اس کے پورے ماحول پر چھا جاتا ہے۔

آپ نے جو سوالات کیے ہیں،ان کے جوابات حسب ذیل ہیں:

۱۔ اگر کبھی غیر مسلم شرکا سے آپ کا ساتھ نہ نبھ سکے اور آپ کو اپنی الگ تجارتی جمعیت بنانی پڑے تو اس کا نام ''مسلم ٹریڈنگ ایسوسی ایشن'' رکھنے کے بجائے (Fair Dealers Association) یا اسی طرح کا کوئی دوسرا اُردو یا انگریزی نام رکھیے اور اس میں شرکت کے لیے

انصاف و دیانت کے چند ایسے اُصول مقرر کیجیے جن کو دیکھ کر ہر شخص پکار اُٹھے کہ یہی انصاف ہے اور اسی کا نام ایمان دار ہے۔ مثلاً یہ کہ سود نہ لیں گے، سٹہ نہ کریں گے، ایک مقرر فی صدی سے زیادہ منافع نہ لیں گے، جعلی کھاتے نہ رکھیں گے، جھوٹ نہ بولیں گے، خریدار کو مال کا حسن و قبح ٹھیک ٹھیک بتا دیں گے، ناپ تول میں کمی نہ کریں گے، وغیرہ۔ پھر اس کا دروازہ ہندو، مسلمان، سکھ، سب کے لیے کھلا رکھیے اور اعلان کر دیجیے کہ ان شرائط پر جو شخص بھی ہمارے ساتھ شریک ہونا چاہے، ہو سکتا ہے۔

۲۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی کش مکش سے اپنے آپ کو قطعاً بالاتر رکھیے۔ اگر کبھی غیر مسلموں سے آپ کو تجارتی شرکت توڑنی پڑے بھی تو اسے قومی جھگڑے کی بنا پر نہ توڑیئے بلکہ اُصول کی لڑائی لڑ کر توڑیے۔ اور اُن سے الگ ہو کر جو تجارتی جمعیت آپ بنائیں، اسے بھی کسی ایک قوم کے تاجروں تک محدود نہ رکھیے، بلکہ چند معروف اُصولوں پر قائم کر کے صلائے عام کیجیے کہ جو ان اُصولوں کو قبول کرے، وہ ہمارے ساتھ شریک ہو سکتا ہے۔ آپ کی تو کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہر قوم کے لوگوں کے ساتھ آپ کا زیادہ سے زیادہ سابقہ اور معاملہ پیش آئے، تا کہ آپ اپنی اُصولی دعوت کو اور اپنے اخلاقی اثرات کو ہر طرف بے روک ٹوک پھیلا سکیں۔ قوم پرستانہ کشا کش میں اپنا دامن آپ نے اُلجھا لیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا آپ نے ہر چار دروازوں میں سے تین دروازے اپنے اوپر خود بند کر لیے۔

۳۔ اگر کسی وقت آپ دیکھیں کہ سودی معاملات کیے بغیر بڑے پیمانے پر تجارت نہیں کی جا سکتی تو بجائے اس کے کہ آپ ''اضطرار'' کے بہانے سودی معاملات کریں، بڑے پیمانے کی تجارت چھوڑ دیجیے اور صرف اُس تھوڑی سی بقدر کفاف آمدنی پر قناعت کیجیے جو اللہ حلال ذرائع سے آپ کو دے۔ آپ کا یہ سوال کہ ''کیا ہم اضطرار اً بینک سے معاملہ کر لیں؟'' بڑا ہی عجیب سوال ہے۔ کیا واقعی بہت کمانے کے لیے بھی آدمی کبھی مجبور و مضطر ہو سکتا ہے؟ کوئی بھوکا مر رہا ہو تو بے شک وہ کہہ سکتا ہے کہ میں حرام کے چند لقمے حاصل کرنے پر مجبور ہوں، مگر کھاتا پیتا آدمی کہے کہ حرام کے ہزاروں روپے کمانے پر مجبور ہوں تو یہ بالکل ایک نرالی قسم کی مجبوری ہوگی۔ ایسے حیلوں سے حرام کو اپنے لیے حلال کرنے کا تصور بھی آپ کے ذہن میں کبھی نہ آنا چاہیے۔ پھر ذرا یہ بھی تو سوچیے کہ اپنے اصولوں کی اس قدر ''شوراشوری'' کے بعد آخر کار آپ نے یہ بے نمکی دکھائی

کہ ذرا سے تجارتی مفاد کو نقصان پہنچتے دیکھ کر بینک کے دروازے پر توبہ توڑ بیٹھے تو آج تک آپ نے جو کچھ کیا ہے، اس سب پر کس بری طرح پانی پھر جائے گا۔ یہ حرکت کر کے تو گویا آپ خود ہی یہ ثابت کر دیں گے کہ اسلام کے اُصول صرف بیان کرنے کے لیے ہیں، برتنے کے لیے نہیں ہیں۔ جو ہندو دوست آپ کو یہ مشورہ دے رہے ہیں، ان کو جواب دیجیے کہ آپ کی ہم دردی کا بہت شکریہ، مگر بجائے اس کے کہ ہم آپ کا مشورہ قبول کر کے اپنے اُصولوں کے خلاف سودی کاروبار میں مبتلا ہوں، ہم آپ کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر ایک مرتبہ آپ غیر سودی اُصولوں پر لین دین کرنے کا تجربہ کر دیکھیں۔ اس تجربے سے آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیز ہمارے اور آپ کے اور سب لوگوں کے لیے سودی کاروبار سے بہتر ہے۔ اگر آپ تعاون کرنے پر آمادہ ہوں تو ہم ایک غیر سودی بینک قائم کر کے اور کام یابی کے ساتھ اس کو چلا کر عملاً اس کا فائدہ آپ کو دکھا سکتے ہیں۔

۴۔ حکومت سے گرانٹ کی درخواست آپ رکنِ جماعت ہوتے ہوئے نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر حکومت آپ سے یہ درخواست کرے کہ آپ اس کی گرانٹ قبول کر لیں، اور اس بات کا اطمینان دلائے کہ وہ یہ گرانٹ محض ملکی صنعت کی ترقی کے لیے دینا چاہتی ہے، آپ کا ضمیر خریدنا اس کے پیشِ نظر نہیں ہے، تو اس درخواست پر ہم دردانہ غور کیا جا سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، شعبان ۶۵ھ، جولائی ۴۶ء)

.....☆☆☆.....

چند کاروباری مسائل

سرکاری نرخ پر خرید کر چور بازار میں بیچنا:

سوال: ایک تاجر اپنے کاروبار میں پوری طرح راست باز اور دیانت دار ہے اور احکام شریعت کی پابندی کرتا ہے۔ سامانِ تجارت اسے کنٹرول ریٹ پر حاصل ہوتا ہے، لیکن بازار میں چور بازاری کی وجہ سے بعض اشیا کی قیمتیں بہت چڑھی ہوئی ہیں، اس صورت میں کیا وہ مروجہ نرخ پر اپنا مال فروخت کرنے کا حق رکھتا ہے؟

جواب: کنٹرول ریٹ سے خریدا ہوا مال کنٹرول ریٹ پر ہی بیچنا چاہیے۔ کنٹرول ریٹ پر خرید کر بلیک مارکیٹ میں مال فروخت کرنا تو ان لوگوں کا کام ہے جن کے اندر نفع اندوزی کی حرص کے سوا اور کوئی شریفانہ جذبہ باقی نہیں رہا۔ البتہ اضطراراً وہ چھوٹے تاجر ایک حد تک بلیک مارکیٹنگ کرنے کی گنجایش رکھتے ہیں جنہیں مال تجارت ملتا ہی بلیک مارکیٹ سے ہو اور کنٹرول ریٹ پر حاصل ہونا ناممکن ہو جائے، نیز انہیں کوئی دوسرا مشغلہ یا پیشہ اختیار کرنے کی بھی استطاعت نہ ہو۔

نقد کی قیمت اور، ادھار کی اور:

سوال: اگر کوئی دکان دار اس اُصول پر عمل پیرا ہو کہ وہ نقد خریدنے والے گاہک سے اشیا کی کم قیمت لے اور اُدھار لینے والے سے زیادہ، تو کیا وہ سود خواری کا مرتکب ہوگا؟ ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ فروخت پر کچھ معمولی سا کمیشن رکھا جاتا ہے، مثلاً ایک پیسا فی روپیا، اور یہ صرف نقد خریداری کی صورت میں گاہک کو ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: پہلی صورت تو صریحاً سود کی ہے۔ رہی دوسری شکل، تو اگرچہ اصطلاحاً یہ سود کی تعریف میں نہیں آتی، لیکن اس کے اندر روح تو سود ہی کی موجود ہے۔ فقہ کی زبان میں یہ ''ربوا'' نہیں ہے مگر ''ریبہ'' ضرور ہے، اور ریبہ بھی پرہیز کے لائق چیز ہے۔ دعوا الربٰو والریبہ۔ (الحدیث)

محصول سے بچنے کی کوشش:

سوال: ہمارے شہر میں اور عام طور پر ملک بھر میں اربابِ تجارت کا طریق کار یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مال کو چنگی سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اوّل تو چوری چھپے مال دکان پر

پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ نہ ہو سکے تو محرر چونگی کو کچھ دے دلا کر کام چلاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کم مال ظاہر کرنے والے نقلی بیچک بنا کر اس کے مطابق کم چونگی ادا کرتے ہیں اور دکان کے رجسٹروں میں اسی نقلی بیچک کے مطابق اندراجات کرتے ہیں۔ وہ مال رجسٹروں میں دکھایا ہی نہیں جاتا جس پر چونگی ادا نہ کی گئی ہو۔ اس طرح مال کی آمد، بکری اور منافع سبھی واقعی سے کم دکھائے جاتے ہیں۔ کیا یہ طریقے جائز ہیں؟

جواب: معاملے کی اس پوری شکل کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ موجودہ نظامِ حکومت کے عائد کیے ہوئے ٹیکس بجائے خود ناجائز ہیں اور ناروا اغراض کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لیکن اس استحصالِ ناجائز سے بچنے کے لیے جھوٹ اور جعل وفریب اور رشوت کے ہتھیار استعمال کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ اس طرح اپنے مال کو تو بچایا جا سکتا ہے لیکن متاعِ اخلاق برباد ہو جائے گی اور اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگوں کے اندر وہ اخلاقی حس ہی مفقود ہونی شروع ہو جائے گی جو انسان کو اپنے معاملات میں صداقت ودیانت سے کام لینے پر آمادہ کرتی ہے۔

رشوت دینے کی مجبوری:

سوال: ریلوے اسٹیشنوں سے جب مال کی بلٹیاں چھڑوانے جاتے ہیں تو ریلوے کے کلرک رشوت کا مطالبہ کرتے ہیں، جسے اگر رد کیا جائے تو طرح طرح سے نقصان اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ایسے حالات میں ایک مومن تاجر کیا کرے؟

جواب: عجیب معاملہ ہے کہ یہ لوگ جب حکومت سے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس بڑھوانے کے لیے ہڑتالیں کرتے ہیں تو پبلک کی ہم دردی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور جب اُدھر سے اپنا کام نکال لیتے ہیں تو اسی پبلک کو طرح طرح سے پریشان کر کے اس کی جیبوں پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ درحقیقت یہ نہایت ضروری ہے کہ ان لوگوں کو صاف صاف متنبہ کر دیا جائے کہ اگر تم پبلک کے ساتھ ایمان دارانہ رویہ اختیار نہ کرو گے تو اپنے مطالبات میں پبلک سے کسی ہم دردی کی توقع نہ رکھو۔

رہا نفسِ سوال، تو اِس کے متعلق پہلے بھی میں بیان کر چکا ہوں کہ حکومت کے ملازموں سے ناروا فائدے اُٹھانے کے لیے ان کو رشوت دینا قطعی حرام ہے۔ لیکن اگر اپنے جائز حقوق بھی آپ اُن کو رشوت دیے بغیر نہ حاصل کر سکیں، اور ان کا نقصان بھی آپ کے لیے قابلِ برداشت نہ ہو، نیز

اس قسم کے رشوت خور ملازموں کی شکایت اُن کے افسروں سے کرنے کا بھی موقع نہ ہو یا اس سے کوئی نتیجہ نکلنے کی توقع نہ ہو، تو مجبوراً ان کو رشوت دیجیے اور ہمیشہ ان کو نصیحت کرتے رہیے کہ یہ حرام خوری ہے جو تم کر رہے ہو اور تمہارا اپنا بھلا اسی میں ہے کہ تم اس سے بچو!

آڑھت کے بعض ناجائز طریقے:

سوال: آڑھت کی شرعی پوزیشن کیا ہے؟ آڑھتی کے پاس دو قسم کے بیوپاری آتے ہیں۔ پہلی قسم کے بیوپاری اپنے سرمایے سے کوئی جنس خرید کر لاتے ہیں اور آڑھتی کی وساطت سے فروخت کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے بیوپاری وہ ہوتے ہیں جو کچھ معمولی سا سرمایہ اپنا لگاتے ہیں اور بقیہ آڑھتی سے اس شرط پر قرض لیتے ہیں کہ اپنا خریدا ہوا مال اسی آڑھتی کے ہاتھ فروخت کریں گے اور بوقت فروخت مال آڑھتی کا روپیا بھی ادا کر دیں گے۔ آڑھتی پہلی قسم کے بیوپاریوں سے اگر ایک پیسا فی روپیا کمیشن لیتا ہے تو اس دوسری قسم کے بیوپاریوں سے دو پیسے فی روپیہ لے گا۔ یہ صورت حرام ہے یا ناجائز؟

جواب: یہ فرق جو آڑھتی اپنے کمیشن میں رکھتا ہے، غلط ہے۔ قرض لینے والے سے دو پیسے اور قرض نہ لینے والے سے ایک پیسا فی روپیا آڑھت لینا تو سود کی تعریف میں آجاتا ہے۔ چاہیے یہ کہ قرض کا معاملہ الگ رہے۔ البتہ یہ پابندی جائز ہو سکتی ہے کہ مارکیٹ ریٹ پر بیوپاری اپنا مال خاص اُسی آڑھتی کے ہاتھ لا کر فروخت کیا کرے جس کے روپے سے وہ کاروبار چلا رہا ہے۔

سوال: آڑھتی بائع اور خریدار سے کمیشن لینے کے علاوہ ایک حرکت یہ بھی کرتا ہے کہ مال کا سودا ہو جانے کے بعد اس میں سے کچھ مقدار ''چونگی'' کے نام سے لے لیتا ہے۔ مثلاً پھل ہوں تو ان میں سے چند دانے لے لے گا اور سبزی ہو تو اس میں اپنا حصہ لگائے گا۔ اس چونگی کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: یہ چونگی لینا آڑھتی کی زیادتی ہے۔ وہ جب اپنا طے شدہ کمیشن لے چکا تو اب اسے اور کچھ لینے کا حق نہیں۔ حقیقت میں یہ ''دست درازی'' ہے جس کا ایک معصوم نام ''چونگی'' رکھ لیا گیا ہے۔

زمین داری کے مکروہات:

سوال: میں جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر کافی متاثر ہوں، ذہن کا سانچا بدل چکا ہے اور یہ سانچا موجودہ ماحول کے ساتھ کسی طرح سازگار نہیں ہو رہا۔ مثلاً ایک اہم اُلجھن کو لیجیے۔ ہمارا

آبائی پیشہ زمین داری ہے اور والد صاحب نے مجھے اسی پر مامور کر دیا ہے۔ زمین داری کا عدالت اور پولیس وغیرہ سے چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے۔ عدالت اور پولیس سے بے تعلقی کا اظہار زمین دار کی کامل معاشی موت ہے۔ حد یہ کہ عدالت اور پولیس کی پشت پناہی سے بے نیاز ہوتے ہی خود اپنے ملازمین اور مزارعین پر زمین دار کا کوئی اثر نہیں رہ جاتا۔ خود پولیس جب یہ دیکھتی ہے کہ کوئی زمین دار اس کی ''بالائی آمدنی'' میں حائل ہو رہا ہے تو وہ اسی کے مزارعین اور ملازمین کو اُکسا کر اس کے مقابلے پر لاتی ہے۔ اسی طرح عدالتوں کا ہوّا جہاں کارندوں کے سامنے سے ہٹا، پھر ان کو ضمیر کی آواز کے سوا کوئی چیز فرائض پر متوجہ نہیں رکھ سکتی، اور حال یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے مادّی فائدے سے بڑھ کر کسی شے میں اپیل نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ایک مثال کافی ہوگی۔ ہمارے ہاں دستور تھا کہ کارندوں کے کام میں نقص رہے یا وہ کسی قسم کا نقصان کر دیں تو ان سے تاوان وصول کیا جاتا تھا۔ ہم نے یہ تاوان وصول کرنا بند کر دیا، کیوں کہ پولیس کی مدد کے بغیر یہ سلسلہ چل نہیں سکتا۔ رویے کی اس تبدیلی کے ساتھ معاً کاشت کاروں نے نقصان کرنا شروع کر دیا اور کارندوں نے بھی جرمانے کی رقم میں سے جو حصہ ملنا تھا، اس سے مایوس ہو کر چشم پوشی اختیار کی۔ اب حالات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ میں زمین داری کو سرے سے ختم کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں۔ آپ کی رائے میں چارۂ کار کیا ہے؟

جواب: زمین داری میں پولیس اور عدالت سے تعلق رکھنے کی جو ضرورت اس کافرانہ نظام میں پیدا ہو گئی ہے، اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں اور ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ قانون کی حدود سے بے نیاز ہو کر ایک زمین دار کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو دعوت اسلامی کا کام کرنا ہو، اُسے اپنے جملہ معاملات قانون کے سہارے کے بجائے اخلاقی بنیادوں پر قائم کرنے چاہییں اور اِس سلسلے میں جو نقصانات بھی پہنچیں انہیں برداشت کرنا چاہیے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا اپنا کام ہے کہ آیا آپ دعوتِ اسلامی کا کام کریں یا قانون کے سہارے زمین داری چلائیں۔ بہرحال یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں نبھ سکتے۔ جن لوگوں پر آپ پولیس اور عدالت کے ذریعے سے اپنی زمین داری کا زور چلائیں گے، وہ آپ کے اخلاقی اثر سے کبھی متاثر نہیں ہو سکتے اور نہ آپ کی اس دعوت میں کوئی صداقت محسوس کر سکتے ہیں کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور قانون صرف خدا کا چلنا چاہیے۔

گڑیوں کا حکم:

سوال: کیا بچوں کے کھیل کا سامان، مثلاً چینی کی گولیاں، تاش، ربڑ کی چڑیاں اور لڑکیوں کے لیے گڑیاں وغیرہ فروخت کرنا جائز ہے، نیز ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں بھی کیا بیچی جاسکتی ہیں؟

جواب: بچوں کے کھلونے بیچنا بجائے خود ناجائز نہیں ہے اِلّا یہ کہ کسی خاص کھلونے یا کھیل کے سامان میں کوئی شرعی قباحت ہو۔ رہے جانوروں اور آدمیوں کے مجسّمے، تو ان کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ پوری باریکی سے تمام خدوخال کے ساتھ انہیں بنایا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ محض ایک سرسری سا ڈھانچا کسی جان دار کا ہو، جیسے لکڑی کے گھوڑے اور کپڑے کی گڑیاں۔ پہلی قسم کے مجسّموں کی فروخت جائز نہیں ہے۔ البتہ دوسری قسم کے کھلونے آپ بیچ سکتے ہیں۔ رہیں ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں، تو اگر وہ مشرکانہ تخیلات کی نمائندہ ہوں، مثلاً کشن جی کی مورتی یا رام چندر جی کا مجسمہ وغیرہ، تو ان کی فروخت حرام ہے۔

اشتہاری تصویریں:

سوال: اشتہار کے لیے کیلنڈر وغیرہ پر آج کل عورتوں کی تصاویر بنانے کا بہت رواج ہے، نیز مشہور شخصیتوں اور قومی رہبروں کی تصاویر بھی استعمال کی جاتی ہیں، علاوہ بریں تجارتی اشیا کے ڈبوں اور بوتلوں اور لفافوں پر چھاپی جاتی ہیں۔ ان مختلف صورتوں سے ایک مسلمان تاجر اپنا دامن کیسے بچا سکتا ہے؟

جواب: اگر کوئی اشتہار یا کیلنڈر خود آپ چھپوائیں تو اسے تصویر سے پاک رکھیں۔ اور ضرورتاً اگر آپ کو اپنی ذات کے لیے کیلنڈروں وغیرہ کا استعمال کرنا پڑے تو اوّل تو بے تصویر لیجیے، ورنہ تصاویر کو چھپا دیجیے یا مسخ کر دیجیے۔ لیکن ڈبوں اور بوتلوں اور لفافوں پر آپ کہاں تک تصاویر کو مٹا سکتے ہیں۔ موجودہ تصویر پرست دنیا نے قسم کھالی ہے کہ کسی چیز کو تصویر سے خالی نہ چھوڑے گی۔ ڈاک کے ٹکٹوں اور سکّوں تک پر تصاویر موجود ہیں۔ یہ ہمہ گیر نظام طاغوت اپنی ناپاکیوں اور غلاظتوں کو جڑ سے لے کر شاخوں اور پتوں تک پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ بس اپنی حد امکان تک اپنا دامن بچایئے اور اس حد سے آگے جو کچھ ہے، اس سے اپنے آپ کو اور دنیا کو بچانے کے لیے یہ سعی کیجیے کہ نظام باطل کا تسلط ختم ہو اور نظام حق کا اقتدار جمے۔ اس کی جڑ کٹے گی تو شاخیں آپ ہی جھڑ جائیں گی۔

''سیپ'' اور ''دلّالی'':

سوال: ہر گاؤں میں عموماً ایک لوہار اور ایک بڑھئی ضرور ہوتا ہے۔ ان لوگوں سے زمین دار کام لیتے ہیں اور معاوضہ نقد ادا نہیں کرتے، نہ تنخواہ دیتے ہیں، بلکہ فصل کے فصل ایک مقررہ مقدار غلے کی انہیں دے دی جاتی ہے۔ اس صورت معاملہ کو ''سیپ'' کہا جاتا ہے۔ زمین دار لوگ جب کبھی لوہے یا لکڑی کا کوئی سامان خریدنا چاہتے ہیں تو اپنے لوہار یا بڑھئی بعض کارخانوں اور دکانوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور وہاں سے سامان خریدواتے ہیں، اور ہوتا یوں ہے کہ یہ لوگ دکان پر جاتے ہی آنکھوں کے اشاروں سے دلّالی کی فیس دکان دار سے طے کر لیتے ہیں جس سے زمین دار بے خبر رہتا ہے۔ اگر دکان دار لوہاز یا بڑھئی کی دلالی کا کمیشن ادا نہ کرے تو پھر وہ کبھی بھی اپنے زمین داروں کو اس کی دکان پر نہ لائے گا بلکہ کسی دوسری جگہ ساز باز کرے گا۔ اور جو دکان داران کا کمیشن دینے پر راضی ہو، وہ خراب مال بھی اگر دکھائے تو یہ خاص قسم کے دلّال اس کی تعریف کریں گے اور اسے بکوانے کی کوشش کریں گے۔ یہ سازش اگر زمین دار پر آشکارا ہو جائے تو وہ اپنے بڑھئی یا لوہار کو ایک دن بھی گاؤں میں نہ رہنے دے۔ یہ صورتِ معاملہ کیسی ہے؟

جواب: ''سیپ'' معاملے کی ایک ایسی شکل ہے جو دیہاتی زندگی میں ''معروف'' کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، اس لیے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں بیگا رکا عنصر شامل نہ ہونے پائے۔ یعنی فی الواقع جن لوگوں سے جتنی خدمت لی جائے، ان کو اس کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے۔ مقررہ خدمات سے زائد کوئی کام لینا ہو تو اس کا حق الگ اسے دینا چاہیے۔ محض زمین داری کی دھونس میں لوگوں سے بے جا خدمت لینا ظلم ہے۔

دلّالی کی جو شکل آپ نے لکھی ہے اس کے ناجائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دراصل زمین داروں کی زیادتی کا نتیجہ ہے۔ پیشہ ور لوگ محض ان کے دباؤ سے مجبوراً اپنے کام کاج کا ہرج کر کے ان کے ساتھ مال خریدوانے جاتے ہیں اور اس کا معاوضہ دکان داروں سے گویا اِس قرارداد پر وصول کرتے ہیں کہ اگر تم ہمیں کمیشن دیتے رہو گے تو ہم تمہارا بُرا مال بھی ان زمین داروں کے ہاتھ بکوا دیں گے۔ اس طرح یہ مال فروخت کروانے والا اور دکان

داراوران کے ساتھ زمین دار بھی، تینوں ایک قسم کے اخلاقی جرم کاارتکاب کرتے ہیں۔ اگرزمین داران لوگوں سے مفت کی خدمت لینا چھوڑ دیں اورانصاف کے ساتھ ان کا حق المحنت انہیں دیا کریں تو یہ بداخلاقی رونمانہ ہو۔

تجارت میں ''عرف'' کی حیثیت:

سوال: چمڑے کے کاروبار میں کروم ایک ایسی چیز ہے جس پر فٹ کی پیائش کا اندراج بہت غلط ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مال کلکتے میں تیار ہوتا ہے۔ مال تیار کرنے والے ہر تھان پر اصل پیمایش سے زائد فٹ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً دس فٹ کے تھان کو بارہ فٹ ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد کلکتہ کے تاجر یہ مال خریدتے ہیں اور یہ کچھ اور فٹ بڑھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب باہر کے تاجران سے مال خرید لے جاتے ہیں تو پھر وہ مزید فٹ بڑھاتے ہیں۔ یہاں آکر تھان پر فٹوں کا پکا اندراج ہوجاتا ہے اور پھر وہ آخر تک یہی اندراج قائم رہتا ہے۔ صحیح فٹ والا مال مارکیٹ میں نہیں ملتا۔ تقریباً سبھی کارخانے اور تاجر یہی کچا فٹ استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر گاہک اس صورت حال سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہم پیمایش کی اس گڑبڑ کے متعلق کوئی توضیح نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی گاہک پوچھے تو اسے صاف بتادیتے ہیں کہ اس مال پر کچے (غلط نمبر) فٹوں کا نمبر لگا ہوا ہے۔ ہم اسی کچے فٹ کے حساب سے خریدتے ہیں اور اسی کے حساب سے منافع لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ مثلاً ایک کچا فٹ اگر ۱۲/ میں آتا ہے تو ہم ایک کچے فٹ کے ۱۲/۱۰ لگائیں گے۔ شرعاً ایسے کاروبار کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: تجارت میں جب یہ چیز معروف ہے، یعنی دکان دار اور خریدار سب اس بات سے واقف ہیں کہ کچے اور پکے اوزان یا پیمانوں میں کیا فرق ہے اور کون سی چیز پکے پیمانوں کے حساب سے ملتی ہے اور کون سی کچے پیمانوں کے حساب سے، تو اس صورت میں یہ معاملہ جائز شمار ہوگا۔ لیکن یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے کہ گوناگوں اوزان اور پیمانے رائج رہیں۔ اس سے ناواقف لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ایک اچھے نظامِ حکومت کا فرض ہے کہ وہ تجارت کو ان ''اسرارِ نہاں'' سے پاک کرے۔ (ترجمان القرآن، رمضان ۶۵ھ، اگست ۴۶ء)

.....☆☆☆.....

سیاسی مسائل

اسلامی ریاست میں ذمی رعایا:

سوال: میں ہندو مہا سبھا کا ورکر ہوں۔ سالِ گزشتہ صوبے کی ہندو سبھا کا پروپیگنڈا سیکرٹری منتخب ہوا تھا۔ میں حال ہی میں جناب کے نام سے شناسا ہوا ہوں۔ آپ کی چند کتابیں مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ اوّل وسوئم، اسلام کا نظریۂ سیاسی، اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے، سلامتی کا راستہ وغیرہ دیکھی ہیں، جن کے مطالعے سے اسلام کے متعلق میرا نظریہ قطعاً بدل گیا ہے اور میں ذاتی طور پر یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ چیز کچھ عرصہ پہلے ہوگئی ہوتی تو ہندو مسلم کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ ہوتا۔ جس حکومتِ الٰہیہ کی آپ دعوت دے رہے ہیں، اس میں زندگی بسر کرنا قابل فخر ہوسکتا ہے مگر چند اُمور دریافت طلب ہیں۔ خط وکتابت کے علاوہ ضرورت ہوگی تو جناب کا نیاز بھی حاصل کروں گا۔

سب سے پہلی چیز جو دریافت طلب ہے وہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو حکومت الٰہیہ کے اندر کس درجے میں رکھا جائے گا؟ آیا ان کو اہل کتاب کے حقوق دیے جائیں گے یا ذمی کے؟ اہل کتاب اور ذمی لوگوں کے حقوق کی تفصیل ان رسائل میں بھی نہیں ملتی۔ مجھے جہاں تک سندھ پر عربی حملے کی تاریخ کا علم ہے، محمد بن قاسم اور اس کے جانشینوں نے سندھ کے ہندوؤں کو اہل کتاب کے حقوق دیے تھے۔ اُمید ہے کہ آپ اس معاملے میں تفصیلی طور پر اظہار خیال فرمائیں گے۔

نیز یہ بھی فرمایئے کہ اہل کتاب اور ذمی کے حقوق میں کیا فرق ہے؟ کیا وہ ملک کے نظم ونسق میں برابر کے شریک ہوسکتے ہیں؟ کیا پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہوگا؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن قبول کرنے کو تیار ہوں گے جو کہ آپ حکومت الٰہیہ میں ہندوؤں کو دیں گے؟

دوسری دریافت طلب چیز یہ ہے کہ کیا قرآن کے فوج داری اور دیوانی احکام مسلمانوں کی طرح ہندوؤں پر بھی حاوی ہوں گے؟ کیا ہندوؤں کا قومی قانون (Personal Law) ہندوؤں پر نافذ ہوگا یا نہیں؟ میرا مدعا یہ ہے کہ ہندو اپنے قانون وراثت، مشترکہ فیملی سسٹم اور متبنّیٰ وغیرہ بنانے کے قواعد (مطابق منوشاستر) کے مطابق زندگی بسر کریں گے یا نہیں؟

واضح رہے کہ یہ سوالات محض ایک متلاشیِ حق کی حیثیت سے پیش کیے جارہے ہیں۔

جواب: میں آپ کے ان خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں جو آپ نے اپنے عنایت نامے میں ظاہر کیے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندستان میں ہندو مسلم مسئلے کو پیچیدہ اور نا قابلِ حل حد تک پیچیدہ بنا دینے کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اُصول حق اور راستی کی بنیادوں پر مسائل زندگی کو حل کرنے کے بجائے شخصی، خاندانی، طبقاتی، نسلی اور قومی بنیادوں پر انہیں دیکھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا انجام وہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں، اور اس بدقسمتی میں ہم آپ سب برابر کے شریک ہیں، کوئی بھی فائدے میں نہیں ہے۔

آپ نے جو سوالات کیے ہیں، ان کے مختصر جوابات نمبر وار درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر حکومتِ الٰہیہ قائم ہو تو اس کی حیثیت یہ نہ ہوگی کہ ایک قوم دوسری قوم یا اقوام پر حکمران ہے، بلکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہوگی کہ ملک پر ایک اُصول کی حکومت قائم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی حکومت کو چلانے کی ذمہ داری باشندگانِ ملک میں سے وہی لوگ اُٹھا سکیں گے جو اس اُصول کو مانتے ہوں۔ دوسرے لوگ جو اس اُصول کو نہ مانتے ہوں یا کم از کم اس پر مطمئن نہ ہوں، ان کو اس حکومت میں قدرتی طور پر ''اہل ذمہ'' کی حیثیت حاصل ہوگی، یعنی جن کی حفاظت کی ذمہ داری وہ لوگ لیتے ہیں جو اس اصولی حکومت کو چلانے والے ہیں۔

۲۔ ''اہلِ کتاب'' اور ''عام اہل ذمّہ'' کے درمیان اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور دوسرے ذمیوں کی عورتوں سے نہیں کر سکتے۔ لیکن حقوق میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

۳۔ ذمّیوں کے حقوق کے بارے میں تفصیلات تو میں اس خط میں نہیں دے سکتا، البتہ اُصولی طور پر آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ ذمّی دو طرح کے ہو سکتے ہیں: ایک وہ جو اسلامی حکومت کا ذمہ قبول کرتے وقت کوئی معاہدہ کریں، اور دوسرے وہ جو بغیر کسی معاہدے کے ذمہ میں داخل ہوں۔ پہلی قسم کے ذمیوں کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو معاہدے میں طے ہوا ہو۔ رہے دوسری قسم کے ذمی، تو ان کا ذمی ہونا ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ ہم ان کی جان اور مال اور آبرو کی اُسی طرح حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں جس طرح خود اپنی جان اور مال اور آبرو کی کریں گے۔ ان کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے۔ ان کے خون کی قیمت وہی ہوگی جو مسلمان کے خون کی ہے۔ ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ ان کی

عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ان کو اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسلامی تعلیم بہ جبر ان پر نہیں ٹھونسی جائے گی۔

ذمّیوں کے متعلق اسلام کے دستوری قانون کی تفصیلات ان شاء اللہ ہم ایک کتاب کی شکل میں الگ شائع کریں گے[1]۔

۴۔ جہاں تک ذمیوں کے پرسنل لا کا تعلق ہے وہ ان کی مذہبی آزادی کا ایک لازمی جز ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت ان کے قوانین نکاح وطلاق اور قوانینِ وراثت وتبنّیت کو، اور ایسے ہی دوسرے تمام قوانین کو جو ملکی قانون (Law of the Land) سے نہ ٹکراتے ہوں، ان پر جاری کرے گی اور صرف ان اُمور میں ان کے پرسنل لا کے نفاذ کو برداشت نہ کرے گی جن میں ان کا برا اثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ذمی قوم سود کو جائز رکھتی ہو تو ہم اُس کو اسلامی حکومت میں سودی لین دین کی اجازت نہ دیں گے، کیوں کہ اس سے پورے ملک کی معاشی زندگی متاثر ہوتی ہے، یا مثلاً اگر کوئی ذمی قوم زنا کو جائز رکھتی ہو تو ہم اسے اجازت نہ دیں گے کہ وہ اپنے طور پر بدکاری (Prostitution) کا کاروبار جاری رکھ سکے کیوں کہ یہ اخلاقِ انسانی کے مسلمات کے خلاف ہے اور یہ چیز ہمارے قانون تعزیرات (Criminal Law) سے بھی ٹکراتی ہے، جو ظاہر ہے کہ ملکی قانون بھی ہوگا۔ اسی پر آپ دوسرے اُمور کو قیاس کر سکتے ہیں۔

۵۔ آپ کا یہ سوال کہ آیا ذمی ملک کے نظم ونسق میں برابر کے شریک ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پولیس، فوج اور قانون نافذ کرنے والی جماعت میں ہندوؤں کا حصہ ہوگا یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا ہندوؤں کی اکثریت والے صوبوں میں آپ مسلمانوں کے لیے وہ پوزیشن منظور کریں گے جو آپ ہندوؤں کو حکومت الٰہیہ میں دیں گے؟ یہ سوال میرے نزدیک دو غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ اُصولی غیر قومی حکومت (Ideological Non-National State) کی صحیح حیثیت آپ نے اس میں ملحوظ نہیں رکھی ہے۔ دوسرے یہ کہ کاروباری لین دین کی ذہنیت اس میں جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نمبر اوّل میں تصریح کر چکا ہوں، اُصولی حکومت کو چلانے اور اس کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری صرف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جو اس اُصول پر یقین رکھتے ہوں۔ وہی اس کی

---

[1] اس موضوع پر جماعت اسلامی کی طرف سے دو مستقل رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

روح کو سمجھ سکتے ہیں، انہی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ پورے خلوص کے ساتھ اپنا دین وایمان سمجھتے ہوئے اس ''ریاست'' کے کام کو چلائیں گے، اور انہی سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس ریاست کی حمایت کے لیے اگر ضرورت پڑے تو میدانِ جنگ میں قربانی دے سکیں گے۔ دوسرے لوگ جو اس اُصول پر ایمان نہیں رکھتے، اگر حکومت میں شریک کیے بھی جائیں گے تو نہ وہ اس کی اُصولی اور اخلاقی روح کو سمجھ سکیں گے، نہ اس روح کے مطابق کام کرسکیں گے اور نہ ان کے اندر ان اصولوں کے لیے اخلاص ہوگا جن پر اس حکومت کی عمارت قائم ہوگی۔ سول محکموں میں اگر وہ کام کریں گے تو ان کے اندر ملازمانہ ذہنیت کارفرما ہوگی اور محض روزگار کی خاطر وہ اپنا وقت اور اپنی قابلیتیں بیچیں گے اور اگر وہ فوج میں جائیں گے تو ان کی حیثیت کرائے کے سپاہیوں (Merecenaries) جیسی ہوگی اور وہ ان اخلاقی مطالبات کو پورا نہ کرسکیں گے جو اسلامی حکومت اپنے مجاہدوں سے کرتی ہے۔ اس لیے اُصولاً اور اخلاقی اعتبار سے اسلامی حکومت کی پوزیشن اس معاملے میں یہ ہے کہ وہ فوج میں اہل ذمہ سے کوئی خدمت نہیں لیتی بلکہ اس کے برعکس فوجی حفاظت کا پورا پورا بار مسلمانوں پر ڈال دیتی ہے اور اہل ذمہ سے صرف ایک دفاعی ٹیکس لینے پر اکتفا کرتی ہے۔ لیکن یہ ٹیکس اور فوجی خدمت دونوں بیک وقت اہل ذمہ سے نہیں لیے جاسکتے۔ اگر اہل ذمہ بطور خود فوجی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کریں تو وہ ان سے قبول کرلی جائے گی اور اس صورت میں دفاعی ٹیکس ان سے نہ لیا جائے گا۔ رہے سول محکمے، تو ان میں سے کلیدی مناصب (Key Positions) اور وہ عہدے جو پالیسی کے تعین وتحفظ سے تعلق رکھتے ہیں بہرحال اہل ذمہ کو نہیں دیے جاسکتے۔ البتہ کارکنوں کی حیثیت سے ذمیوں کی خدمات حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طرح جو اسمبلی شوریٰ کے لیے منتخب کی جائے گی، اس میں بھی اہل ذمہ کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں ملے گا۔ البتہ ذمیوں کی الگ کونسلیں بنادی جائیں گی جو ان کی تہذیبی خود اختیاری کے انتظام کی دیکھ بھال بھی کریں گی اور اس کے علاوہ ملکی نظم ونسق کے متعلق اپنی خواہشات، اپنی ضروریات اور شکایات اور اپنی تجاویز کا اظہار بھی کرسکیں گی، جن کا پورا پورا لحاظ اسلامی مجلس شوریٰ (Assembly) کرے گی۔

صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کسی قوم کا اجارہ نہیں ہے۔ جو بھی اس کے اُصول کو تسلیم کرے، وہ اس حکومت کو چلانے میں حصہ دار ہوسکتا ہے۔ خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ۔ لیکن

جو اس کے اُصول کو تسلیم نہ کرے ،وہ خواہ مسلم زادہ ہی کیوں نہ ہو،حکومت کی محافظت (Protection) سے فائدہ تو اُٹھا سکتا ہے لیکن اس کے چلانے میں حصہ دار نہیں ہوسکتا۔

آپ کا یہ سوال کہ ''کیا ہندو اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کی وہی پوزیشن قبول کرو گے جو حکومت الٰہیہ میں ہندوؤں کو دو گے؟'' دراصل مسلم لیگ کے لیڈروں سے کیا جانا چاہیے تھا، کیوں کہ لین دین کی باتیں وہی کر سکتے ہیں۔ہم سے آپ پوچھیں گے تو ہم تو اس کا بے لاگ اُصولی جواب دیں گے۔

جہاں حکومت قائم کرنے کے اختیارات ہندوؤں کو حاصل ہوں وہاں آپ اُصولاً دو ہی طرح کی حکومتیں قائم کر سکتے ہیں:

یا ایسی حکومت جو ہندو مذہب کی بنیاد پر قائم ہو۔

یا پھر ایسی حکومت جو وطنی قومیت کی بنیاد پر ہو۔

پہلی صورت میں آپ کے لیے یہ کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے کہ جیسے حقوق حکومتِ الٰہیہ میں ہندوؤں کو ملیں گے ویسے ہی حقوق ہم ''رام راج'' میں مسلمانوں کو دے دیں گے۔ بلکہ آپ کو اس معاملے میں اگر کوئی رہنمائی ہندو مذہب میں ملتی ہے تو بے کم وکاست اسی پر عمل کریں، قطع نظر اس سے کہ دوسرے کس طرح عمل کرتے ہیں۔اگر آپ کا معاملہ ہمارے معاملے سے بہتر ہوگا تو اخلاق کے میدان میں آپ ہم پر فتح پالیں گے، اور بعید نہیں کہ ایک روز ہماری حکومت الٰہیہ آپ کے رام راج میں تبدیل ہو جائے۔اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا، تو ظاہر ہے کہ دیر یا سویر نتیجہ بھی برعکس نکل کر ہی رہے گا۔

رہی دوسری صورت کہ آپ کی حکومت وطنی قومیت کی بنیاد پر قائم ہو، تو اس صورت میں بھی آپ کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو جمہوری (Democratic) اصول اختیار کریں اور مسلمانوں کو ان کی تعداد کے لحاظ سے حصہ دیں، یا پھر صاف صاف کہہ دیں کہ یہ ہندو قوم کی حکومت ہے اور مسلمانوں کو اس میں ایک مغلوب قوم (Subject Nation) کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔

ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت پر بھی آپ چاہیں مسلمانوں سے معاملہ کریں۔ بہر حال آپ کے برتاؤ کو دیکھ کر اسلامی ریاست اُن اُصولوں میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر نہ کرے گی جو ذمّیوں سے معاملہ کرنے کے لیے قرآن وحدیث میں مقرر کر دیے گئے ہیں۔آپ چاہیں تو اپنی

قومی ریاست میں مسلمانوں کا قتلِ عام کردیں اور ایک مسلمان بچے تک کو زندہ نہ چھوڑیں۔ اسلامی ریاست میں اس کا انتقام لینے کے لیے کسی ذمی کا بال تک بیکا نہ کیا جائے گا۔اس کے برعکس آپ کا جی چاہے تو ہندو ریاست میں صدر جمہوریہ اور وزیراعظم اور کمانڈر اِن چیف سب ہی کچھ مسلمان باشندوں کو بنادیں۔ بہرحال اس کے جواب میں کوئی ایک ذمّی بھی کسی ایسی پوزیشن پر مقرر نہیں کیا جائے گا جو اسلامی ریاست کی پالیسی کی شکل اور سمت معیّن کرنے میں دخل رکھتی ہو۔

(ترجمان القرآن، رجب شوال ۶۳ھ، جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

مزید تصریحات:

سوال: آپ کی جملہ تصانیف اور سابق عنایت نامہ پڑھنے کے بعد میں یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ خالص اسلامی طرز کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہیں اور اس اسلامی حکومت کے عہد میں ذمی اور اہلِ کتاب کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسی ہندوؤں میں اچھوتوں کی۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''ہندوؤں کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی، ان کو مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا''۔ مگر آپ نے یہ نہیں تحریر فرمایا کہ آیا ہندوؤں کو تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں؟ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''جو بھی اس حکومت کے اصول کو تسلیم کرلے وہ اس کے چلانے میں حصہ دار ہوسکتا ہے، خواہ وہ ہندو زادہ ہو یا سکھ زادہ''۔ براہ کرم اس کی توضیح کیجیے کہ ایک ہندو، ہندو رہتے ہوئے بھی کیا آپ کی حکومت کے اُصولوں پر ایمان لاکر اسے چلانے میں شریک ہوسکتا ہے؟

پھر آپ نے فرمایا ہے کہ ''اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان نکاح کرسکتے ہیں'' مگر آپ نے ساتھ ہی یہ واضح نہیں کیا کہ آیا اہل کتاب بھی مسلم عورتوں سے نکاح کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا آپ اس احساسِ برتری (Superiority Comple) کے بارے میں مزید روشنی ڈالیں گے؟ اگر آپ اس کے اثبات (Justification) کے لیے اسلام پر ایمان کی اوٹ لیں تو کیا آپ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ موجودہ نام نہاد مسلمان آپ کے قول کے مطابق ان اسلامی قواعد اور کیرکٹر کے اُصولوں پر پورے اُتریں گے؟ آج کے مسلمان کی بات تو الگ رہی، کیا آپ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں اکثر وبیش تر جو لوگ اسلام لائے، وہ

زیادہ تر سیاسی اقتدار کے خواہاں تھے؟ اگر آپ یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں تو فرمایئے کہ پھر وہ اسلامی حکومت کیوں صرف تیس پینتیس سال چل کر رہ گئی؟ پھر کیوں حضرت علیؓ جیسے مدبر اور مجاہد کی اس قدر مخالفت ہوئی اور مخالفین میں حضرت عائشہؓ صاحبہ تک تھیں؟

آپ حکومتِ الٰہیہ کے خواہاں ہوتے ہوئے پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنی حکومتِ الٰہیہ ملکی حدود کے بغیر ہی نافذ کر سکیں گے؟ یقیناً نہیں، تو پھر آپ کی حکومتِ الٰہیہ کے لیے ملکی حدود بہر حال وہی موزوں ہو سکتی ہیں جہاں مسٹر جناح اور ان کے ساتھی پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ آپ پاکستان کی حدود کے علاوہ کیوں سارے ہندوستان میں حکومت الٰہیہ نافذ کریں گے؟ نیز یہ گرہ بھی کھولیے کہ آپ موجودہ ماحول میں اس طرزِ حکومت کو چلانے کے لیے ایسے بلند اخلاق اور بہترین کیرکٹر کی شخصیتیں کہاں سے پیدا کریں گے؟ جب کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان غنیؓ جیسے عدیم المثال بزرگ اسے چند سالوں سے زیادہ نہ چلا سکے۔ چودہ سو سال کے بعد ایسے کون سے موافق حالات آپ کے پیشِ نظر ہیں جن کی بِنا پر آپ کی دُوررس نگاہیں حکومت الٰہیہ کو عملی صورت میں دیکھ رہی ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ آپ کا پیغام ہر خیال کے مسلمانوں میں زور شور سے پھیل رہا ہے اور مجھے جس قدر بھی مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ سب اس خیال کے حامی ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ عین اسلام ہے۔ مگر ہر شخص کا اعتراض یہی ہے جو میں نے گذشتہ سطور میں پیش کیا ہے، یعنی آپ کے پاس عہد خلافتِ راشدہ کی اُصولی حکومت چلانے کے لیے فی زمانہ کیرکٹر کے آدمی کہاں ہیں؟ پھر جب کہ وہ بہترین نمونے کی ہستیاں اس نظام کو نصف صدی تک بھی کامیابی سے نہ چلا سکیں تو اس دور میں اس طرز کی حکومت کا خیال خوش فہمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

علاوہ بریں ایک چیز اور بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ مدت پہلے میرا یہ خیال تھا کہ صرف ہم ہندوؤں میں ہی ایک مشترکہ نصب العین نہیں ہے۔ بخلاف اس کے مسلمانوں میں اجتماعی زندگی ہے اور ان کے سامنے واحد نصب العین ہے۔ لیکن اب اسلامی سیاست کا بغور مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کا حال ہم سے بھی دگرگوں ہے۔ آپ سے چھپاؤں نہیں میں نے تقریباً مختلف مراکز فکرِ مسلم رہنماؤں سے ان کے نصب العین اور طریقۂ کار کے بارے میں ایک متلاشی حق کی حیثیت سے چند ایک امور جو میرے لیے تحقیق طلب تھے، دریافت کیے۔ ان کے جوابات موصول

ہونے پر میرا پہلا خیال غلط نکلا اور معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں بھی طریقۂ کار اور نصب العین کے بارے میں زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔

(اس موقع پر مستفسر نے جماعت اسلامی سے اختلاف رکھنے والے بعض اصحاب کی تحریروں سے چند سطور نقل کی ہیں۔ انہیں حذف کیا جاتا ہے)۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ آپ کے مشترک العقیدہ رہنما کس شدید اختلافِ آرا میں مبتلا ہیں۔ ان ٹھوس حقائق اور واقعات کو نظر انداز کر کے محض کتابوں کے صفحات پر ایک چیز کو نظریے کی شکل میں پیش کر دینا اور بات ہے اور اسے عملی جامہ پہنانا قطعاً مختلف چیز ہے۔ سیاست ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ کیا آپ میرے اس سارے التماس کو سامنے رکھ کر اپنے طریقۂ کار اور راہ عمل سے بہ تفصیل مطلع فرمائیں گے؟

جواب: آپ کے سوالات کا سرا حقیقت میں ابھی تک میں نہیں پا سکا ہوں۔ اس وجہ سے جو جوابات میں دیتا ہوں، ان میں سے کچھ اور ایسے سوالات نکل آتے ہیں جن کے نکلنے کی مجھے توقع نہیں ہوتی۔ اگر آپ پہلے بنیادی امور سے بات شروع کریں اور پھر تبدریج فروعی معاملات اور وقتی سیاسیات (Current politics) کی طرف آئیں تو چاہے آپ مجھ سے متفق نہ ہوں لیکن کم از کم مجھے اچھی طرح سمجھ ضرور لیں گے۔ سر دست تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری پوزیشن آپ کے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہے۔

آپ نے اپنے عنایت نامے میں تحریر فرمایا ہے کہ ''جس اسلامی حکومت کا میں خواب دیکھ رہا ہوں، اس میں ذمی اور اہل کتاب کی حیثیت وہی ہوگی جو ہندوؤں میں اچھوتوں کی ہے''۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ یا تو آپ ذمّیوں کی حیثیت میرے صاف صاف بیان کر دینے کے باوجود نہیں سمجھے ہیں 'یا ہندوؤں' میں اُچھوتوں کی حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ اوّل تو اچھوتوں کی جو حیثیت ''منو'' کے ''دھرم شاستر'' سے معلوم ہوتی ہے، اس کو ان حقوق و مراعات سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اسلامی فقہ میں ذمیوں کو دیے گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھوت پن کی بنیاد نسلی امتیاز پر ہے اور ذمیت کی بنیاد محض عقیدے پر۔ اگر ذمی اسلام قبول کر لے تو وہ ہمارا امیر و امام تک بن سکتا ہے۔ مگر کیا ایک شودر کسی عقیدہ و مسلک کو قبول کر لینے کے بعد ورن آشرم کی پابندیوں سے بری ہو سکتا ہے؟

آپ کا یہ سوال بہت ہی عجیب ہے کہ ''کیا ایک ہندو ہندو رہتے ہوئے بھی آپ کی حکومت کے اُصولوں پر ایمان لا کر اسے چلانے میں شریک ہوسکتا ہے؟'' شاید آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اسلامی حکومت کے اُصولوں پر ایمان لے آنے کے بعد ہندو ہندو کب رہے گا، وہ تو مسلم ہوجائے گا۔ آج جو کروڑوں ''ہندوزادے'' اس ملک میں مسلمان ہیں، وہ اسلام کے اُصولوں پر ایمان لا کر ہی تو مسلمان ہوئے ہیں۔ اسی طرح آیندہ جو ہندوزادے اسے مان لیں گے، وہ بھی مسلم ہوجائیں گے۔ اور جب وہ مسلم ہوجائیں گے تو یقیناً اسلامی حکومت کو چلانے میں وہ ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے۔

آپ کا یہ سوال کہ آیا ہندوؤں کو اسلامی ریاست میں تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا یا نہیں، جتنا مختصر ہے اس کا جواب اتنا مختصر نہیں ہے۔ تبلیغ کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ خود اپنی آیندہ نسلوں کو اور اپنے عوام کو اپنے مذہب کی تعلیم دے۔ اس کا حق تمام ذمی گروہوں کو حاصل ہوگا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ کوئی مذہبی گروہ تحریر یا تقریر کے ذریعے سے اپنے مذہب کو دوسروں کے سامنے پیش کرے اور اسلام سمیت دوسرے مسلکوں سے اپنے وجوہِ اختلاف کو علمی حیثیت سے بیان کرے۔ اس کی اجازت بھی ذمیوں کو ہوگی، مگر ہم کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے اپنا دین تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک منظّم تحریک ایسی اُٹھائے جس کی غرض یا جس کا مآل یہ ہو کہ ملک کا نظام زندگی تبدیل ہوکر اسلامی اُصولوں کے بجائے اس کے اُصولوں پر قائم ہوجائے۔ ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدودِ اقتدار میں کسی کو نہیں دیں گے۔ اس مسئلے پر میرا مفصل مضمون ''اسلام میں قتلِ مرتد کا حکم'' ملاحظہ فرمائیے[1]۔

اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح جائز اور مسلمان عورتوں سے اہلِ کتاب کا نکاح ناجائز ہونے کی بنیاد کسی احساسِ برتری پر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ مرد بالعموم متاثر کم ہوتا ہے اور اثر زیادہ ڈالتا ہے۔ عورت بالعموم متاثر زیادہ ہوتی ہے اور اثر کم ڈالتی ہے۔ ایک غیر مسلمہ اگر کسی مسلمان کے نکاح میں آئے تو اس کا امکان کم ہوتا ہے کہ وہ اس مسلمان کو غیر مسلم بنالے گی، اور اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ وہ مسلمان ہوجائے گی۔ لیکن ایک مسلمان

---

[1] یہ مضمون اب کتابی شکل میں شائع کیا جاچکا ہے۔

عورت اگر کسی غیر مسلم کے نکاح میں چلی جائے تو اس کے غیر مسلمہ ہو جانے کا بہت زیادہ اندیشہ ہے اور اس بات کی توقع بہت کم ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اور اپنی اولاد کو مسلمان بنا سکے گی۔ اسی لیے مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنی لڑکیوں کا نکاح غیر مسلموں سے کریں۔ البتہ اگر اہل کتاب میں سے کوئی شخص خود اپنی بیٹی مسلمان کو دینے پر راضی ہو تو مسلمان اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اس چیز کی اجازت دی گئی ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر غیر مسلم بیوی کی محبت میں مبتلا ہو کر تم نے ایمان کھو دیا تو تمہارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا اور آخرت میں تم خسارے میں رہو گے۔ نیز یہ اجازت ایسی ہے جس سے خاص ضرورتوں کے مواقع پر ہی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی پسندیدہ فعل نہیں ہے جسے قبول عام حاصل ہو، بلکہ بعض حالات میں تو اس سے منع بھی کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی سوسائٹی میں غیر مسلم عناصر کے داخل ہونے سے کسی نامناسب اخلاقی اور اعتقادی حالت کا نشو ونما نہ ہو سکے۔

آپ کا یہ سوال کہ اسلامی حکومت صرف تیس پینتیس سال چل کر کیوں رہ گئی، ایک اہم تاریخی مسئلے سے متعلق ہے۔ اگر آپ اسلامی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو اس کے اسباب سمجھنا آپ کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ کسی خاص اُصول کی علم بردار جماعت جو نظامِ زندگی قائم کرتی ہے، اس کا اپنی پوری شان کے ساتھ چلنا اور قائم رہنا اس بات پر منحصر ہوتا ہے کہ لیڈر شپ ایک ایسے چیدہ گروہ کے ہاتھ میں رہے جو اس اصول کا سچا اور سرگرم پیرو ہے۔ اور لیڈر شپ ایسے گروہ کے ہاتھ میں صرف اسی حالت میں رہ سکتی ہے جب کہ عام باشندوں پر اس گروہ کی گرفت قائم رہے اور ان کی عظیم اکثریت کم از کم اس حد تک تعلیم و تربیت پائے ہوئے ہو کہ اسے اس خاص اُصول کے ساتھ گہری وابستگی بھی ہو اور وہ ان لوگوں کی بات سننے کے لیے تیار بھی نہ ہو جو اس اُصول سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقے کی طرف بلانے والے ہوں۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو تمدنی انقلاب رونما ہوا اور جو نیا نظام زندگی قائم ہوا، اس کی بنیاد یہ تھی کہ عرب کی آبادی میں ایک طرح کا اخلاقی انقلاب (Moral Revolution) واقع ہو چکا تھا اور آنحضرتؐ کی قیادت میں صالح انسانوں کا جو مختصر گروہ تیار ہوا تھا، اس کی قیادت تمام اہل عرب نے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن آگے چل کر عہدِ خلافتِ راشدہ میں جب

ملک پر ملک فتح ہونے شروع ہوئے تو اسلام کی مملکت میں توسیع بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور استحکام اتنی تیزی کے ساتھ نہ ہوسکا۔ چوں کہ اس زمانے میں نشر واشاعت اور تعلیم وتبلیغ کے ذرائع اتنے نہ تھے جتنے آج ہیں اور نہ وسائل حمل ونقل موجوہ زمانے کے مانند تھے، اس لیے جو فوج درفوج انسان اس نئی مسلم سوسائٹی میں داخل ہونے شروع ہوئے، ان کو اخلاقی، ذہنی اور عملی حیثیت سے اسلامی تحریک میں مکمل طور پر جذب کرنے کا انتظام نہ ہوسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عام آبادی میں صحیح قسم کے مسلمانوں کا تناسب بہت کم رہ گیا اور خام قسم کے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ لیکن اُصولاً ان مسلمانوں کے حقوق اور اختیارات اور سوسائٹی میں اُن کی حیثیت صحیح قسم کے مسلمانوں کی بہ نسبت کچھ بھی مختلف نہ ہوسکتی تھی۔ اسی وجہ سے جب حضرت علیؓ کے زمانے میں ارتجاعی تحریکیں[1] (Reactionary Movements) رونما ہوئیں تو مسلمان پبلک کا ایک بہت بڑا حصہ ان سے متاثر ہوگیا اور لیڈرشپ ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گئی جو ٹھیٹ اسلامی طرز پر کام کرنے والے تھے۔ اس تاریخی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ واقعہ ذرہ برابر بھی دل شکستہ نہیں کرتا کہ خالص اسلامی حکومت تیس پینتیس سال سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

آج اگر ہم ایک صالح گروہ اس ذہنیت، اس اخلاق، اور اس سیرت کے انسانوں کا منظّم کرسکیں جو اسلام کے منشا کے مطابق ہو، تو ہم اُمید رکھتے ہیں کہ موجودہ زمانے کے ذرائع ووسائل سے فائدہ اُٹھا کر نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ہم ایک اخلاقی وتمدنی انقلاب برپا کرسکیں گے، اور ہمیں پورا یقین ہے کہ ایسے گروہ کے منظّم ہوجانے کے بعد عام انسانوں کی قیادت اس گروہ کے سوا کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ میں نہیں جاسکتی۔ آپ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر جو رائے قائم کررہے ہیں، وہ اس حالت پر چسپاں نہیں ہوسکتی جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔

اگر صحیح اخلاق کے حامل انسان میدانِ عمل میں آجائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان عوام ہی نہیں بلکہ ہندو، عیسائی، پارسی اور سکھ سب ان کے گرویدہ ہوجائیں گے اور خود اپنے ہم مذہب لیڈروں کو چھوڑ کر اُن پر اعتماد کرنے لگیں گے۔ ایسے ہی ایک گروہ کو تربیت اور تعلیم اور تنظیم کے ذریعے سے تیار کرنا اس وقت میرے پیش نظر ہے، اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس

---

[1] یعنی جن کا مقصد اسلام سے پھر کسی نہ کسی طرح کی جاہلیت کی طرف پلٹ جانا تھا۔

کام میں وہ میری مدد کرے۔

''حکومتِ الٰہیہ'' اور ''پاکستان'' کے فرق کے متعلق جو سوال آپ نے کیا ہے، اس کا جواب آپ میری کتابوں میں پا سکتے تھے مگر وہ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزریں۔ پاکستان کے مطالبے کی بنیاد قومیت کے اُصول پر ہے، یعنی مسلمان قوم کے افراد جہاں اکثریت میں ہوں، وہاں انہیں اپنی حکومت قائم کرنے کا حق حاصل ہو۔ بخلاف اس کے تحریکِ حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد اسلام کا اُصول ہے۔ پاکستان صرف ان لوگوں کو اپیل کر سکتا ہے جو مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن حکومت الٰہیہ کی دعوت تمام انسانوں کو اپیل کر سکتی ہے، خواہ وہ پیدائشی مسلمان ہوں یا پیدائشی ہندو یا کوئی اور..... پاکستان صرف وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس بات کی بہت کم توقع ہے کہ اس تحریک کے نتیجے میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہوگی، کیوں کہ خالص اسلامی حکومت کا قیام جس اخلاقی انقلاب پر منحصر ہے، وہ پاکستان کی تحریک سے رونما نہیں ہو سکتا۔ لیکن حکومت الٰہیہ اس کی محتاج نہیں ہے کہ کسی جگہ مسلمان قوم کی اکثریت پہلے سے موجود ہو۔ وہ تو ایک اخلاقی اور ذہنی اور تمدنی انقلاب کی دعوت ہے اور سارے انسانوں کے لیے خود انہی کی فلاح کے چند اصول پیش کرتی ہے۔ اس دعوت کو اگر پنجاب یا سندھ سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول کر لیں تو حکومتِ الٰہیہ یہاں قائم ہو سکتی ہے اور اگر مدراس یا بمبئی یا کوئی دوسرا علاقہ پیش قدمی کر کے اسے قبول کر لے تو حکومتِ الٰہیہ وہاں قائم ہو سکتی ہے۔ ہم اس دعوت کو مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، ہر ایک کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ مسلمانوں کی کوئی قومی جائداد نہیں ہے، بلکہ تمام مسلمانوں کی فلاح کے چند اُصول ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پیدائشی مسلمان اس دعوت کو قبول کرنے میں کوتاہی دکھائیں اور پیدائشی ہندو آگے بڑھ کر اسے قبول کر لیں۔

آپ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں ایک مشترکہ مقصد اور نصب العین کا فقدان ہندوؤں سے بھی کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ ہے اسلام سے بے نیاز ہو کر دنیوی معاملات کو خواہشات نفس اور غیر مسلم طور طریقوں کی تقلید سے حل کرنے کی کوشش کا۔ اگر مسلمان خالص اسلامی اُصول پر اپنے انفرادی و اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تو آپ ان کو ایک ہی مقصد اور ایک ہی نصب العین کے پیچھے اپنی ساری قوتیں صرف کرتے ہوئے پاتے۔ آپ نے مسلمانوں کے اندر خیالات اور اعمال کا جو انتشار محسوس کیا ہے اسے میں بھی ایک

مدت سے دیکھ رہا ہوں اور ہماری اسلامی تحریک کے ساتھ مسلمانوں کے مختلف طبقوں کا جو رویہ ہے وہ بھی میری نگاہ میں ہے۔ مگر ان چیزوں سے میرے اندر کوئی بددلی پیدا نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ان باتوں کی تہ میں جو اصلی خرابی ہے، اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ میں بددل نہیں ہوں بلکہ ایک بڑی حد تک پراُمید ہوں۔ جیسا کہ آپ نے خود بھی تحریر فرمایا ہے، مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی تیزی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرتا جا رہا ہے کہ جو چیز میں پیش کر رہا ہوں، یہی اصلی اور خالص اسلام ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کے موجودہ مختلف گروہ جس طرز پر کام کر رہے ہیں، اس سے ان کا فلاح کی منزل تک پہنچنا تقریباً محال ہے۔ لہٰذا اس امر کا قوی امکان ہے کہ مستقبل قریب میں مسلمان نوجوان ان مختلف گروہوں سے اور ان کی سیاست سے مایوس ہو جائیں گے اور ان کے لیے خالص اسلام کے اُصولوں پر کام کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوؤں میں بھی جب قوم پرستی سیاسی آزادی کی منزل پر پہنچ جائے گی تو انہیں سیاست اور معاشرت اور تمدن کی مشینری کو چلانے کے لیے کچھ اُصول درکار ہوں گے اور وہ گاندھی جی کے فلسفے میں، یا کانگریس کی وطن پرستی اور ہندو مہاسبھا کی قوم پرستی میں نہ مل سکیں گے۔ اس وقت ان کے لیے صرف دو ہی راستے ہوں گے۔ یا اشتراکیت کے اُصولوں کو اختیار کریں، یا پھر اسلام کے اُصولوں کو قبول کر لیں۔ اس موقع کے پیش آنے تک اگر ہم اُصول اسلام کے بے لاگ داعیوں کا ایک صالح گروہ منظّم کرنے میں کام یاب ہو گئے تو مجھے ۸۰ فی صدی اُمید ہے کہ ہم اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں کو اشتراکیت سے بچانے اور اسلام کے اُصولوں کی طرف کھینچ لانے میں کام یاب ہو جائیں گے۔

ہمارے اس مقصد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں اور ہندوؤں کی موجودہ قومی کش مکش ہے۔ مگر ہم اُمید کرتے ہیں کہ جس طریقے پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں، اس سے ہم ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری غیر مسلم قوموں کے اس تعصب کو جو وہ اسلام کے خلاف رکھتے ہیں بالآخر دور کر دیں گے اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیں گے کہ وہ اسلام کو خالص اُصولی حیثیت سے دیکھیں نہ کہ اس قوم کے مذہب کی حیثیت سے جس کے ساتھ دنیوی اغراض کے لیے ان کی مدتوں سے کش مکش برپا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۳ھ۔ نومبر، دسمبر ۴۴ء)

مسلم لیگ سے اختلاف کی نوعیت:

سوال:[1] کن اُصول، خطوط اور بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی ومعاشی اصلاح، ان حالات کے اندر رہتے ہوئے جن میں وہ گھرے ہوئے ہیں، اسلامی اُصول، روایات اور نقطۂ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براہِ کرم حسبِ ذیل خطوط پر اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجیے:

(الف) ایک ایسا قابلِ عمل دستور تجویز کیجیے جس کے ذریعے قومی احیا کے مشترکہ مقصد کے لیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مدارس فکر کو متحد اور مربوط کیا جاسکے۔

(ب) ایک ایسا اقتصادی نقشہ ونظام مرتب کیجیے جو اُصول اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

(ج) ہندوستانی مسلمان جن مخصوص حالات میں گھرے ہوئے ہیں، انہیں ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر اور جب وہ ایسی آزاد ریاستیں حاصل کرلیں جن میں ان کی اکثریت ہو، تو ایک ایسا نظامِ حکومت قائم کرسکیں جس میں مذہب اور سیاست کے درمیان ایک خوش آیند ہم آہنگی پیدا ہوجائے۔

(د) اسلامی اُصول، روایات، تصورات اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجیے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

(ر) مجموعی قومی بہبودی کی خاطر مذہبی ادارات یعنی اوقاف اور دوسرے ذرائع آمدنی کو ایک مرکز کے ماتحت منظّم کرنے کے لیے طریقِ کار اور نظام اس طرح مرتب کیجیے کہ ان اداروں پر قبضہ رکھنے والے اشخاص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف نظریات کا لحاظ رہے۔

جواب: آپ نے جو تفصیلی سوالات دریافت کیے ہیں، وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزا ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اسی بڑے سوال کو بیک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزا ہیں۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کس طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنہیں بنانا قرآن کا اصل منشا تھا۔ یہ ہے اصل سوال، اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہوجائیں گے۔

---

[1] یہ دراصل سوال نامہ ہے جو مسلم لیگ کی مجلس عمل کی جانب سے جاری کیا گیا تھا اور من جملہ دوسرے اصحاب اور ادارات کے مدیر ترجمان القرآن کو بھی بھیجا گیا تھا۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو، جو کچھ وہ ہے اور جو کچھ انسان سے اس کے مطالبات ہیں، واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور ان سے شعوری طور پر اسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انہوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظّم کرنا شروع کیا جائے اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تلقین کا سلسلہ اس ارادے کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کر لینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو، یعنی اسلام کو بہ حیثیت ایک نظام زندگی کے عملاً زمین پر قائم کرنا۔ اور اس کا ایک ہی اُصول ہو، یعنی اسلام کے خالص طریقے پر چلنا (خواہ یہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو) اور غیر اسلام کے ساتھ ہر مدارات و مصالحت (Compromise) اور ہر آمیزش و اختلاط کو قطعی چھوڑ دینا۔ اس نصب العین اور اس اُصول پر جو پارٹی کام کرے گی، اس کے لیے وہ سوالات جو آپ کے سامنے آ رہے ہیں، اوّل تو سرے سے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اگر ان میں سے بعض سوالات پیدا ہوئے بھی تو وہ اس شکل میں نہیں ہوں گے جس شکل میں آپ کے سامنے اب یہ سوالات آ رہے ہیں۔ انہیں کوئی نئی اسکیم وضع نہیں کرنی ہوگی بلکہ صرف وہ قوت فراہم کرنا ہوگی جس سے بنی ہوئی اسکیم کو نافذ کر سکیں۔ وہ اس کی پروا نہیں کریں گے کہ موجودہ حالات ہماری اسکیم کے نفاذ کے لیے سازگار ہیں یا نہیں۔ وہ ناسازگار حالات کو بزور بدلیں گے تاکہ وہ اس اسکیم کے لیے سازگاری کرنے پر مجبور ہوں۔ غرض یہ کہ ان کا نقطۂ نظر اِس معاملے میں اس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہوگا جو آپ حضرات نے اختیار کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات ایک ایسی پیچیدگی میں پڑ گئے ہیں جس کا کوئی حل شاید آپ نہ پا سکیں گے۔ وہ پیچیدگی یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اس پوری مسلمان قوم کو ''مسلمان'' کی حیثیت سے لے رہے ہیں جس کے ننانوے فی صدی افراد اسلام سے جاہل اور پچانوے فی صدی منحرف اور نوے فی صدی انحراف پر مصر ہیں۔ یعنی وہ خود اسلام کے طریقے پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اس منشا کو پورا کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کو مسلمان بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف آپ حالات کے اس پورے مجموعے کو جو اس وقت عملاً قائم ہے، تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کر لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حالات تو یہی رہیں اور پھر ان کے اندر کسی اسلامی اسکیم کے نفاذ کی گنجایش نکل آئے۔ یہی

چیز آپ کے لیے ایک بڑی پیچیدگی پیدا کرتی ہے، اور اسی وجہ سے میرا یہ خیال ہے کہ جن مسائل سے آپ حضرات تعرض کر رہے ہیں، ان کا کوئی حل آپ کچھ نہ پا سکیں گے۔

سوال: آپ کو علم ہوگا کہ مسلم لیگ نے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک مجلس عمل کا تقرر کیا ہے۔ پھر اس مجلس عمل نے مختلف ذیلی مجالس مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ انہی میں سے ایک مذہبی و معاشرتی حالات کی اصلاح کے لیے ہے جس کے داعی کی طرف سے آپ کو ایک سوال نامہ غالباً موصول ہو چکا ہوگا[1]۔ اس سوال نامے کو خاص توجہ کا مستحق سمجھیے اور ہر طرح کے اختلافات کو نظر انداز کر کے فکری تعاون فرمائیے۔ غنیمت سمجھنا چاہیے کہ ابھی تک مسلمانوں نے اپنی مذہبیت کو مغرب، کے سیلابِ الحاد کے مقابلے میں بچا رکھا ہے۔ اگر اس نازک لمحے میں ان کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو ممکن ہے کہ نوجوانانِ ملت ترکی اور ایران کے نقش قدم پر چل نکلیں۔

جواب: آپ کا عنایت نامہ آنے سے پہلے ہی میں لیگ کی مجلس عمل کو متذکرہ سوال نامے کا جواب دے چکا ہوں۔ آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا۔ دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ حصہ لوں تو کس طرح۔ ادھوری تدابیر (Half Measures) میرے ذہن کو بالکل اپیل نہیں کرتیں۔ نہ داغ دوزی (Patch Work) سے ہی مجھ کو کبھی دل چسپی رہی ہے۔ اور مجلس عمل کے پیش نظر یہی کچھ ہے۔ اگر کلی تخریب اور کلی تعمیر پیش نظر ہوتی تو میں بہ دل و جان اس میں ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ لیکن یہاں کل کو بجنسہ برقرار رکھتے ہوئے اس کے بعض اجزا کو ہٹا کر ان کی جگہ بعض دوسرے اجزا لا رکھنا مطلوب ہے، جس کے لیے کوئی قابل عمل اور نتیجہ خیز صورت سوچنے سے میرا ذہن عاجز ہے۔ میرے لیے یہی مناسب ہے کہ اس باب میں عملاً کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے ایک طالب علم کی طرح دیکھتا رہوں کہ سوچنے والے اس جزوی اصلاح و تعمیر کی کیا صورتیں نکالتے ہیں اور کرنے والے اسے عمل میں لا کر کیا نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع انہوں نے اس طریقے سے کوئی بہتر نتیجہ نکال کر دکھا دیا تو وہ میرے لیے ایک انکشاف ہوگا، اور ممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر میں مسلکِ کلی سے مسلکِ جزوی کی طرف منتقل (Convert) ہو جاؤں۔ (ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ۔ جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

---

[1] یہ وہی سوال نامہ ہے جو اوپر ہمارے جواب سمیت درج ہو چکا ہے۔

مطالبۂ پاکستان:

سوال: ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس لیے اس کا فطری نصب العین یہ قرار پاتا ہے کہ سارے عالم کو قانونِ الٰہیہ کے آگے مفتوح کر دے۔

لیکن مسٹر جناح اور ہمارے دوسرے مسلم لیگی بھائی پاکستان چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی زمین کا ایک گوشہ!..... تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔ کیا خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ قابل اعتراض نہیں؟

یہودی قوم مقہور و مغضوب قوم ہے۔ اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دنیا کے بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں لیکن ان کے قبضے میں ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ آج وہ اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکا والوں سے۔

میرے خیال میں مسلمان..... یا بالفاظِ دیگر مسلم لیگ بھی یہی کر رہی ہے۔ وہ یہودیوں کی طرح پاکستان کی بھیک کبھی ہندوؤں سے اور کبھی انگریزوں سے مانگتی پھر رہی ہے۔ تو پھر کیا یہ ایک مقہور اور مغضوب قوم کی پیروی نہیں ہے؟ اور کیا ایک مقہور و مغضوب قوم کی پیروی مسلمانوں کو بھی اسی صف میں لا کھڑا نہ کر دے گی؟

جواب: مطالبۂ پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل خیالات ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش'' حصہ سوم میں ملاحظہ فرمائیے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبے پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے۔ ان کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں۔ اُسے اگر ان کا قومی وطن کہا جا سکتا ہے تو اسی معنی میں جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی اصل پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک اُن کا قومی وطن نہیں ہے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے

مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں لا بسایا جائے اور اسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے۔ بخلاف اس کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے، اس سے اس کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ بالفاظ دیگر مسلمان یہ نہیں کہتے کہ ہمارے لیے ایک قومی وطن بنایا جائے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے، اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

یہ چیز وہی ہے جو آج کل دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے، اور اگر مسلمانوں کے مسلمان ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انہیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کے اس مطالبے کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اُصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اُصولاً یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کریں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملے میں یہ مطالبہ صحیح ہے، اسی طرح ان کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔

ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے پر جو اعتراض ہے، وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اُصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی اور علم بردار جماعت ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف ایک قوم ہونے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں ہو کر ایک ذرا سے خطے میں اپنی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین سمجھ رہے ہیں، لیکن اگر وہ نظامِ اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا پر اپنی، یعنی درحقیقت اپنے اس نظام کی جس کا وہ داعی ہے، حکومت کا مدعی ہو سکتا ہے اور صحیح طور پر سعی کرے تو اسے قائم بھی کر سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شوال ۶۳ھ۔ جولائی، اکتوبر ۴۴ء)

جماعتِ اسلامی اور صوبۂ سرحد کا ریفرنڈم:

سوال: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے صوبۂ سرحد میں اس سوال پر ریفرنڈم ہو رہا ہے کہ اس صوبے کے لوگ تقسیم ہند کے بعد اپنے صوبے کو ہندوستان کے ساتھ شامل کرانا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ۔ وہ لوگ جو جماعت اسلامی پر اعتماد رکھتے ہیں، ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو اس استصواب میں رائے دینی چاہیے اور کس طرف سے رائے دینی چاہیے؟ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس استصواب میں بھی ہماری پالیسی اسی طرح غیر جانب دارانہ ہونی چاہیے جیسے مجالسِ قانون ساز کے سابق انتخابات میں رہی ہے، ورنہ ہم پاکستان کے حق میں اگر ووٹ دیں گے تو یہ ووٹ آپ سے آپ اس نظام حکومت کے حق میں بھی شمار ہوگا جس پر پاکستان قائم ہو رہا ہے۔

جواب: استصوابِ رائے کا معاملہ مجالس قانون ساز کے انتخابات کے معاملے سے اُصولاً مختلف ہے۔ استصواب رائے صرف اس امر سے متعلق ہے کہ تم کس ملک سے وابستہ رہنا چاہتے ہو۔ ہندوستان سے یا پاکستان سے؟ اس معاملے میں رائے دینا بالکل جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ لہٰذا جن جن علاقوں میں استصوابِ رائے کیا جا رہا ہے وہاں کے ارکانِ جماعت اسلامی کو اجازت ہے کہ اس میں رائے دیں۔

رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں، تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی، کیوں کہ جماعت اپنے ارکان کو صرف ان اُمور میں پابند کرتی ہے جو تحریک اسلامی کے اُصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ معاملہ نہ اُصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لیے ارکانِ جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق جو رائے چاہیں دے دیں۔ البتہ شخصی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود صوبۂ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصوابِ رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اس علاقے کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو، اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔

پاکستان کے حق میں ووٹ دینا لازماً اس نظامِ حکومت کے حق میں ووٹ دینے کا ہم معنی نہیں ہے جو آیندہ یہاں قائم ہونے والا ہے۔ وہ نظام اگر فی الواقع اسلامی ہو، جیسا کہ وعدہ کیا جاتا رہا

ہے، تو ہم دل وجان سے اس کے حامی ہوں گے، اور اگر وہ غیر اسلامی نظام ہوا تو ہم اسے تبدیل کر کے اسلامی اُصولوں پر ڈھالنے کی جدوجہد اسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں۔ (سہ روزہ کوثر، مؤرخہ ۵ جولائی ۱۹۴۷ء)

حکومتِ الٰہیہ اور پاپائیت کا اصولی فرق:

سوال: ''رسالہ پیغامِ حق'' میں ابوسعید بزمی صاحب نے اپنے ایک مضمون کے سلسلے میں لکھا ہے:

''اسلامی ریاست کا ایک تصور وہ بھی ہے جسے حال ہی میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بڑے زور شور کے ساتھ پیش کیا ہے اور جس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔ تاریخی حیثیت سے یہ اُصول نیا نہیں۔ یورپ میں ایک عرصے تک تھیا کریسی (Theocracy) کے نام سے اس کا چرچا رہا اور روم کے پاپائے اعظم کا اقتدار اسی تصور کا نتیجہ تھا۔ لیکن لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ چوں کہ خدا کوئی ناطق ادارہ نہیں، اس لیے جس شخص کو خدا کے نام پر اختیار واقتدار مل جائے، وہ بڑی آسانی سے اس کا غلط استعمال کر سکتا ہے۔ مولانا مودودی کے حلقۂ خیال کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تصورِ سیاست پاپائے اعظم کے تصور سے مختلف ہے۔ لیکن چوں کہ وہ حکومت کو عوام کے سامنے جواب دہ قرار نہیں دیتے اور اسی بنیاد پر جمہوریت کو غلط سمجھتے ہیں اس لیے نتیجتاً ان کا تصور پاپائے اعظم ہی کا تصور ہو کر رہ جاتا ہے۔''

پھر بزمی صاحب اپنی طرف سے ایک حل پیش کرتے ہیں، لیکن وہ بھی وجہ تسلی نہیں ہوتا۔ آپ براہِ کرم ترجمان القرآن کے ذریعے سے اس غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں اور صحیح نظریے کی توضیح کر دیں۔

جواب: بزمی صاحب نے غالباً میرا مضمون ''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' ملاحظہ نہیں فرمایا ہے، ورنہ وہ دیکھتے کہ جو اعتراضات انہوں نے میرے مسلک پر کیے ہیں، ان کا پورا جواب اس مضمون میں موجود ہے۔ لیکن اگر انہوں نے اس مضمون کو پڑھا ہے اور پھر یہ اعتراضات کیے ہیں تو میں سوائے اس کے کہ اظہارِ تعجب کروں، اور کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ میرے اس مضمون میں یہ عبارتیں قابل ملاحظہ ہیں:

☆ ''مگر یورپ جس تھیا کریسی سے واقف ہے، اسلامی تھیا کریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیا کریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے اور عملاً اپنی خدائی تمام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی

حکومت کو الٰہی حکومت کہنے کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیا کریسی کو پیش کرتا ہے، وہ کسی مخصوص مذہبی طبقے کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرزِ حکومت کو الٰہی جمہوری حکومت (Theo-Democratic State) کے نام سے موسوم کروں گا، کیوں کہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حکومت عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی، مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے، سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے، اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔"

پھر میں نے اوپر کی عبارت کے نیچے حاشیے میں اس کی مزید تشریح کی ہے کہ

"عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیحؑ کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں، لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور انہیں یہ کہہ کر نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔"

کوئی شخص جو مسیحی مذہب اور پاپائیت کی تاریخ سے واقف ہے، میرے اِس اشارے کو جو میں نے ان چند فقروں میں کیا ہے، سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا۔ یورپ کا پاپائی نظام سینٹ پال کا پیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف ان اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہد نامے میں پائی جاتی ہیں۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں ہے جس پر ایک تمدن اور ایک سیاست کا نظام چلایا جا سکے۔ مگر جب پاپاؤں نے یورپ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ تھیا کریسی قائم کی تو اس کے لیے ایک قانون شریعت بھی وضع کیا، جو ظاہر ہے کہ کسی وحی والہام سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ خود ان کا گھڑا ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے جو نظام عقائد، جو مذہبی اعمال ورسوم، جو نذریں اور نیازیں، جو معاشرتی ضوابط وغیرہ تجویز کیے تھے، ان میں سے کسی کی سند بھی ان کے پاس کتاب اللہ سے نہ تھی۔ اسی طرح انہوں نے خدا اور بندے کے درمیان مذہبی منصب داروں کو جو ایک مستقل واسطہ قرار دے دیا تھا، یہ بھی ان کا خود ساختہ تھا۔ نیز انہوں

نے نظامِ کلیسا کے کار پردازوں کے لیے جو حقوق اور اختیارات تجویز کیے تھے اور جو مذہبی ٹیکس لوگوں پر لگائے تھے، ان کے لیے بھی کوئی ماخذ ان کی اپنی ہوائے نفس کے سوا نہ تھا۔ ایسے نظام کا نام چاہے انہوں نے تھیا کریسی رکھ دیا ہو، لیکن وہ فی الحقیقت تھیا کریسی نہیں تھا۔ اس کو آخر اسلام کی حکومتِ الٰہیہ یا شرعی حکومت سے کیا مماثلت ہو سکتی ہے جس کے لیے کتاب وسنت کی صورت میں بالکل واضح اور نا قابل خدف وترمیم قانون موجود ہے، اور جس کو چلانا کسی مخصوص مذہبی طبقے کا اجارہ نہیں ہے۔

پھر بزمی صاحب کا یہ ارشاد بالکل عجیب ہے کہ ہم خلیفہ کو وہی حیثیت دیتے ہیں جو خود عیسائیوں میں پوپ کی حیثیت ہے اور یہ کہ ہم اسے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ اس کے جواب میں میں پھر اپنے اسی مضمون کی چند عبارتیں نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔ میں نے آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ [النور 55:24] سے استنباط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے، وہ عمومی خلافت ہے۔

پھر آگے چل کر میں نے لکھا ہے کہ:

''یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکمِ مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے، اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفا اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفا کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔''

اس کے بعد میں نے پھر اسی مضمون میں دوسرے مقام پر تصریح کی ہے کہ:

''اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے، اس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کے لیے خلیفہ کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام

مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مرتکز ہوگئی ہے۔"

اس کے بعد یہ فقرہ بھی میرے اسی مضمون میں موجود ہے کہ:

"امیر تنقید سے بالاتر نہ ہوگا۔ ہر عامی مسلمان اس کے پبلک کاموں ہی پر نہیں، بلکہ اس کی پرائیویٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا۔ وہ قابل عزل ہوگا۔ قانون کی نگاہ میں اُس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی۔ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاسکے گا اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا۔ امیر کو مشورے کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ مجلس شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی مانع شرعی نہیں ہے کہ اِس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے۔ ہر صورت میں عامۂ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفسانیت کے ساتھ؟ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اُتار لا سکتی ہے۔"

ان تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی شخص ہماری تھیاکریسی کو پاپایانِ روم کی قائم کردہ تھیاکریسی سے مشابہ قرار دے تو بہرحال ہم اسے اس کی آزادیِ رائے سے محروم کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ مگر یہ ضرور عرض کریں گے کہ یہ رائے علم و دلیل سے آزاد ہے۔

(ترجمان القرآن۔ رجب ۶۵ھ، جون ۴۶ء)

نظامِ کفر کی قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ:

سوال: آپ کی کتاب "اسلام کا نظریۂ سیاسی" پڑھنے کے بعد یہ حقیقت تو دل نشین ہوگئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا ہی کے لیے مختص ہے، اور اس حقیقت کے مخالف اُصولوں پر بنی ہوئی قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننا عین شریعت کے خلاف ہے۔ مگر ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر تمام مسلمان اسمبلیوں کی شرکت کو حرام تسلیم کرلیں تو پھر سیاسی حیثیت سے مسلمان تباہ ہوجائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی قوت ہی سے قوموں کی فلاح و بہبود کا کام کیا جاسکتا ہے اور ہم نے اگر سیاسی قوت کو بالکلیہ غیروں کے حوالے ہوجانے دیا تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اغیار مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں۔ پھر آپ اس سیاسی تباہی سے بچنے کی کیا صورت مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں؟

جواب: آپ نے اپنے سوال میں سوچنے کا انداز غلط اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ نظام جس میں انسان خود اپنا قانون ساز بنتا ہے یا دوسرے انسانوں کو قانون سازی کا حق دیتا ہے، سرے سے غلط ہے۔ نیز یہ بات بھی آپ سمجھ چکے ہیں کہ امر حق یہی ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان کا کام اس کے حکم کا اتباع کرنا ہے نہ کہ خود واضع حکم بن جانا۔ اب آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمان جن کے مفاد کی آپ فکر کر رہے ہیں، کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بنانے گئے تھے؟ آیا اس غرض کے لیے کہ وہ اس امرِ حق کو جو قرآن سے ثابت ہے دنیا کے سامنے پیش کریں، اس کو تسلیم کرائیں، خود اپنی زندگی کو اس پر قائم کریں اور دنیا میں اس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دیں؟ یا اس غرض کے لیے کہ اس کے بالکل برخلاف جو باطل بھی دنیا میں قائم ہو جائے (اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اس کی موافقت کریں اور اس کو اپنا لیں اور اسے مٹانے کی سعی سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے؟ اگر پہلی بات ہے تو مسلمان آج جو کچھ کر رہے ہیں غلط کر رہے ہیں، اور ان کا مفاد اگر اس غلطی سے وابستہ ہے تو ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ ایسے مفاد کی پروا کی جائے۔ ایسی صورت حال میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ لگ کر جہنم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امرِ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ لیکن اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، حق کو حق جاننے کے باوجود خلاف حق طریقے پر اگر محض قومی مفاد کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسمبلیوں سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظامِ حکومت کے تنہا مالک و متصرف بن جائیں گے، اور اگر نظامِ باطل کے کل پرزے ہم نہ بنیں تو دوسرے بن جائیں گے اور اس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو ختم کر دیں گے، حتیٰ کہ اسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہول ناک ہیں، اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کر کے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں اور گوشوں میں جا بیٹھیں، تو یہ اندیشے ضرور کسی حقیقت پر مبنی ہوتے۔ لیکن ہم اس نفی کے ساتھ ساتھ ایک اثبات بھی تو پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اس نظام کے ساتھ سازگاری کرنے

کے بجائے دنیا میں نظامِ حق قائم کرنے کے لیے منظّم سعی شروع کر دیں۔ دوسری قوموں کے ساتھ اپنے دنیوی مفاد کے لیے کش مکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے وہ دین حق پیش کریں جس کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے اور قرآن کے ذریعے سے، سیرتِ رسولؐ کے ذریعے سے، اور اخلاق اسلامی کے ذریعے سے دنیا میں فکری، اخلاقی، معاشی، تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری اس دعوت کے جواب میں دو صورتیں پیش آسکتی ہیں:

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان جن کی تعداد دس کروڑ ہے اور جن کے پاس مادی وسائل اور ذہنی اور دماغی قوتوں اور ہاتھ پاؤں کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے، بیک وقت ہماری اس دعوت کو قبول کر لیں، ذہنی اور اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے (جس کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہے) تو آپ تو یہ اندیشہ کر رہے ہیں کہ کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا، اور میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں، دنیا کا ایک بڑا حصہ آپ کے ہاتھ آجائے گا، ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گا، ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کو قائم ہونے سے کوئی طاقت نہ روک سکے گی، بہت قلیل مدت کے اندر مسلمان ممالک کی بھی کایا پلٹ جائے گی اور خود وہ قوتیں بھی جو آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، مسخر ہونے سے محفوظ نہ رہ سکیں گی۔

دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے (اور یہی اس وقت متوقع بھی ہے) کہ مسلمانوں میں سے بتدریج تھوڑی تھوڑی تعداد میں پاک نفس اور اعلیٰ درجے کے ذہن رکھنے والے لوگ ہماری اس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے اور جب تک صالحین کا یہ گروہ منظّم ہو کر ایک طاقت بنے، عام مسلمان اپنے لیڈروں کی پیروی میں وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ایک مدت سے کرتے آرہے ہیں اور آج کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ خطرہ پیش نہیں آسکتا جس کا آپ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں۔ کیوں کہ غلط کار مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت وہ سارے کام کرنے کے لیے موجود رہے گی جن کے نہ کرنے سے آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا قومی مفاد خاک میں مل جائے گا۔ البتہ اگر یہ سارے کام ہوتے رہیں اور صرف وہی ایک کام نہ ہو جس کی طرف ہم بُلا رہے ہیں اور اگر ہم بھی امرِ حق اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے محض قوم اور اس کے مفاد کی فکر میں

ان باطل کاریوں کی طرف دوڑ جائیں جو آج اسلام اور مسلم مفاد کے نام سے ہو رہی ہیں، تو یقین رکھیے کہ اسلام کا جھنڈا تو خیر کیا بلند ہوگا، مسلمان قوم اس ذلت وخواری اور اس پستی کے گڑھے سے بھی نہ نکل سکے گی جس میں وہ یہودیوں کی طرح صرف اس لیے مبتلا ہوئی ہے کہ خدا کی کتاب رکھتے ہوئے اس نے اس کتاب کا منشا پورا کرنے سے منہ موڑا۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۶۵ھ۔ دسمبر ۴۵ء)

غیر اسلامی اسمبلیوں کی رکنیت اور نظام کفر کی ملازمت شرعی نقطۂ نظر سے:

سوال: مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اسمبلی کی ممبری جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے نمایندے اسمبلی کی رکنیت کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں اور ان کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجھ پر دباؤ پڑ رہا ہے، حتیٰ کہ علما تک کا مطالبہ یہی ہے۔ اگرچہ مجملاً جانتا ہوں کہ انسانی حاکمیت کے نظریے پر قائم ہونے والی اسمبلی اور اس کی رکنیت دونوں شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہیں، مگر تاوقتیکہ معقول وجوہ پیش نہ کرسکوں، ووٹ کے مطالبے سے چھٹکارا پانا دشوار ہے۔

یہ امر بھی دریافت طلب ہے کہ سرکاری ملازمت کی حیثیت کیا ہے؟ اس معاملے میں بھی سرسری طور پر میری رائے عدم جواز کی طرف مائل ہے مگر واضح دلائل سامنے نہیں ہیں۔

جواب: اصولی حیثیت سے یہ بات واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ موجودہ زمانے میں جتنے جمہوری نظام بنے ہیں (جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں) وہ اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ باشندگانِ ملک اپنے دنیوی معاملات کے متعلق تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق اور معاشرت کے اُصول خود وضع کرنے اور ان پر تفصیلی قوانین وضوابط بنانے کا حق رکھتے ہیں اور اس قانون سازی کے لیے رائے عام سے بالاتر کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نظریہ، اسلام کے نظریے کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام میں توحید کے عقیدے کا لازمی جز یہ ہے کہ لوگوں کا اور تمام دنیا کا مالک اور فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے، ہدایت اور حکم دینا اس کا کام ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت اور اس کے حکم سے اپنے لیے قانونِ زندگی اخذ کریں، نیز اگر اپنی آزادیِ رائے اختیار کریں بھی تو اُن حدود کے اندر کریں جن میں خود اللہ تعالیٰ نے ان کو آزادی دے دی ہے۔ اِس نظریے کی رُو سے قانون کا ماخذ اور تمام معاملاتِ زندگی میں مرجع اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت قرار پاتی ہے، اور اس نظریے سے ہٹ کر اوّل الذکر جمہوری نظریے کو قبول کرنا گویا

عقیدۂ توحید سے منحرف ہوجانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانے کے جمہوری اُصول پر بنی ہیں، ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی حرام ہے۔ کیوں کہ ووٹ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کیجیے۔ اس مسئلے کی تفصیل اگر آپ سمجھنا چاہیں تو میری کتاب ''سیاسی کش مکش'' حصہ سوم اور ''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' ملاحظہ فرمائیں۔

اس قسم کے معاملات میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چوں کہ یہ نظام مسلط ہو چکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں، اس لیے اگر ہم انتخابات میں حصہ نہ لیں اور نظام حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات پہنچ جائیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو جو اُصولاً حرام ہو، حلال ثابت نہیں کیا جاسکتا، ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو مصلحتوں اور ضرورتوں کی بِنا پر حلال نہ ٹھہرالیا جائے۔ اضطرار کی بِنا پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے اضطرار کی حالتیں پیدا کریں، پھر اس اضطرار کو دلیل بنا کر تمام محرمات کو اپنے لیے حلال کرتے جائیں اور بجائے خود اس اضطرار کی حالت کو ختم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔ جو نظام اس وقت مسلمانوں پر مسلط ہوا ہے، جس کے تسلط کو وہ اپنے لیے دلیلِ اضطرار بنا رہے ہیں، وہ آخر ان کی اپنی ہی غفلتوں کا تو نتیجہ ہے۔ پھر اب بجائے اس کے کہ اپنا سرمایۂ وقت و عمل اس نظام کو بدلنے اور خالص اسلامی نظام قائم کرنے کی سعی میں صرف کریں، وہ اس اضطرار کو حجت بنا کر اسی نظام کے اندر حصہ دار بننے اور پھلنے پھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دوسری چیز جو آپ نے دریافت کی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک انفرادی معاملات کا تعلق ہے، ایک فردِ مسلم اگر کسی فردِ غیر مسلم سے اجرت یا تنخواہ پر کسی خدمت کے ادا کرنے کا معاملہ طے کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ وہ خدمت براہِ راست کسی حرام سے متعلق نہ ہو۔ لیکن علما کا ایک بڑا گروہ اس بنیاد پر حکومت کفر کی ملازمت کو جائز ٹھیرانے کی جو کوشش

کرتا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ لوگ اس اُصولی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ایک فردِ غیر مسلم کے شخصی کاروبار اور ایک غیر اسلامی نظام کے اجتماعی کاروبار میں ہے۔ ایک غیر اسلامی نظام تو قائم ہوتا ہی اس غرض کے لیے ہے اور اس کے سارے کاروبار کے اندر ہر حال اور ہر پہلو میں مضمر ہی یہ چیز ہوتی ہے کہ اسلام کے بجائے غیر اسلام، طاعت کے بجائے معصیت، اور خلافتِ الٰہی کے بجائے خدا سے بغاوت انسانی زندگی میں کارفرما ہو، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز حرام اور تمام محرمات سے بڑھ کر حرام ہے۔ لہٰذا ایسے نظام کو چلانے والے شعبوں میں یہ تفریق نہیں کی جا سکتی کہ فلاں شعبے کا کام جائز نوعیت کا ہے اور فلاں شعبے کا ناجائز۔ کیوں کہ یہ سارے شعبے مل جل کر ایک بہت بڑی معصیت کو قائم کر رہے ہیں۔ اس معاملے کی ٹھیک ٹھیک نوعیت سمجھنے کے لیے یہ مثال کافی ہوگی کہ اگر کوئی ادارہ اس غرض کے لیے قائم ہو کہ عامۃ الناس میں کفر کی اشاعت کرے اور مسلمانوں کو مرتد بنائے تو اس ادارے کا کوئی کام اجرت پر کرنا، خواہ وہ کام بجائے خود حلال قسم کا ہو (مگر اس ادارے کی تقویت اور اس کے کام کو فروغ دینے کے لیے بہر حال ناگزیر ہو) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہو سکتا۔

اس معاملے میں بھی آخر کار مسلمان اضطرار والی حجت پیش کرنے پر اُتر آتے ہیں کہ اگر ہم اس حکومت کی مشینری میں کل پرزے نہ بنیں گے تو غیر مسلم اس پر قابض ہو جائیں گے اور تمام اقتدار ان کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ لیکن اس کا جواب وہی ہے جو پہلے مسئلے میں اضطرار کی دلیل پر دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ محرم ۶۵ھ۔ دسمبر ۴۵ء)

پُر امن انقلاب کا راستہ:

سوال: ذیل میں دو شبہات پیش کرتا ہوں۔ براہِ کرم صحیح نظریات کی توضیح فرما کر انہیں صاف کر دیجیے:

۱۔ ترجمان القرآن کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظّم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظّم اسٹیٹ تھا اور انہوں نے جب ریاست کو اقتدار کلی منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اسے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریقِ کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ اسٹیٹ اس دور سے کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چکا ہے، اس قسم کا طریق کار اختیار کیا

جاسکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا[1]۔ مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ ہمارے لیے تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ واجب الاتباع ہے۔ آپ نے اہل مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رّد کر کے اپنے ہی خطوط پر جداگانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور ہمارے لیے بھی طریق کار اب یہی ہے۔ واضح فرمائیے کہ میری یہ رائے کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔

۲۔ آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مرحلے پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں سے نظامِ باطل کو اپنے اُصول پر ڈھالا جاسکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانے میں تامل نہ ہوگا۔ اس جملے سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ جماعت اسلامی بھی ایک حد تک اسمبلیوں میں آنے کے لیے تیار ہے اور الیکشن کو جائز سمجھتی ہے۔ اس معاملے میں جماعتی مسلک کی توضیح فرمائیے۔

جواب: ہمارے لیے سارے انبیا علیہم السلام واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ہدایت تھی کہ اسی طریق پر چلیں جو تمام انبیا کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملے میں کسی نبی نے کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس طریق کار کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو تو وہ ویسا ہی دینی طریقِ کار ہے جیسے کہ وہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے۔ یہ بات اگر یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبی کریم نے اس پر لعنت بھیجی اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے، وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قبول کر لینے سے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دین حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی کریمؐ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپؐ بھی اسے قبول کر لیتے اور خواہ مخواہ لڑ کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ کرتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح کبھی

---

[1] یہ خط اور اس کا جواب اس مجموعے کے آخری باب میں ''ہمہ گیر ریاست میں تحریک اسلامی کا طریق کار'' کے زیر عنوان درج ہے۔

ہم کو اگر یہ توقع ہو کہ ہم رائے عام کی تائید سے نظامِ حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اس کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

۲۔ الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقے سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقے سے حاصل ہو سکتی ہو، اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:

اوّلاً، ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً، ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگانِ ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً، انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آیندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔ (ترجمان القرآن، محرم ۶۵ھ، دسمبر ۴۵ء)

ملک کے نظم اور امن کی پاس داری:

سوال: کیا ایک کافر حکومت کے اندر رہتے ہوئے یہ جائز ہے کہ آدمی لائسنس کے بغیر یا مقررہ موسموں اور اوقات میں شکار کھیلے اور بغیر لیمپ کے راتوں کو موٹر یا بائیسکل چلائے؟

جواب: جب کہ آپ ایک کافر حکومت کے اندر رہتے ہیں تو انتظام ملکی کو برقرار رکھنے کے لیے جو ضابطے اس نے بنائے ہیں، اور جو قوانین ایک منظّم سوسائٹی کو بحال رکھنے کے لیے بہر حال ضروری ہیں، انہیں خواہ مخواہ توڑنا آپ کے لیے درست نہیں ہے۔ قانون شکنی ہم صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب کہ ہم ایسی پوزیشن میں ہوں کہ موجودہ نظم (Order) کو توڑ کر جلدی سے جلدی

دوسرا صالح تر نظم قائم کرسکیں، اور اُس صورت میں بھی صرف وہ قوانین توڑے جائیں گے جن کا توڑنا اس مقصدِ خاص کے لیے مفید اور ضروری ہو۔ ورنہ قانون شکنی کے معنی بدنظمی (Disorder) پیدا کرنے کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی زمین میں نظم دیکھنا چاہتا ہے نہ کہ بدنظمی۔ اس لیے اگر آپ خواہ مخواہ اس کی زمین کا نظم بگاڑیں گے تو اس کی تائید سے محروم رہیں گے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم، صفر ۶۴ھ۔ جنوری، فروری ۴۵ء)

غیر اسلامی حکومت کے ذریعے سے تحصیلِ زکوٰۃ:

سوال: حالاتِ حاضر کا پیدا کردہ ایک سوال دریافت کرتا ہوں۔ یہ کہ کیا ہماری شریعت میں کسی کافر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہم سے صدقات واجبہ وصول کرے یا یہ کہ حکومت کفر کی قانونی قوت کے ذریعے ان کی وصولی کا اہتمام کیا جائے، اور وہ اس طرح کہ اسمبلی میں ایک زکوٰۃ بل پاس کرالیا جائے؟ اُمید ہے کہ واضح جواب دیا جائے گا۔

جواب: زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کی تقسیم کا نظام اگر قائم ہوسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ مسلمانوں کا کوئی آزاد اجتماعی نظام ہو جو بااختیار بھی ہو اور وہ اس کو انجام دے۔ رہی یہ صورت کہ ایک ایسی اسمبلی میں زکوٰۃ بل پاس کرایا جائے جس کی اکثریت غیر مسلم ہے اور جو قانونِ اسلام کو بالاتر قانون تسلیم نہیں کرتی تو یہ چیز شرعاً بالکل غلط ہے اور اس طریقے سے اگر غیر مسلم حکومت کے زیرِ اثر زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا انتظام کیا گیا تو شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

(ترجمان القرآن۔ شوال ۶۵ھ۔ ستمبر ۴۶ء)

.....☆☆☆.....

جماعت اسلامی
اور
اس کی تحریک سے متعلق

تحریکِ اقامتِ دین کے بارے میں چند سوالات:

سوال: جماعت اسلامی کی شرکت کو اپنے لیے لازمی سمجھ لینے کے باوجود مجھے چند شبہات اپنے دل میں کھٹکتے محسوس ہو رہے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو اپنی بصیرت سے ان اُلجھنوں کو صاف کر دیجیے۔

شبہات یہ ہیں:

۱۔ آپ اپنی تحریروں کے ذریعے برسوں سے اقامت دین کی دعوت دے رہے ہیں۔ دو سال سے جماعت بھی قائم ہے۔ بقول آپ کے اس تحریک کے مزاج کے مطابق بہت تھوڑے آدمی ملے ہیں، اور جو ملے ہیں ان میں وہ صفات بہت کم ہیں جن صفات کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ صفات لوگوں میں کیسے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ جہاں تک اُمت کی تاریخ کا تعلق ہے، خلافتِ راشدہ کے بعد اقامتِ دین کی منظّم تحریک کبھی بروئے کار آئی ہی نہیں۔ مجددین نے زبان و قلم یا جسم سے جو کیا، ذاتی طور پر کیا۔ شاید پورے اسلامی دور میں صرف حضرت سیّد احمد بریلوی کے زیرِ علم ایک منظّم جہاد اس مقصد کے لیے کیا گیا۔ میں ان کے رفقا کے عزم و عمل پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں وہ والہانہ اور مجنونانہ جذب و جوش کیسے پیدا ہوا۔ کسی جماعت میں وہ نشہ کیسے چڑھا کرتا ہے جب وہ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کر دینا ہی اپنا عزیز فرض سمجھنے لگتی ہے؟ کیا یہ سب کچھ تحریر کی اور تقریری دعوت و تفہیم سے ہو جاتا ہے یا محض عمدہ اور صحیح لٹریچر فراہم کر دینے سے؟ میرا یہ خیال ہے کہ یہ سب چیزیں ذہنی اصلاح تو کر دیتی ہیں لیکن جنونِ عمل پیدا کرنے والی کوئی اور ہی چیز ہوتی ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ عہد کر کے اس کا حق ادا نہیں کرتے اور خلوص و ایثار کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبے کو کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ میں آپ کا لٹریچر پڑھ کر اور قرآن حکیم کا مطالعہ کر کے خود اپنے اندر یہ خواہش پاتا ہوں کہ میرے عمل میں انقلاب ہو۔ لیکن جس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہوں، وہ پیدا نہیں ہوتی۔ معلوم نہیں وہ کون سی طاقت ہے جو اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب تک جماعت اسلامی میں یہ طاقت نمودار نہ ہوگی، شرکائے جماعت میں ایثار و عمل کا مطلوبہ جذبہ پیدا نہ ہوگا اور

تحریک ٹھنڈی پڑ جائے گی۔

۲۔ ایک اُلجھن اقامتِ دین کی راہ کے نشانات اور مراحل کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں جس طرح کے مراحل دیے گئے ہیں، ان میں جس طرح کی رہنمائی ہوتی گئی اور جس طرح کی غیبی نصرت وتائید کا ظہور ہوتا گیا، ان سب میں ذاتِ رسول اور وحی کی رہنمائی موجود تھی۔ اب یہ کون بتائے گا کہ ہمارے راستے کے مراحل کون کون سے ہیں اور ان کو کس کس طرح عبور کرنا ہے؟

۳۔ صحابہ کی زندگی کو دیکھیے تو تعجب ہوتا ہے کہ چھوٹے بڑے، اُونچے نیچے، محتاج اور غنی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک وسیع خاندان کے رشتے میں پروئے گئے تھے۔ ایک کی تکلیف سب کی تکلیف ہوتی تھی اور ایک کا فاقہ سَب کا فاقہ ہوتا تھا۔ ایک کا بوجھ اُٹھانے کے لیے سب کے بازو حرکت میں آجاتے تھے۔ مگر ہمارا حال کیا ہے؟ اگر ہمارے بچے فاقہ کشی کر رہے ہیں اور ہم فکرِ معاش میں بدحواس ہو رہے ہیں تو ہم ان رفیقوں کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں جو ان مشکلات کی تلخیوں سے نا آشنا ہیں۔ کبھی کبھی اس اُلجھن میں پڑ جاتا ہوں کہ وہ زندگی جو عہد رسالت وصحابہ کے اندر پیدا ہوگئی تھی اس عہد کے لیے خاص تو نہ تھی۔ کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ اس زندگی کی فطرت ہی ایسی ہے کہ یہ عام نہیں ہوسکتی۔ میں سوچتا ہوں کہ ہمیں اپنے جذبۂ رفاقت کو اتنا زوردار بنانا چاہیے کہ جماعت ایک خاندان کی شکل اختیار کر جائے، اور جماعت کے استحکام کے لیے یہ ایک لازمی چیز ہے۔

جواب: (۱) اس مسئلے پر میں خود برسوں غور کرتا رہا ہوں اور آخر کار اس مختصر سے فقرے نے جو عام طور پر مسلمانوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے، مجھے مطمئن کر دیا، یعنی ''السعی منی والاتمام من اللّٰہ'' میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم جس بات پر مامور ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ مختلف راہوں میں سے اس راہ کو اپنے لیے منتخب کرلیں جسے ''صراطِ مستقیم'' کہا گیا ہے، اور اپنی تمام ممکن سعی وجہد اس پر چلنے میں صرف کر دیں۔ اس کے بعد اسباب کی فراہمی اور راہ نوردی کی قوت اور مشکلاتِ راہ کی تسہیل، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے۔ میں اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اگر بڑے پیمانے پر سعی کرنے اور بلند درجے پر پہنچنے کی توقع نہ ہو تو ہم صحیح راہ کو چھوڑ کر کسی ایسی غلط راہ کی طرف چل پڑیں جس میں کچھ بڑے اور بلند درجے کا کام کیا جاسکتا ہو۔ ہمیں بہر حال صحیح کام کرنا

ہے، خواہ وہ بڑے پیمانے پر ہو یا چھوٹے پیمانے پر۔

یہ تو اس معاملے کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جن غیر معمولی اخلاقی قوتوں کی اس کام کے لیے ضرورت ہے اور جیسی مؤثر شخصیت یا شخصیتیں اس کام میں جان ڈالنے کے لیے ضروری ہیں، وہ بہر حال حجروں میں پیدا نہیں ہو سکتیں، بلکہ اس راہ کی عملی جدوجہد کے نتیجے ہی میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔ ابھی اس سعی کی ابتدا ہے اور آزمایش کے لمحات بہت کم آئے ہیں، اس وجہ سے اس سعی کے مردم ساز اثرات آپ کے سامنے پوری طرح نمایاں نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن آگے چل کر جیسے جیسے امتحان کے مواقع سامنے آتے جائیں گے، آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اللہ سے گہرا تعلق رکھنے والے نہیں ہیں، وہ کسی نہ کسی امتحان کی گھڑی پر اپنی کمزوری کے خود شکار ہو جائیں گے اور راستے سے ہٹ جائیں گے، اور جن لوگوں کو فی الواقع اللہ سے تعلق ہوگا وہ نہ صرف یہ کہ ایک ایک امتحان کے موقع پر کامیاب ہوں گے بلکہ ہر امتحان ان کی سیرت میں ایک نئی طاقت پیدا کر دے گا، ان کے اندر کی بہت سی کھوٹ نکال دے گا اور بالآخر وہ زرِ خالص بن جائیں گے۔ پھر رفتہ رفتہ انہی لوگوں میں پارس کی سی خصوصیات پیدا ہو جائیں گی کہ جو ان سے چھو گیا وہ سونا بن گیا۔

بہر حال میں اس معاملے میں مطمئن ہو چکا ہوں کہ اس کام کو شروع کرنے سے پہلے مکمل شخصیت یا شخصیتوں کے موجود ہونے کی شرط لگانا غلط ہے۔ یہ شرط کبھی متحقق نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس صحیح یہ ہے کہ ایک مرتبہ خلوصِ نیت کے ساتھ یہ کام شروع کر دیا جائے تو رفتہ رفتہ یہی کام خود مکمل شخصیتیں بناتا چلا جاتا ہے، اور جتنا جتنا یہ اپنی تکمیل کے مراحل کی طرف بڑھتا ہے اتنی ہی بلند تر شخصیتیں اس کے کارکنوں میں سے اُبھرتی چلی آتی ہیں۔ سمندر کی موجوں سے لڑنے کے لیے آپ ایسے آدمی کبھی نہیں لا سکتے جو سمندر کے اندر اُترنے سے پہلے اس کی موجوں سے لڑنے کی قوت فراہم کر چکے ہوں۔ یہ قوت تو بہر حال سمندر میں کودنے اور موجوں سے لڑنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ جو کمزور ہیں وہ اسی سمندر میں ڈوب مرتے ہیں، اور جن کے دست و بازو میں اللہ نے قوت پیدا کی ہے وہ تھپیڑے کھا کھا کر اور موجوں سے لڑ لڑ کر بالآخر پیراکوں کے پیراک بن جاتے ہیں۔

۲۔ اقامتِ دین کی راہ کے مراحل مقرر نہیں ہیں۔ بلکہ ان مراحل کو جدوجہد اور وہ حالات جو جدوجہد کے دوران میں پیش آئیں، اور وہ بصیرت جو اسلام کی روح کو سمجھنے والے رہنما کے اندر ہوتی ہے، یہ سب چیزیں مل جل کر معین کرتی ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی زندگیوں میں ہم کو یہی نظر آتا

ہے کہ سب کے سب ایک ہی قسم کے مراحل سے نہیں گزرے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت یوسفؑ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ دراصل جو چیز درکار ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے مقصد معین ہو اور ہمارے اندر وہ حکمت موجود ہو جو اس مقصد تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے اور ہم انبیا علیہم السلام کے طریق کار کو اچھی طرح سمجھ کر عملاً جدوجہد شروع کر دیں۔ پھر جو جو مراحل سامنے آتے جائیں گے، ان میں سے ہر مرحلے کے تقاضوں کو ہم اپنی حکمت سے سمجھتے جائیں گے اور اللہ کے بھروسے پر ان کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرتے جائیں گے۔

رہا آپ کا یہ خیال کہ پہلے تو وحی کی رہنمائی کام کرتی تھی اس لیے صحیح وقت پر صحیح تدبیر اختیار کر لی جاتی تھی، مگر اب کیا ہوگا؟ تو اس کا جواب قرآن مجید میں دے دیا گیا ہے کہ ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا''۔ وہ خدا جو پہلے رہنمائی کرتا تھا وہی اب بھی رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہے۔ اس کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے والے موجود ہونے چاہییں۔ ہمارے اندر اگر ایک دو آدمی بھی ایسے موجود رہیں جو قرآن کی روح اپنے اندر جذب کر چکے ہوں، اور جماعت میں کم از کم ایک معتدبہ اکثریت ایسے لوگوں کی موجود رہے جو قلب سلیم کی نعمت سے بہرہ ور ہوں اور صحیح وغلط رہنمائی میں امتیاز کر سکتے ہوں اور جن میں صحیح رہنمائی کے لیے سمع وطاعت کا مادّہ موجود ہو، تو ان شاء اللہ خدا کی رہنمائی بھی ہمیں ہر مرحلے پر حاصل ہوگی اور ہم اس کی رہنمائی سے فائدہ بھی اُٹھا سکیں گے۔

۳۔ صحابہ کی جماعت کے متعلق جو نقشہ تذکروں میں کھینچا گیا ہے، اس میں ایک حد تک تو مبالغہ ہے اور ایک حد تک حقیقت ہے۔ پھر جو حقیقت ہے وہ بھی پوری طرح اس وقت برسرکار آئی تھی جب ایک طویل مدت کی جدوجہد نے ان کے اندر باہمی رفاقت کی اسپرٹ پیدا کر دی تھی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جو خصوصیات ان کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے زبردست رہنما کی رہنمائی سے چودہ پندرہ سال کی مسلسل تربیت کے بعد پیدا ہوئی تھیں، انہیں ہم پہلے ہی مرحلے پر موجود دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر مدینہ طیبہ میں صحابہ کے درمیان رفاقت کی جو اسپرٹ تھی، اس میں بہت بڑا دخل ان کی یک جائی کو بھی تھا۔ منتشر طور پر عرب کے مختلف حصوں میں جو لوگ پھیلے ہوئے تھے، ان کے ساتھ وہ رفاقت ممکن نہیں تھی، جو مدینے میں سمٹ آنے والے لوگوں کے ساتھ تھی، مگر

یہاں ابھی تک ہماری اجتماعی زندگی سرے سے بنی ہی نہیں ہے۔ منتشر افراد ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں جو ابھی ایک دوسرے سے آشنا تک نہیں۔ ان کے اندر آخر رفاقت کی وہ شان کیسے پیدا ہو سکتی ہے جو صرف یک جائی زندگی ہی میں ممکن ہے؟

میں چاہتا ہوں کہ جو لوگ ہمارے ہم خیال ہیں، وہ عہدِ صحابہ کو مجرد کرامتوں اور معجزات کی اسپرٹ میں سمجھنے کے بجائے فطری اسباب کے مطابق سمجھنے کی کوشش کریں۔ ورنہ ہر وہ چیز جو اس دور میں پیدا ہوئی تھی، اس کے متعلق ہم چاہیں گے کہ بس وہ چشم زدن میں کرامت کے طور پر رونما ہو جائے، اور جب وہ اِس طرح رونما نہ ہو سکے گی تو ہمارے دل ٹوٹ جائیں گے۔ اس ذہنیت کے ساتھ ہم کبھی ان فطری اسباب کو فراہم کرنے کی کوشش کریں گے ہی نہیں جن سے وہ کیفیات یا کم از کم اس نوعیت کی کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ ملیے اور مل کر کام کیجیے اور مل کر اس راہ میں مصیبتیں اُٹھائیے۔ پھر اس طرز کی رفاقت کا ظہور نہ ہو تو البتہ آپ کو حق ہے کہ اِس خدمت کی انجام دہی کے لیے معجزے کی شرط لگائیں اور پھر اپنے خدا سے مطالبہ کریں کہ اگر یہ خدمت ہم سے لینا چاہتا ہے تو معجزے صادر کرے۔

اس سلسلے میں سوچنے والے اکثر جو غلطیاں کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس کام میں جن جن چیزوں کی کمی محسوس کرتے ہیں، ان کا ذکر کچھ اس انداز سے کرنے لگتے ہیں کہ گویا ان ساری کمیوں کو پورا کرنا اور تمام ضروری چیزوں کو مہیا کر دینا کسی اور کا کام ہے اور خود ان پر اس باب میں کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔ حالاں کہ درحقیقت یہ کسی ایک شخص کا انفرادی کاروبار نہیں ہے بلکہ ہم سب کا مشترک کام ہے اور اس میں کوئی شخص بھی محض چند خامیوں کی نشان دہی اور چند چیزوں کی ضرورت ظاہر کر کے اپنے فرض سے سبک دوش نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خود اس کمی کو پورا کرنے اور اس چیز کو مہیا کرنے میں اپنے حصے کی خدمت انجام نہ دے جس کی ضرورت وہ بیان کر رہا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاول وثانی ۶۳ھ، مئی جون، ۴۴ء)

مخالفتیں اور مزاحمتیں:

سوال: میں اپنے حالات مختصراً پیش کرتا ہوں۔ مجھے بتلایئے کہ کون سا ایسا طریق کار اختیار

کروں کہ میرے اسلام میں فرق نہ آئے۔

۱۔ والدین اُٹھتے بیٹھتے اصرار کررہے ہیں کہ ملازمت پر واپس چلا جاؤں۔ بحالت موجودہ وہ نہ صرف اپنا بلکہ خدا کا نافرمان بھی گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف ایسے وقت پر والدین کی نافرمانی جائز ہے جب وہ یہ کہیں کہ خدا کو نہ مانو۔ باقی تمام اُمور میں والدین کا حکم شرعی طور پر واجب التعمیل ہے۔ عن قریب وہ اعلان کرنے والے ہیں کہ نوکری پر چلا جاؤں تو بہتر، ورنہ میرا ان سے کوئی تعلق نہ رہ سکے گا۔ بس وہ اتنی رعایت مجھے دیتے ہیں کہ اگر میں مستقل طور پر ملازمت اختیار کرنا نہیں چاہتا تو کم از کم سال ڈیڑھ سال اور اختیار کیے رکھوں، حتیٰ کہ میرے چھوٹے بھائی بی اے کرلیں اور میری خالی جگہ کو پُر کرسکیں۔ اس سلسلے میں گناہ وہ اپنے سر لیتے ہیں۔

۲۔ ادھر عوام میں میری بے اثری بڑھ رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ذوق وشوق سے دوران ملازمت میں میری بات سنا کرتے تھے یا حمایت کا دم بھرا کرتے تھے، اب وہ ختم ہورہا ہے۔ بلکہ میری باتوں کا ان پر اُلٹا اثر ہوتا ہے۔

۳۔ بڑے بھائی بتلاتے ہیں کہ اگر نوکری حرام ہے تو زمین داری کون سی حلال ہے۔ ہماری زمین سرکار (ایک ریاست) نے ہمارے آباواجداد کو بخشش کے طور پر دی تھی۔ وہ تو تمھارے نظریے کی رُو سے حلال آمدنی قطعاً نہیں دے سکتی۔ علاوہ بریں اسلام میں زمین دار سسٹم سرے سے ناجائز ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے دادا نے اپنی جائداد بروئے شریعت تقسیم نہیں کی تھی۔ ان کی وراثت صرف نرینہ اولاد میں چلی ہے اور مستورات کو محروم رکھا گیا ہے۔ پھر نوکری کو حرام کہنے کے بعد ایسی جائداد پر کوئی شخص کیسے بسر اوقات کرسکتا ہے؟

۴۔ مسلمانوں کی اکثریت جہالت اور شرک میں مبتلا ہے۔ قبروں پر حاجات لے کر جانے اور نہ جانے کا سوال بہت اہمیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس سلسلے میں اگر مصلحتاً سکوت کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حق کو قبول کرنے کے ساتھ لوگ شرک کرنے کی گنجایش کو بھی بحال رکھیں۔ یوں بھی مصلحت اندیشی تابکے، آخر بھانڈا پھوٹتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہو کے رہتا ہے کہ ہم قبروں پر جاکر حاجات طلب کرنے کے خلاف ہیں۔ جہاں یہ بات کھلی بس فوراً ہی آدمی کو وہابی کا سرٹیفکیٹ ملا اور کسی کو وہابی قرار دینے کے بعد لوگ اس کی بات سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس سے بدکنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ بلوریں عقائد کے اس محل پر پتھر نہ پھینک مارے جس کی تعمیر میں ان کے

آباو اجداد نے پسینے بہائے ہیں اور جس کی حفاظت میں عمریں گزار دی گئی ہیں۔ میں بھی اسی خدشے کا ہدف بن رہا ہوں۔

جواب: آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ اب اسی مرحلے پر پہنچ گئے ہیں جس سے میں نے آپ کو یہاں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ میں اس معاملے میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کیا رویہ اختیار کریں۔ اس کا فیصلہ آپ کو بالکل اپنے قلب وضمیر کی آواز پر کرنا چاہیے اور اپنی ہمت کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ بہر حال جو فیصلہ بھی آپ کریں، ٹھنڈے دل سے کریں اور خدا سے دعا مانگتے رہیں کہ آپ کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں جس کے بعد پسپائی کی نوبت آئے۔ پسپا ہونے سے اقدام نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

فیصلے کو آپ کے اپنے ضمیر پر چھوڑنے کے بعد میں صرف ان دلائل کا جواب دیے دیتا ہوں جو آپ کے مقابلے میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) عذاب وثواب کوئی کسی کا نہیں اُٹھا سکتا۔ ہر شخص اپنے عذاب وثواب کا خود حامل ہے۔ میرے کہنے سے اگر آپ کوئی گناہ کریں تو میں کہنے کا گناہ گار ہوں گا اور آپ کرنے کے گناہ گار ہوں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے کرنے کا گناہ بھی کہنے والے کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور آپ اس وجہ سے چھوڑ دیے جائیں کہ آپ نے دوسرے کے کہنے پر گناہ کیا تھا۔

(۲) والدین کی فرماں برداری صرف اسی حد تک ہے جس حد تک ان کی فرماں برداری سے خالق کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ اگر وہ کسی معصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کرنا صرف یہی نہیں کہ فرض نہیں ہے بلکہ الٹا گناہ ہے۔

(۳) جس فعل کو آپ خود معصیت سمجھتے ہیں، اسے ڈیڑھ یا دو سال تک صرف اس لیے کرتے رہنا کہ خاندان کا ایک اور فرد آپ کے بجائے اس معصیت کے لیے تیار ہو جائے، بالکل ایک غلط فعل ہے۔ اگر آپ اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو آپ کی یہ دلی خواہش ہونی چاہیے کہ نہ صرف آپ خود اس سے بچیں بلکہ خدا کا ہر بندہ اس سے محفوظ رہے۔

(۴) یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں زمین داری سرے سے ناجائز ہے۔ البتہ ہندوستان[1] میں زمین داری کی بعض شکلیں ایسی ضرور رائج ہو گئی ہیں جو جائز نہیں ہیں۔ اگر شرعی طریقے پر آپ

---

[1] موجودہ برعظیم ہند وپاکستان

زمین داری کریں اور ناجائز فائدے اٹھانے سے بچیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۵) جو جائداد کسی شخص کو آباو اجداد سے ملی ہو، اس کی سابق تاریخ دیکھنے کا شریعت نے اسے مکلّف نہیں کیا۔ اس معاملے میں قرآن کا قانون گزشتہ پر گرفت نہیں کرتا بلکہ حال اور مستقبل کی اصلاح ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جب وہ جائداد اس کی ملکیت میں آئے، اس وقت سے وہ اس میں شرعی طریقے پر تصرف کرے اور سابق میں جن لوگوں نے اس کو غلط طریقے سے حاصل کیا تھا اور اس میں غلط تصرفات کیے تھے، ان کے معاملے کو خدا پر چھوڑ دے۔ البتہ اگر کوئی چیز آپ کے قبضے میں ایسی ہو جس کے بارے میں آپ کو متعین طور پر معلوم ہو کہ اس میں فلاں فلاں لوگوں کے غصب شدہ حقوق شامل ہیں اور وہ لوگ بھی موجود ہوں، نیز ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو، تو اپنی حد تک ان کے حقوق واپس کر دیجیے۔

(۶) ملازمت کے زمانے میں آپ کے ذاتی اور خاندانی اثر کی بدولت جو لوگ آپ کا اثر قبول کر رہے تھے، وہ حقیقت میں دین کی دعوت سے متاثر نہیں ہو رہے تھے، بلکہ وہ جاہ و مال کے بت کی پوجا کر رہے تھے۔ اور آیندہ بھی اگر آپ اس پوزیشن پر رہیں تو یہ دھوکا نہ کھائیے گا کہ لوگوں کو آپ خدا پرست بنا رہے ہیں۔ سچے خدا پرست تو وہی لوگ ہوں گے جو آپ کی دنیوی پوزیشن کو دیکھ کر نہیں بلکہ آپ کی دعوت کی سچائی اور آپ کے تقویٰ کو دیکھ کر متاثر ہوں گے۔ میرے نزدیک تو آپ صحیح معنوں میں دعوت حق کے داعی اسی وقت بنیں گے جب تمام اعزازات آپ سے چھن جائیں، زمین آپ کو جگہ دینے سے انکار کر دے اور وہ سب جو کل تک آپ کے سامنے جھکے پڑتے تھے، آپ کو ردّ کرنے اور آپ سے منہ پھیرنے پر اُتر آئیں۔ یہ صورت حال ہے تو بہت خطرناک لیکن اس راہ میں یہی کچھ مفید ہے۔ اگر خدا نے آپ کو اتنی طاقت دی کہ آپ اسے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں تو اس کا حقیقی فائدہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا اور اسی وقت آپ کو اللہ تعالیٰ جھوٹے رفیقوں کی رفاقت سے بچا کر سچے رفیق بہم پہنچائے گا۔

(۷) عوام کے عقائد پر خواہ مخواہ باوّل وہلہ ضرب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن اپنے عقائد پر پردہ ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ''وہابیت'' کے الزام سے بچنے کا اہتمام نہ کیجیے۔ لوگوں نے درحقیقت مسلمان کے لیے یہ دوسرا نام تجویز کیا ہے۔ وہ گالی مسلمان کو دینا چاہتے ہیں، لیکن مسلمان کہہ کر گالی دیں تو اپنا اسلام خطرے میں پڑتا ہے، اس لیے وہابی کہہ کر گالی دیتے ہیں۔ اس

حقیقت کو جب آپ سمجھ جائیں گے تو پھر وہابی کے خطاب سے آپ کو کوئی رنج نہ ہوگا۔ جو عقائد اور جو اعمال مشرکانہ ہیں، ان سے بہر حال پرہیز کیجیے اور توحید کو اس کے اصلی تقاضوں کے ساتھ بے تکلف بیان کیجیے۔ شرک اور مشرکانہ باتوں سے پرہیز اور توحید اور مقتضیاتِ توحید کی پابندی اگر وہابیت ہے تو خدا اپنے ہر بندے کو وہابی ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور غیر وہابی ہونے سے بچائے۔

سوال: صوبہ جاتی اجتماع سے واپس آنے پر میں یکا یک ان پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوں جو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھیں۔ آپ کی شدید مصروفیات کا علم رکھنے کے باوجود ان احوال کا تفصیلی تذکرہ آپ ہی کے اس ارشاد کی بنا پر کر رہا ہوں کہ اس نوعیت کے اُمور سے آپ کو پوری طرح مطلع رکھنا ضروری ہے۔ خیر تو ۱۹ر اکتوبر کو والد مکرم کا جو گرامی نامہ موصول ہوا ہے، وہ لفظ بلفظ[1] درج ذیل ہے:

''برخوردارِ نورِ چشم..... بعد دعائے ترقی درجات کے واضح ہو کہ اب تم خود مختار ہو گئے ہو، ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں، کیوں کہ ہم مکان پر بیمار پڑے ہیں اور تم کو جلسوں[2] کی شرکت لازم اور ضروری۔ اب اللہ کے فضل سے نوکر ہو گئے ہو۔ ہم نے اپنی تمام کوشش سے تعلیم میں کامیاب کرایا اور اس کا نتیجہ پالیا۔ عالم باعمل ہو گئے کہ باپ کا حکم ماننا ظلم اور حکم خدا کے خلاف قرار پایا۔ اوروں کا حکم ماں باپ سے زیادہ افضل! خیر تمہاری کمائی سے ہم نے اپنی ضعیفی میں بڑا آرام پالیا۔ آیندہ ایک پیسا بھی ہم لینا نہیں چاہتے۔ جو تمہارا جی چاہے کرو اور جہاں چاہے رہو، خواہ سسرال میں یا کسی اور جگہ۔ البتہ ہم اپنی صورت اس وقت تک نہیں دکھلانا چاہتے جب تک جماعت سے استعفا نہ دے دو۔ تم نے برابر اس مراق میں (یعنی تحریک اسلامی کی خدمت میں) سب تعلیم کا کام خراب کر دیا۔ مگر ہمارا نصیحت کرنا بے کار ہے۔ بس یہ واضح رہے کہ ہمارے سامنے نہ آنا۔ ہمارا غصہ بہت خراب ہے۔ فقط۔''

والدِ مکرم کے اس خط کا جواب راقم الحروف نے یہ لکھ دیا:

''محترمی! کل آپ کا گرامی نامہ بدست..... موصول ہوا۔ اسے دیکھ کر اور آپ کی بیماری کا حال معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا۔ یقین جانیے مجھے خبر تک نہ تھی کہ آپ بیمار ہیں۔ نہ آپ نے کوئی

---

[1] خط کا کچھ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔

[2] اشارہ ہے جماعت اسلامی کے اجتماع کی طرف۔

خط لکھا نہ مجھے کسی اور ذریعے سے حال معلوم ہوا، ورنہ میں یقیناً وہاں نہ جاتا۔ یہ ایک عذرِ شرعی تھا جس کی بنا پر سفر کو ملتوی کیا جاسکتا تھا۔

والدین کے احسانات اور ان کی مہربانیوں کا کون انکار کرسکتا ہے۔ پھر آپ نے تو اعلیٰ تربیت کی اور دینی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اسی تعلیم سے مجھے یہ یقین حاصل ہوا کہ دین کو دنیا میں غالب کرنا، خدا کے کلمے کو بلند کرنا، دنیا میں اسلام کا سکہ چلانا اور اس کے لیے کوشش کرنا ہر مسلماں کا فرض ہے۔ میں نے گردو پیش کی دنیا پر نظر ڈالی اور مجھے ایک ہی جماعت اس مقصد کے لیے صحیح طریقے اور اصلی اور بہترین ڈھنگ سے کام کرتی ہوئی نظر آئی، اور وہ جماعت ''جماعتِ اسلامی'' ہے۔ اس لیے اگر مجھے دین کی دنیا میں غالب کرنے کے لیے کوشش کرنی ہے تو اس سے منسلک رہنا ضروری ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ دین کے غلبے کی کوشش اگر مسلمان کی زندگی کا مقصد نہیں تو پھر اور کیا مقصد ہے!

والدین کا حکم ماننا ضروری! ان کی اطاعت فرض! لیکن کہاں تک، جب تک خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر دین کو غالب کرنا ضروری ہے تو وہ کیا یوں ہی آرام سے بیٹھے ہوئے، بے ان تھک کوشش کیے ہوئے ہوسکتا ہے؟ کیا یہ کوئی بہت سہل کام ہے؟ کیا دین کے لیے اتنی قوت اور اتنا وقت بھی صرف نہیں کرنا چاہیے جتنا ہم اپنے پیٹ کے لیے کرتے ہیں؟ کیا یہ کام تنہا ایک آدمی کے کرنے کا ہے؟ بہرحال دین کے لیے جس جماعت میں بھی رہ کر کام کیا جائے گا، اس میں وقت بھی صرف ہوگا، مال بھی خرچ کرنا ہوگا، تکلیف بھی ہوگی، کچھ دنیوی کاموں کا حرج بھی ہوگا، اور کسی نہ کسی قوت سے تصادم کا ڈر بھی ہوگا اور آپ پھر منع فرمائیں گے۔ پھر اللہ! آپ ہی بتائیے کہ اس کام کی اور کیا صورت ہوسکتی ہے؟ آپ کی سرپرستی سے محروم ہوجانا میری انتہائی بدنصیبی ہے۔ لیکن یہ تو خیال فرمائیے کہ آپ کس چیز سے مجھے منع فرما رہے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے، کہیں یہ حکم خدا کے خلاف تو نہیں ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۔ [التوبہ 24:9]

''اے نبی ! فرما دیجیے کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے خاندان، تمہارے وہ اموال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمہاری وہ سوداگری جس میں گھاٹا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، اور تمہاری مرغوب آرام گاہیں تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں سرتوڑ کوشش کرنے کے مقابلے میں محبوب تر ہوں، تو انتظار کرو اس گھڑی کا کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے، اور یاد رکھو کہ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔''

میں سخت حیرت اور انتہائی افسوس کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ دین کے غلبے کے لیے جو کوشش میں کر رہا ہوں، اس پر آپ ناراض ہیں۔ آخر آپ ہی فرمائیے کہ اس صورت میں میرا فرض کیا ہے؟ مندرجہ بالا آیت کو ملحوظ رکھ کر سوچیے۔

حاضر ہونے کو جی چاہتا ہے مگر آپ کے عتاب سے خائف ہوں۔ دیکھیے آپ کیا اجازت فرماتے ہیں۔''

یہ جواب اس پس منظر کی بنا پر لکھا گیا تھا کہ والد صاحب وقت کی اضاعت، صرف مال اور خوفِ قوتِ متسلّطہ کی بنا پر جماعت میں کام کرنے سے منع کرتے ہیں، نیز یہ کہ ان کے اشارے پر..... سے ایک بہت مدلل قسم کا طویل و عریض خط آیا تھا، جس کا ماحصل یہ تھا کہ بہرحال حق و اسلام جماعت اسلامی میں منحصر نہیں، تنہا کام کیجیے یا کسی اور جماعت میں رہ کر۔

والد محترم کی طرف سے مجھے ابھی تک منقولہ بالا عریضے کا جواب نہیں ملا ہے۔ اندریں حالات مناسب ہدایات سے مستفید فرمائیے۔''

جواب: آپ نے والد کے عتاب پر جو جواب دیا ہے، وہ بہت معقول ہے۔ مسلمان کی زندگی ایک نہایت متوازن زندگی کا نام ہے جس میں تمام حقوق و فرائض کا مناسب لحاظ ہونا چاہیے اور کسی حق یا فرض کی اضاعت نہ ہونی چاہیے، اِلّا یہ کہ ایک حق کو دوسرے حق پر اس حد تک قربان کیا جائے جس حد تک ایسا کرنا شرعاً ضروری ہو۔ والدین کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے۔ لیکن بہرحال خدا کے حقوق کے بعد ہی، اس پر مقدّم کسی طرح نہیں ہے۔ پس جہاں خدا کا حق ادا کرنے کے لیے والدین کے حق میں کوئی کمی کرنا بالکل ناگزیر ہو وہاں موقع و محل کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھتے ہوئے صرف اس حد تک کمی کی جائے اور ساتھ ساتھ ان کے عتاب اور خشم کو نہایت تحمل اور

تواضع کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ان کی سختی کے مقابلے میں اف تک نہ کیجیے مگر جس چیز کو آپ اپنی دینی بصیرت کے مطابق دین سمجھتے ہیں اس سے والدین کو خوش کرنے کے لیے بال برابر بھی نہ ہٹیے۔اولاد پر والدین کی خدمت، اطاعت اور ادب فرض ہے لیکن ان کی خاطر ضمیر کی قربانی فرض نہیں ہے، خصوصاً اس ضمیر کی جو دین کی روشنی سے منور ہو چکا ہو۔

اس معاملے میں آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی متعدد صحابہ کرام کو یہ مشکل پیش آچکی ہے۔اس وقت حضورؐ کی رہنمائی میں صحابہ کرام نے اپنے ان والدین کے ساتھ جو راہِ حق میں کسی نہ کسی طرح مزاحم ہو رہے تھے، جو طرز اختیار کیا، اس کو ملحوظ رکھیے۔

سوال: ہمارے ہاں کے ایک نوجوان رکن جماعت اپنے بڑے بھائی کی زیر سرپرستی تجارت کر رہے ہیں۔لین دین میں احکامِ شریعت کی پابندی اور وقت پر نماز پڑھنے کے لیے چلے جانے کی بنا پر ان کے بڑے بھائی سخت برہم ہیں اور ان پر سختی کر رہے ہیں۔اب تک ان کے کئی خطوط میرے نام آچکے ہیں جن میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''تیری (یعنی راقم الحروف کی) وجہ سے میرا بھائی خراب ہو گیا ہے، اس پر دیوانگی طاری ہے، کاروبار میں اسے کوئی دل چسپی نہیں رہی، رات دن تیرا وظیفہ پڑھتا ہے، تو شیطان ہے، انسان کی شکل میں ابلیس ہے، ماں باپ اور اولاد میں اور بھائیوں میں جدائی ڈالتا ہے، میرے بھائی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھ، اس کے نام نہ خط لکھ نہ سہ ماہی اجتماع میں شرکت کی دعوت دے، بلکہ اس کو جماعت سے خارج کر دے ورنہ.....!'' اِس سلسلے میں مناسب ہدایات سے سرفراز کیجیے۔

جواب: جہاں خاندان کے لوگ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور راہِ راست پر چلنے میں اپنے بھائی بندوں کی مزاحمت کرتے ہوں، وہاں تو فی الواقع جدائی ڈالنا ہی ہمارا کام ہے۔ایسے اعزہ واقربا اور دوستوں سے اہل ایمان کو ملانا نہیں بلکہ توڑنا اور کاٹنا ہی ہمارے پیش نظر ہے۔لہٰذا جو الزام ہمارے رفیق کے بھائی نے آپ پر لگایا ہے، اس کی تردید کی ضرورت نہیں بلکہ صاف صاف اعتراف کی ضرورت ہے اور بہت نرمی کے ساتھ ان کو اس بات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ اس جدائی کو میل اور موافقت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو خدا پرستی اور دین داری میں مزاحم ہونے کے بجائے مددگار اور ساتھی بننے کی کوشش کریں، ورنہ ہم اور ہمارا رفیق اپنے طرزِ عمل پر

قائم رہیں گے اور آپ کو اختیار ہے کہ جو سلوک آپ کا نفس ہمارے ساتھ کرنا چاہتا ہے وہ کرے۔

البتہ یہ خیال رکھیے کہ آپ کی طرف سے کوئی بات ضد یا اشتعال دلانے والی نہ ہو، بلکہ صبر وتحمل کے ساتھ اس شخص کے نفس کی اصلاح کرنے کی کوشش کیجیے جس کو جاہلیت کے غلبے نے اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اس آیت کا مصداق بن گیا: ﴿اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْداً اِذَا صَلّٰی﴾

درحقیقت یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کو نماز کی پابندی تک گوارا نہیں ہے۔ خود پابندی کرنا تو درکنار، دوسرا اگر ایسا کرتا ہے تو اس پر بھی بگڑتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کی حالت پر اگر کبھی ہم تلخ تنقید کر جاتے ہیں تو ہمیں خارجیت کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

سوال: میں بغرضِ تعلیم اسی سال..... چلا گیا تھا۔ ڈاڑھی رکھ کر گھر واپس آیا تو تمام دوست واحباب نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ خود والد مکرم بھی بہ شدت مجبور کر رہے ہیں کہ ڈاڑھی صاف کرا دو، کیوں کہ اس کی وجہ سے تم بڑے بوڑھے معلوم ہوتے ہو۔ اگر اصرار سے کام لو گے تو ہم تم سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔ گھر سے نکلنے پر دوست بہت تنگ کرتے ہیں۔ اس لیے مجبوراً خانہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ اب چند اصحاب کی طرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ اگر آٹھ یوم میں ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا گیا یعنی ڈاڑھی نہ منڈوائی گئی تو تمام برادری سے متفقہ بائیکاٹ کرایا جائے گا۔ بڑی عمر میں بشوق رکھ لینا، مگر اب اگر تم رکھو گے تو زبردستی سے کام لیا جائے گا۔ میں ڈاڑھی کو پابندیِ احکام شریعت میں بہت مدد پاتا ہوں۔ مثلاً مجھے سینما بینی کا شوق تھا مگر ڈاڑھی رکھنے کے بعد سینما ہال میں جانے سے شرم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب مخالفین کے دلائل سنتا ہوں تو کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہی لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر پھر یہ جذبہ کام کرنے لگ جاتا ہے کہ چاہے پوری دنیا میری مخالفت پر اُتر آئے، میرے رویے میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔ لِلّٰہ میری رہنمائی کیجیے تاکہ مجھے اطمینان نصیب ہو۔

جواب: جب آپ نے سنت رسول سمجھ کر یہ کام کیا ہے تو پھر کسی کے اعتراض ومخالفت کی پروانہ کیجیے اور سب سے کہہ دیجیے کہ یہ ڈاڑھی رہنے کے لیے آئی ہے، جانے کے لیے نہیں آئی، اس کے ہوتے ہوئے اگر آپ میرے ساتھ تعلقات رکھ سکتے ہیں تو رکھیے، اور آپ کے لیے سنت رسول اس قدر ناقابلِ برداشت ہے کہ اس کی وجہ سے میرے ساتھ بھی تعلقات رکھنا ناگوار ہے تو بخوشی

قطع تعلق کر لیجیے، میرے لیے خدا اور رسولؐ کافی ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ رجب، شعبان ۶۴ھ۔ جولائی اگست ۴۵ء)

جذباتی اور غیر حکیمانہ طرز تبلیغ:

سوال: میں نے ایک طالب علم کو جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کی ترغیب دی اور زبانی طور پر بھی اس کو جماعت کے نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اب وہ اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو بالکل وقف کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس کا ماحول بھی اس کا دشمن ہو رہا ہے اور وہ بھی اس سے سخت بیزار ہے۔ اب اس کی خواہش یہ ہے کہ اپنے مقصد کی خاطر ہجرت کر کے دارالاسلام چلا جائے۔ اس کی والدہ بعض شرائط پر راضی ہو گئی ہیں مگر والد سے اجازت ملنے کی کوئی توقع نہیں۔ اس لیے اس نے مجھ سے استفسار کیا تھا کہ کیا والدین کی اجازت اور مرضی کے علی الرغم دارالاسلام ہجرت کر جاؤں؟'' میں نے اس کو جواب دے دیا ہے کہ ''مکہ سے مدینہ جانے سے قبل تمام مہاجرین نے اپنے والدین سے اجازت نہیں مانگی تھی۔'' اس کا دوسرا استفسار یہ تھا کہ ''کیا جماعت میری پشت پناہی پر آمادہ ہو گی؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں..... وہاں برے سلوک اور مصائب سے دوچار ہوں۔'' اس کے جواب میں میں نے اس کو لکھ دیا ہے کہ ''گو اس کے متعلق صاف صاف کچھ کہنا میرے لیے مشکل ہے، مگر اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ نظام باطل کے تحت ہزاروں روپے کی کمائی اور ساری دنیوی لذتیں نظام حق کی جدوجہد کی خاطر فقر و فاقہ کی زندگی کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ رسول عربیؐ کا اسوہ، جس کے اتباع کا ہم مسلمان دم بھرتے ہیں، ہم کو یہی بتاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود تم کو یقین رکھنا چاہیے کہ جماعت ہمیشہ اور ہر وقت ایسے لوگوں کی پشت پناہی پر آمادہ ہے جو نظام باطل سے بھاگ کر نظام حق کی طرف آ رہے ہوں۔ بلکہ وہ ایسے لوگوں کا خیر مقدم کرے گی بشرطیکہ وہ صرف حق پرست اور حق طلب ہو کر جا رہے ہوں۔''

اب ان امور کے متعلق براہِ راست آپ سے ہدایتیں مطلوب ہیں۔

اس سلسلے میں ایک چیز اور بھی سامنے آ گئی ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں ایک مدرسے میں معلم ہوں۔ جب میری ان تبلیغی سرگرمیوں کی اطلاع حکومت کے محکمۂ تعلیمات کو ملی تو اس نے مجھ سے چند سوالات کیے، جن میں مجھ سے جماعت کی حیثیت، اس کے مقاصد، امیرِ جماعت کی

شخصیت وغیرہ اُمور کی بابت استفسار کرتے ہوئے یہ جواب طلب کیا گیا ہے کہ تم ایک فرقہ وار جماعت کے رکن کیوں ہو اور فلاں طالب علم کو کیوں اس بات پر ورغلاتے ہو کہ وہ موجودہ نظام تعلیم کو ترک کر کے خلاف مرضی والدین و دیگر ممالک کو ہجرت کر جائے..... وغیر ذالک۔ فرمائیے اس مراسلے کا کیا جواب دوں؟ میرا ارادہ تو صاف صاف اظہارِ حق کا ہے۔

جواب: آپ نے یہ غلطی کی کہ لوگوں کو تبلیغ کی تیز خوراکیں دے کر ہجرت اور ترکِ علائق پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ میں صحیح پوزیشن کئی مرتبہ واضح کر چکا ہوں۔ ہم ابھی تک اس مرحلے میں نہیں پہنچے ہیں جب کہ مختلف مقامات سے اپنے سب ہم خیالوں کو ایک جگہ سمٹ آنے کی دعوت دے سکیں۔ نہ ہمارے پاس جگہ ہے، نہ ذرائع ہیں، نہ صحیح معنوں میں ایسا دارالاسلام بن گیا ہے جس کی طرف دارالکفر سے ہجرت کرنا ضروری ہو، اور نہ اُصولاً یہ بات صحیح ہے کہ ''مکی زندگی'' کی بھٹی سے اچھی طرح گزرے بغیر لوگ مجرد عقیدہ و نصب العین قبول کر کر کے کسی ایک مقام پر جمع ہونے لگیں۔ کیوں کہ اس طرح وہ مضبوط سیرت تو کبھی بن ہی نہیں سکتی جو ایک کافی مدت تک مخالف ماحول میں کش مکش کرنے اور استقامت دکھانے سے بنا کرتی ہے۔ لہٰذا اس وقت لوگوں کو ہجرت کی دعوت دینا ہمارے کام کے لیے اُصولاً غلط بھی ہے اور بے حد نقصان دہ بھی، اور اس پالیسی کے بھی خلاف ہے جس پر ہم اس وقت کام کر رہے ہیں۔

ہم اپنے مرکز کو ذرائع کی کمی اور مشکلات کے ساتھ بتدریج مضبوط بنا رہے ہیں اور اس مرحلے پر صرف ان لوگوں کو بلا رہے ہیں جن کی فی الواقع ہم کو ضرورت ہے۔ اِس تدریجی نقشے کے خلاف ایک زائد آدمی کا آجانا بھی ہماری مشکلات میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے۔ پھر ہماری کوشش یہ ہے کہ اس مرحلے پر ہم صرف آزمودہ آدمیوں ہی کو بلائیں جن کے متعلق ہمیں پوری طرح اطمینان ہو کہ وہ ساری اسکیموں میں ٹھیک ٹھیک مددگار ہو سکتے ہیں۔ ناآزمودہ آدمیوں کے بلا انتخاب جمع ہو جانے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے اشخاص کے اجتماع سے کام میں مدد ملنے کے بجائے اُلٹی خرابیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ جب تک میں اپنے نقشے کے مطابق ایک صحیح و مستحکم ماحول پیدا نہ کر لوں جس پر مجھے یہ اطمینان ہو کہ اب جو اس ماحول میں آئے گا وہ اس کے مزاج کے مطابق ڈھلتا چلا جائے گا، اس وقت تک میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ غیر معلوم الحال اصحاب بطورِ خود مرکز میں آ کر رہنا شروع کر دیں۔ سردست جو لوگ مرکز میں آنے کے امیدوار

ہوں، ان کو ایک کافی مدت تک اپنے ماحول میں رہ کر مشکلات کا مقابلہ کر کے، مخالفتوں کے مقابلے میں صبر واستقامت دکھا کر اپنی اس قابلیت کا ثبوت دینا چاہیے کہ وہ مرکز میں بلائے جانے کے لائق ہیں۔

اب اخلاقی جرأت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ خود ان نوجوان دوست کو لکھیں کہ آپ نے جو ہجرت کرنے کی ترغیب دی تھی وہ آپ کی غلطی تھی اور آپ سے یہ غلطی جماعتی پالیسی کے خلاف سرزد ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ آپ انہیں تلقین کیجیے کہ وہ ایک طرف اپنی دینی معلومات کو ضروری حد تک مکمل کرنے کی کوشش کریں اور دوسری طرف ہماری جماعت کے نام پر کوئی کام کرنے سے پہلے ہمارے لٹریچر کو اچھی طرح پڑھ کر ہمارے مسلک اور طریقِ کار کو سمجھ لیں، پھر اس کے مطابق اپنے ماحول میں ٹھیک ٹھیک کام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ نے عزیزِ موصوف کو ان کے والد کے علی الرغم ہجرت کرنے کی رائے دی۔ اوّل تو مکہ میں مشرک وکافر ماں باپ کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا، وہ بعینہٖ ان مسلمان ماں باپ کے معاملے میں اختیار کرنا درست نہیں ہے جو ہمارے نزدیک خواہ کتنی ہی غفلت وضلالت میں مبتلا ہوں مگر بہرحال ہیں مسلمان۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی مرحلے پر والدین کی اجازت کے بغیر، بلکہ ان کے حکم کے خلاف کوئی اقدام کرنا اولاد کے لیے جائز ہو بھی سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ امیر جماعت تمام شرعی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ایسا کرنے کا حکم دے۔ ایسے باضابطہ حکم کے بغیر کسی شخص کا بطورِ خود یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ وقت والدین کی نافرمانی کر گزرنے کا ہے، کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

عزیز موصوف کا جو خط براہِ راست میرے پاس آیا ہے، اس کو دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ جماعت کو، اس کے نظام کو، اور اس کے طریق کار کو بالکل نہیں سمجھے ہیں اور ان کے ذہن میں جماعت کی پوزیشن کا کچھ عجیب تصور قائم ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید اس جماعت نے اپنا کوئی اسٹیٹ قائم کر لیا ہے اور وہ اسٹیٹ بھی بڑا دولت مند ہے۔ اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ انہیں یہاں آنے کے مصارف ہم بھیجیں گے، یہاں ان کی ضروریات کی کفالت بھی ہم ہی کریں گے، اور ان کو سال میں دو مرتبہ گھر بھی ہم اپنے ہی خرچ پر بھیجتے رہا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس

تصور کو لیے ہوئے اگر وہ دارالاسلام آنے پر آمادہ نہ ہوتے تو اور کیا کرتے، اور اگر ہماری دعوت ایسی ہی فیاضانہ ہو تو نیک نیت اہل ایمان میں سے کس کو اپنی نوکری چھوڑ دینے یا مدرسے سے نکل آنے میں تامل ہو سکتا ہے۔ ان کی اس بات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپ کا طرزِ تبلیغ بہت خام ہے جس میں فہم کا عنصر کم اور جذباتی جوش کا عنصر زیادہ ہے، اسی وجہ سے ایسے لوگ جو ہمارے مسلک وطریق کار کو پانچ فی صدی بھی نہیں سمجھے ہیں، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمارے ساتھ آملنے کو پچانوے فی صدی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ براہ کرم اِس طرزِ تبلیغ کی اصلاح کیجیے، ورنہ جو پیچیدگی ان عزیز کے معاملے میں پیش آئی ہے، اس سے زیادہ آیندہ پیش آنے کا خطرہ ہے۔

یہ بات بھی اس سے پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ جب تک آپ سرکاری ملازمت میں ہیں، قواعد ملازمت کے اندر رہتے ہوئے کام کیجیے۔ اوّل تو کسی سے تنخواہ لینے کے بعد ان شرائط کی پابندی نہ کرنا جن کے تحت وہ تنخواہ دے رہا ہے، اخلاقی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ قواعد کے خلاف کام کریں گے اور اس کی پاداش میں برطرفی یا کسی اور قسم کی سزا پائیں گے تو اس سے آپ کی اخلاقی پوزیشن اُلٹی کمزور ہو جائے گی، حالاں کہ اس وقت نظام جاہلیت کے خلاف ہمارا سب سے بڑا اسلاحِ جنگ اگر کوئی ہے تو وہ اخلاق ہی ہے۔ اِس لیے آپ نے طالب علم مذکور کو جس طرز کی تبلیغ کی اور اس کی وجہ سے جو باز پرس آپ سے ہوئی، وہ ان ہدایات کے خلاف ہیں جو آپ کو مرکز سے دی گئی تھیں۔ اب آپ کو ان سوالات کے جواب میں جو آپ سے کیے گئے ہیں، بالکل سیدھے اور صاف طریقے سے صحیح صحیح بیان دینا چاہیے، لیکن جواب آپ کا سخت نہ ہونا چاہیے۔ زبان اور لب ولہجے میں پوری طرح معقولیت ہو۔ جو غلطی ہے اس کو غلطی تسلیم کر لیجیے اور آپ کی اور اس جماعت کی جو صحیح پوزیشن ہے اس کو بے تکلف بیان کر دیجیے۔

(ترجمان القرآن۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ ۶۴ھ۔ نومبر، دسمبر ۴۵ء)

عملی اسلام سے اجتناب کا مشورہ:

سوال: تحریک اسلامی سے مجھے بہت دل چسپی ہے مگر چند روز سے ایک اہم اعتراض دماغ میں چکر لگا رہا ہے، جسے آپ کے سامنے رکھ کر رہنمائی چاہتا ہوں کہ اگر مسلمان موجودہ طاغوتی نظام سے بالکل علیحدگی اختیار کر لیں تو ان کی حیثیت ہندوستان میں غلام یا اچھوت کی سی رہ جائے

گی۔پس کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ آپ جیسے اعلیٰ دماغ حضرات مسلمانوں کو اس نظام سے فائدہ اُٹھانے کی گنجایش دے کر ذہنی تربیت کا کام کرتے رہیں، تا آں کہ پوری مسلمان قوم کی ذہنیت ایک ہی طرزِ فکر کی حامل ہو جائے اور پھر موقع آنے پر وہ یک دم نظامِ حق کے لیے اُٹھ کھڑی ہو۔

اگر تمام مسلمان آپ کی تحریک اسلامی کے ساتھ ہو گئے ہوتے تب تو طاغوتی نظام میں جذب ہوئے بغیر کام یابی کا امکان تھا، مگر اب جب کہ مسلمانوں کی اکثریت تحریک اسلامی کے نام سے بھی واقف نہیں اور علما جن کا فرض ہی احیائے دین کی جدوجہد ہے، اس کو ناقابل عمل بتاتے ہیں، نظام باطل سے کٹ کر کام یابی حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ پھر کیا آپ اس پر متفق نہیں ہوں گے کہ ابھی آپ صرف تبلیغی کام کرتے رہیں اور جب بالعموم مسلمانوں کے ذہن تحریک اسلامی کو سمجھنے لگیں اس وقت عملی کام کا آغاز کیا جائے؟

جواب: آپ کا مطلب جہاں تک آپ کے خط سے سمجھ میں آیا ہے، یہ ہے کہ موجودہ حالات میں صرف زبانی تبلیغ تقریر و تحریر اور مضامین و رسائل کے ذریعے سے جاری رکھی جائے، اور جن اُصولوں کی تبلیغ کی جائے ان پر نہ خود عمل کیا جائے نہ دوسروں کو ان پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے، پھر جب سارے مسلمانوں کے ذہن ہمارے خیالات سے متاثر ہو جائیں تب دفعتاً اُٹھ کر انقلاب پیدا کر دیا جائے۔

خیال تو بہت بے ضرر اور بے خطر ہے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ تبلیغ اور انقلاب کی فطرت اس کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ مؤثر اور نتیجہ خیز تبلیغ ہوتی ہی اس وقت ہے جب کہ تبلیغ کرنے والی پارٹی اپنے اُصولوں پر عمل کرتی ہے اور ان پر عمل کرنے والوں کی تنظیم کرتی ہے۔ خالی خولی وعظ تو بہت دنوں سے اس ملک میں ہو رہے ہیں۔ ان کا کیا نتیجہ ہوا؟

یہ عجیب معاملہ ہے کہ کچھ لوگ تو ہم کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ تم لکھتے اور چھاپتے ہو، کوئی عملی قدم نہیں اُٹھاتے، اور کچھ آپ جیسے لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ صرف لکھو اور چھاپو، مسلمانوں کو عمل کرنے کے خطرے میں کیوں ڈالتے ہو۔ ہماری درخواست یہ ہے کہ ان طعنوں اور مشوروں سے پہلے لوگ یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم اپنی دعوت اور طریقِ دعوت دونوں میں حضرات انبیائے کرام کے پیرو ہیں۔ اس وجہ سے جس کو ہمیں کوئی مشورہ دینا ہو یا ہم پر اعتراض کرنا ہو، وہ اپنے مشورے اور اعتراض پر حضرات انبیا کے قول اور عمل کی دلیل پیش کرے۔ صرف مصلحت بازی اور خیال آرائی یا

اندیشہ سازی ہماری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی، پس بہتر ہے کہ لوگ ہمیں اس سے معاف رکھیں۔ (ترجمان القرآن، ربیع الثانی ۶۵ھ، مارچ ۴۶ء)

اسلام بلا جماعت:

سوال: جو شخص آپ کی جماعت کے اُصولوں کے مطابق اپنی جگہ حتی المقدور صحیح اسلامی زندگی بسر کر رہا ہو، وہ اگر بعض اسباب کے ماتحت باقاعدہ جماعت میں شریک نہ ہو تو اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: اس کے متعلق میرا وہی خیال ہے جو احادیث سے ثابت ہے کہ صحیح اسلامی زندگی جماعت کے بغیر نہیں ہوتی۔ زندگی کے صحیح اسلامی زندگی ہونے کے لیے سب سے مقدم چیز اسلام کے نصب العین (اقامتِ دین حق) سے وابستگی ہے۔ اس وابستگی کا تقاضا ہے کہ آدمی نصب العین کے لیے جدوجہد کرے۔ اور جدوجہد اجتماعی طاقت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جماعت کے بغیر کسی زندگی کو صحیح اسلامی زندگی سمجھنا بالکل غلط ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص ہماری اس جماعت میں شامل نہ ہو اور کسی اور ایسی جماعت سے اس کا تعلق ہو جو یہی نصب العین رکھتی ہو اور جس کا نظام جماعت اور طریق جدوجہد بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو۔ اس صورت میں ہم اس کو برسرِ ہدایت ماننے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ لیکن یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ آدمی صرف ان طریقوں کی پابندی پر اکتفا کرتا رہے جو شخصی کردار کے لیے شریعت میں بتائے گئے ہیں اور اقامت دین کی جدوجہد کے لیے کسی جماعت سے وابستہ نہ ہو۔ ہم ایسی زندگی کو کم از کم نیم جاہلیت کی زندگی سمجھتے ہیں۔ ہمارے علم میں اسلامیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اگر آدمی کو اپنے گردوپیش ایسی کوئی جماعت نظر نہ آتی ہو جو اسلام کے اجتماعی نصب العین کے لیے اسلامی طریقے پر سعی کرنے والی ہو تو اسے سچے دل سے ایسی ایک جماعت کے وجود میں لانے کی سعی کرنی چاہیے اور اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ جب کبھی ایسی جماعت پائی جائے، وہ اپنی انانیت چھوڑ کر ٹھیک ٹھیک جماعتی ذہنیت کے ساتھ اس میں شامل ہو جائے[1]۔

(ترجمان القرآن۔ جمادی الاولیٰ ۶۵ھ۔ اپریل ۶۴ء)

---

[1] اِس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو ''شہادت حق'' از مصنف۔

جماعت اسلامی کے متعلق چند شبہات:

سوال: جماعت اسلامی کی دعوت پر کچھ سنجیدہ اصحاب کی طرف سے حسب ذیل اعتراضات کیے گئے ہیں، براہِ کرم اپنے جوابات سے آگاہ فرمائیں:

۱۔ جماعت اسلامی کی تحریک سے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ بن جائے گا۔ اس خطرے کا کیا سدّباب کیا گیا ہے؟

۲۔ یہ تحریک محمد بن عبدالوہاب نجدی ہی کی تحریک ہے۔ جب آپ کے ساتھ اچھی خاصی جمعیت ہو جائے گی تو آپ کا رویہ بھی ابن عبدالوہاب ہی کی طرح کا ہوگا۔

۳۔ آپ بزرگان دین کا احترام بھی نہیں کرتے۔ سلف کے جن حضرات نے بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں، ان کی کارگزاریوں پر آپ قلم پھیر دینا چاہتے ہیں اور خود کو ان سے بہتر کام کرنے کا اہل پاتے ہیں۔

۴۔ آپ ارکانِ جماعت اسلامی کے سوا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں۔

جواب: (۱) میں اپنی حد تک انتہائی احتیاط کر رہا ہوں اور میرے رفقا بھی خدا کے فضل سے اس معاملے میں چوکنّے ہیں کہ ہماری یہ جماعت مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ نہ بننے پائے۔ اگرچہ ہم سے اختلاف کرنے والوں میں ایک گروہ یہ دلی خواہش رکھتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہم سے اس نوعیت کی کوئی غلطی سرزد ہو جائے، تاکہ اصلاح کی بہت سی پچھلی کوششوں کی طرح ہماری اس کوشش کو بھی خاک میں ملایا[1] جا سکے۔ لیکن الحمدللہ ہمارے اندر وہ بیماریاں موجود نہیں ہیں جن کی بِنا پر نئے فرقے بنا کرتے ہیں۔ ہم اس فتنے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے بس میں ہے ہم اس خطرے کا سدِّ باب کر رہے ہیں۔ لیکن شیطان کی شرارتوں کا ایسا کامل سدّ باب کہ اسے کسی طرح گھس آنے کا موقع نہ ملے، انبیا علیہم السلام بھی نہ کر سکے تو ہم کیا چیز ہیں کہ اس میں پوری طرح کامیاب ہونے کا دعویٰ کر سکیں۔ بندے کا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اپنی حدِّ امکان تک کوشش کرے اور آگے کے لیے اللہ سے دعا مانگے۔[2]

---

[1] بلکہ بعض لوگ تو غلطی کے صدور کا انتظار کرتے کرتے جب تھک گئے تو وہ زبردستی ہم کو ایک فرقہ قرار دینے پر تل گئے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اُن کا غیظ تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ معلوم نہیں آپ کے ''سنجیدہ اصحاب'' کن لوگوں میں شامل ہیں۔ غلطی کے صدور کا انتظار کرنے والوں میں؟ یا بلا صدور ہی حکم چسپاں کر دینے والوں میں؟

[2] اِس اعتراض کا زیادہ تفصیلی جواب شہادتِ حق میں دیا گیا ہے۔

(۲) ہمارے لٹریچر اور کام کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی شخص اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ ابن عبدالوہاب نجدی کی تحریک ہے یا آگے چل کر وہی کچھ بن جائے گی تو وہ اپنی رائے کا مختار ہے۔ ہم کسی شخص کو رائے رکھنے کے اختیار سے محروم نہیں کر سکتے اور ہمارے پاس اس قسم کی فضول بحثوں کے لیے وقت بھی نہیں ہے۔

(۳) میں تمام بزرگانِ دین کا احترام کرتا ہوں، مگر پرستش ان میں سے کسی کی نہیں کرتا، اور انبیا کے سوا کسی کو معصوم بھی نہیں سمجھتا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں بزرگان سلف کے خیالات اور کاموں پر بے لاگ تحقیقی وتنقیدی نگاہ ڈالتا ہوں۔ جو کچھ ان میں حق پاتا ہوں اسے حق کہتا ہوں، اور جس چیز کو کتاب وسنت کے لحاظ سے یا حکمت عملی کے اعتبار سے درست نہیں پاتا اس کو صاف صاف نادرست کہہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی غیر نبی کی رائے یا تدبیر میں خطا پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عظمت وبزرگی میں کوئی کمی آئے۔ اس لیے میں سلف کی بعض رایوں سے اختلاف کرنے کے باوجود ان کی بزرگی کا بھی قائل رہتا ہوں اور میرے دل میں ان کا احترام بھی بدستور باقی رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ بزرگی اور معصومیت کو ہم معنی سمجھتے ہیں، اور جن کے نزدیک اُصول یہ ہے کہ جو بزرگ ہے وہ خطا نہیں کرتا، اور جو خطا کرتا ہے وہ بزرگ نہیں ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بزرگ کی رائے یا طریقے کو نادرست قرار دینا لازمی طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ ایسا خیال ظاہر کرنے والا ان کی بزرگی کا احترام نہیں کرتا اور ان کی خدمات پر قلم پھیرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اس مقام پر بھی نہیں رکتے، بلکہ آگے بڑھ کر اس پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان سے بڑا سمجھتا ہے۔ حالاں کہ علمی معاملات میں ایک شخص کا دوسرے کی رائے سے اختلاف کرنا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ جس سے اختلاف کر رہا ہو، اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا بھی سمجھے اور اس سے بہتر بھی۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے بکثرت معاملات میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور ظاہر ہے، کہ یہ اختلاف یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ مختلف فیہ معاملات میں اپنی رائے کو صحیح اور امام صاحب کی رائے کو غلط سمجھتے تھے۔ لیکن کیا اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ دونوں حضرات امام ابوحنیفہؒ کے مقابلے میں اپنے آپ کو افضل سمجھتے تھے؟

(۴) یہ الزام کہ ہم ارکان جماعت اسلامی کے سوا باقی سب مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں، اگر

ہماری ان تمام تحریرات کو پڑھنے کے بعد لگایا گیا ہے جو ہم نے اس الزام کی تردید میں بار بار لکھی ہیں، تو اس کا جواب صبر کے سوا نہیں ہے[1]۔ آخر سارے معاملات کا فیصلہ اسی دنیا میں تو نہیں ہو جانا ہے، کوئی عدالت آخرت میں بھی تو قائم ہوگی۔ (ترجمان القرآن۔ رجب ۶۵ھ۔ جون ۴۶ء)

ہمہ گیر ریاست میں تحریکِ اسلامی کا طریق کار:

سوال: یہ بات تو اب کسی مزید استدلال کی محتاج نہیں رہی کہ ایک مسلمان کے لیے، بشرطیکہ وہ اسلام کا صحیح شعور حاصل کر چکا ہو، صرف ایک ہی چیز مقصد زندگی قرار پا سکتی ہے، اور وہ ہے حکومت الٰہیہ کا قیام۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صرف وہی طریقِ کار اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس کی فطرت سے عملاً مناسبت رکھتا ہو اور جو اس کے اصلی داعیوں نے عملاً اختیار کیا ہو۔ حکومت الٰہی کے نصب العین کے داعی انبیائے کرام ہیں۔ اس لیے طریقِ کار بھی وہی ہے جو انبیا کا طریقِ کار ہو۔

انبیا کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں فی الجملہ دو قسم کے پیغمبر دکھائی دیتے ہیں:

ایک تو وہ جن کی دعوت کے ظہور کے وقت اسٹیٹ ایک منظّم اور مؤثر طاقت کی حیثیت سے سوسائٹی میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اور اکثر حالات میں وہ ایسا اسٹیٹ ہوتا ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ کلّی طور پر شخص واحد میں مرکوز ہوتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔

دوسرے وہ جن کا واسطہ ایک ایسی سوسائٹی سے پڑتا ہے جس میں اسٹیٹ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور زیادہ سے زیادہ سرقبیلی (Patriachal) قسم کا اسٹیٹ تھا۔ جیسے خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم۔

دونوں صورتوں میں طریق کار کا اختلاف نمایاں ہے جو غالباً اسی سیاسی اختلاف احوال کا نتیجہ ہے۔

لیکن جتنی جامعیت اور ہمہ گیری اسٹیٹ نے اب حاصل کر لی ہے اور جس طرح اس نے آج کل فرد کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور جتنی منظّم و مؤثر اور مضبوط طاقت، فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس نے اب اختیار کر لی ہے، اس کی مثال شاید پچھلی تاریخ میں نہ مل سکے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہی طریق کار جو تقریباً غیر ریاستی (Stateless) سوسائٹی یا حد سے حد سرقبیلی حکومت میں کام یاب طور پر استعمال کیا گیا تھا، اب بھی اس قسم کی کام یاب کا

---

[1] یہ تحریریں اِس کتاب میں بھی موجود ہیں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ تفہیمات حصہ دوم میں ملیں گی۔

ضامن ہوسکتا ہے؟ کیا آج کل کے بدلے ہوئے حالات میں اسی مقصد کے لیے کام کرنے والی پارٹی کو اپنا فنِ انقلاب انگیزی کافی حد تک بدلنا پڑے گا؟

خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظّم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے برعکس حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظّم اسٹیٹ تھا۔ چنانچہ انہوں نے جب قوت متسلطہ (Sovereign Power) کو اقتدار منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْض کہہ کر اقتدار سنبھال لیا، اور اس طرح اپنا مشن پورا کرنے کے لیے پہلے کے قائم شدہ اسٹیٹ کو استعمال میں لے آئے۔ موجودہ زمانے کا اسٹیٹ حضرت یوسف علیہ السلام کے عہد کے اسٹیٹ سے کہیں زیادہ جامع، ہمہ گیر اور منظّم ہے۔ اس کو اکھیڑ کر ایک نیا اسٹیٹ وجود میں لانے کے لیے جو انقلاب بھی ہوگا، اس کا راستہ خون کے لالہ زاروں سے ہو کر گزرے گا۔ جیسا کہ بالشویک روس میں ہوا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اسلام محض توڑ پھوڑ قسم کا انقلاب نہیں چاہتا، بلکہ اس کا پروگرام کچھ زیادہ نازک ہے۔ ان حالات میں تو زیادہ موزوں طریقہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ بجائے کلی انقلاب کے جتنا کچھ اقتدار حاصل ہو سکے، اسے قبول کر کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ اگر اس پوزیشن کو قبول کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ملک کی موجودہ مسلمان جماعتوں کے خلاف کوئی کارروائی درست نہیں ہوگی، بلکہ تائید بھی ضروری ہو جائے گی۔

یہ بات واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتدار سے مراد سول سروس کے مناصب نہیں، جیسا کہ کسی نواب صاحب نے ترجمان کی ایک اشاعت میں یوسف علیہ السلام کے سلسلے میں فرمایا ہے، بلکہ ایک منظّم جماعت کی جدوجہد کے بعد جماعتی حیثیت سے قوت حاکمہ (Sovereign Power) سے اختیارات لے کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا مراد ہے۔

جواب: بلاشبہ ایسی حالت میں جب کہ غیر اسلامی اسٹیٹ ہمہ گیر ہو، اس حالت کی بہ نسبت جب کہ فاسد سماجی نظام بالکل ابتدائی نوعیت کا ہو، بہت کچھ فرق واقع ہو جاتا ہے، اور اس کے لحاظ سے طریق کار میں بھی کم از کم صورت کے لحاظ سے تغیر کرنا ضروری ہے۔ لیکن اُصولی حیثیت سے طریق کار میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اُصولی طریقِ کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظّم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلے پر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ موجود

الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی ومعاشی نظام کو اپنے اُصول پر ڈھال سکیں گے، تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے، اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریقِ کار (Method) سے۔ لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہرِ اقتدار (Substance of Power) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۶۴ھ۔ ستمبر، اکتوبر ۴۵ء)

وقت کے سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک:

سوال: اس وقت مسلمانانِ ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں: اوّل کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنل ازم کی تحریک جسے لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روحِ اسلامی سراسر مفقود ہے۔ ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش'' کے مطالعے سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کر لے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے۔ اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مرادف ہے۔ اس کے مقابلے میں لیگ کی تحریک اگرچہ غیر اسلامی ہے، لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے۔ لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہم دردی کریں؟ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم درپیش[1] ہے اور یہ فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کام یاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پر زبردستی مسلّط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۴۶ء کے انتخابات کی طرف۔

ووٹ پر منحصر ہے۔ایسی صورت میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمایندے کھڑے کریں؟

جواب: آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے۔اس لیے آپ کو صرف دو ہی فتنے نظر آئے جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں۔ حالاں کہ اگر آپ ذرا وسیع نگاہ سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی فتنے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر ہجوم کیے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتاب اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اس کے اتباع سے منہ موڑتی اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی چراتی ہے۔اس سزا سے اگر مسلمان کبھی بچ سکتے ہیں تو صرف اس طرح کہ اپنے اس اصلی و بنیادی جرم سے باز آجائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مسلّط ہوئے ہیں اور اس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر انہیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے منہ موڑتے ہیں تو پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں، یقین جانیے کہ کسی ایک فتنے کا بھی سدّ باب نہ ہوگا بلکہ ہر تدبیر چند اور فتنے قائم کر دے گی۔

آپ نے جو سوال پیش کیا ہے، اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں، تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آیندہ اِس سلسلے میں کوئی اُلجھن پیش نہ آئے۔

اوّل یہ کہ جماعت اسلامی کے مقصدِ قیام کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی تدابیر سے ان کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے، نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اُصول بھی چلتے نظر آئیں، ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالم گیر اور ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں، اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بزرگان خدا (جن میں ہندوستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت ان اُصولوں کی پیروی میں دے دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس مسئلے اور اس کے اِس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری

چیز سے قطعاً کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ جو شخص ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو، اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیت خاطر کے ساتھ اس شاہ راہ پر قدم جمائے چلتا رہے۔ اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یک سوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں، اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر ان طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں آج رائج ہیں، ان کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخاب یا آیندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اُصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بِنا پر ہم ان اُصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ کافرانہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیتِ جمہور کے اُصول پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں، یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے، جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو، اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے، اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے۔ اگر ہندوستان کے علما اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہوں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم تر بن گئی ہوں، تو اس کی جواب دہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس اصولی مسئلے میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلیوں میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملے میں صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا

زوراس اُصول کے منوانے میں صرف کردیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اُصول نہ مان لیا جائے، ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔ (ترجمان القرآن۔ رمضان، شوال ۶۴ھ۔ ستمبر، اکتوبر ۴۵ء)

مزدوروں کی ہڑتالوں میں جماعت اسلامی کی پالیسی:

سوال: آج کل ملک میں ہڑتالوں کا دور دورہ ہے۔ ہم لوگ جو جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں اور محنت پیشہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ایسے موقع پر کیا روش اختیار کریں جب کہ ہمارے کارخانے یا محکمے میں ہڑتال ہو؟

جواب: سرِ دست اس معاملے میں ہماری پالیسی یہ ہے:

(۱) جو مزدور یا محنت پیشہ لوگ ہمارے مسلک سے متاثر ہوں وہ ہڑتال کے زمانے میں کام پر تو نہ جائیں لیکن ہڑتالوں کے ہنگاموں اور مظاہروں سے بھی الگ رہیں۔

(۲) جن مطالبات کے لیے ہڑتال کی گئی ہو، ان کے متعلق یہ رائے قائم کریں کہ آیا وہ منصفانہ ہیں یا غیر منصفانہ۔

(الف) منصفانہ مطالبات کو تمام جائز و معقول اور پُرامن طریقوں سے تسلیم کرانے میں حصہ لیں مگر کسی فساد اور جھگڑے میں حصہ نہ لیں۔

(ب) غیر منصفانہ مطالبات کے معاملے میں اپنے ہم پیشہ ہڑتالیوں سے صاف کہہ دیں کہ ہم تمہارے مطالبات کو صحیح نہیں سمجھتے، لیکن ہم قصداً تمہاری ہڑتال کو ناکام بنانے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتے، اس لیے جب تک تم کام پر نہ جاؤ گے ہم بھی نہیں جائیں گے۔

(ج) اگر مطالبات کا کچھ حصہ منصفانہ اور کچھ حصہ غیر منصفانہ ہو تو ہڑتالیوں اور مستاجروں (Employers) دونوں کو مطلع کردیں کہ ہم ان مطالبات کے اتنے حصے کو صحیح اور اتنے حصے کو غلط سمجھتے ہیں۔

(۳) جب کبھی کسی ہڑتال میں، یا مزدوروں کی کسی تحریک کے سلسلے میں سوشلزم کے نظریات کارفرما نظر آئیں، مثلاً مطالبات کی بنیاد یہ بیان کی جارہی ہو کہ طبقاتی جنگ ایک تاریخی تقاضا ہے، یا مقصد و نصب العین یہ پیش کیا جارہا ہو کہ تمام ذرائع پیداوار پر سے شخصی ملکیت ختم کردی جائے

اور انہیں قومی ملکیت بنادیا جائے، تو ایسے کسی موقع پر خاموش نہ رہنا چاہیے بلکہ ان نظریات کی کھلم کھلا تردید کرنی چاہیے اور مزدوروں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ نظریات بجائے خود بھی غلط ہیں اور ان میں تمہاری اپنی فلاح بھی درحقیقت مضمر نہیں ہے۔ ان کے بجائے زیادہ صحیح اُصول یہ ہیں جو اسلام پیش کرتا ہے۔ حقیقی انصاف اگر قائم ہوسکتا ہے تو ان اُصولوں پر ہی ہوسکتا ہے۔

آخرکار جو چیز ہمارے پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی تحریکیں اشتراکیوں کے زیر اثر نہ رہیں بلکہ ہمارے زیر اثر آجائیں، تاکہ ہم طبقاتی جنگ کے بجائے طبقاتی صلح اور مارکسی اشتراکیت کے بجائے اسلامی عدل کے اُصولوں پر محنت پیشہ طبقوں کو ان کے جائز حقوق دلوا سکیں۔ (ترجمان القرآن۔ رجب ۶۵ھ۔ جون ۴۶ء)

ملکی فسادات میں ہمارا فرض:

سوال: ہم ایک ہندو اسٹیٹ میں رہتے ہیں جہاں برطانوی ہند کے مقابلے میں کتنی ہی زائد پابندیاں عائد ہیں۔ محض نماز روزے کی آزادی ہے، اور یہ آزادی بھی برادران وطن کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ ان کو تو ہمارے نام سے نفرت ہے اور جو مسلمان جتنا ہی زیادہ پابندِ شرع ہے، وہ اتنا ہی زیادہ ان کے بغض کا مستحق ہے۔ ان حالات میں آپ کا کہنا کہ ''جماعت اسلامی کی پالیسی تو فسادات میں غیر جانب دار رہنے کی ہے''، اور یہ کہ ''یہ جماعت تو مظلوم کو مظلوم اور ظالم کو ظالم کہے گی اور بوقت ضرورت بے لاگ گواہیاں دے گی'' اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ چناں چہ میرے ایک دوست پوچھتے ہیں کہ کیا ہم اس وقت تک خاموش بیٹھے رہیں جب کہ ہمیں گواہی دینے کا موقع آئے؟ شہر میں فساد کے شعلے بھڑک اُٹھیں اور ہم بس یہ دیکھتے رہیں کہ کون کس پر ظلم کرتا ہے؟ پھر جو قوم صرف مسلمان کے نام کی دشمن ہے، وہ ایسے مواقع پر خود ہم پر ہاتھ اُٹھانے سے کب باز رہ جائے گی؟ وہ اس بات کا لحاظ ہی کیوں کرنے لگی کہ یہ فساد میں شریک نہیں ہیں، صرف تماش بین کی حیثیت رکھتے ہیں؟ نیز اگر میرے کسی مسلمان پڑوسی پر غیر مسلموں نے ظالمانہ طور پر حملہ کر دیا تو اسلامی نقطۂ نظر سے میرے لیے یہ جائز کیسے ہوسکتا ہے کہ خاموش بیٹھا رہوں اور اس کی جان بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں نہ ڈال دوں؟

موصوف یہ خیال کرتے ہوئے بطور خود کتاب وسنت کی روشنی میں اس کے دو حل بتاتے ہیں:

ایک تو یہ کہ اگر ہم مقابلے کی قدرت رکھتے ہوں تب تو اپنی مدافعت کی خاطر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ چوں کہ ہم اقلیت میں ہیں اس لیے ایسی جگہ ہجرت کر جائیں جہاں ہماری اکثریت ہو۔

اُمید ہے کہ آں جناب ان حالات میں ہماری مناسب رہنمائی فرمائیں گے۔ اِدھر ریاست کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں پچاس فی صدی بالکل جاہل اور آبا پرست اور پچیس فی صدی نیم خواندہ مگر پکے پیر پرست، بقیہ پچیس فی صدی تعلیم یافتہ مگر ان میں سے بیس علمِ دین سے کورے اور خانقاہیت سے متاثر، اور باقی پانچ دنیا کے بندے۔

جواب: آپ نے ریاست گوالیار کے مسلمانوں کی جو حالت لکھی ہے اس کو پڑھ کر افسوس ہوا، لیکن افسوس کرنے سے وہ حق ادا نہیں ہوتا جو ہم پر اور آپ پر عائد ہوتا ہے۔ بندگانِ خدا جس قدر زیادہ گمراہی اور اخلاقی پستی میں مبتلا ہوں، اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ ایک مومن پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے کوشش کرے۔

آپ نے جن صاحب کا سوال نقل کیا ہے، ان کی خدمت میں میری طرف سے عرض کر دیجیے کہ اگر سوال محض بیٹھنے اور تماشا دیکھنے کا ہوتا تو یقیناً میرا جواب کچھ اور ہوتا۔ میں نے جو جواب اس سے پہلے متوقع فساد کے سلسلے میں دیا تھا، وہ دراصل ان لوگوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دیا تھا جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی محض بیٹھ کر تماشا دیکھنے کے لیے نہیں بنی ہے۔

اس جماعت کے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ دنیا میں خیر و عدل کا نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اس جدوجہد میں یہ ضروری ہے کہ وہ قومی نفسانیتوں اور قومیت کے جھگڑوں سے الگ رہ کر خالص حق کے حامی وداعی کی حیثیت سے کام کریں۔ بلاشبہ عامۂ مسلمین کے ساتھ ان کا قومی تعلق ضرور ہے، اور اگر عام مسلمانوں اور ان کے غیر مسلم ہمسایوں کے درمیان فی الواقع دین کی بنا پر لڑائی ہو تو اس سے الگ رہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ مسلمان دین کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور نہ وہ کش مکش، جو ان کے اور غیر مسلموں کے درمیان برپا ہے، اس

کی بنیاد یا اس کا مقصود دین ہے۔ اس لیے ہم اِس کش مکش میں مسلمانوں کے مبتلا ہونے اور مظلوم یا ظالم بننے پر افسوس تو کر سکتے ہیں، لیکن اس میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔

ہماری یہ عدم شرکت اس معنی میں نہیں ہے کہ ہم محض تماش بین ہونے کی حیثیت سے بیٹھے دیکھتے رہیں گے، بلکہ ہم عملاً فسادیوں کو نیکی اور انصاف کی تلقین کریں گے، برائی سے روکیں گے، ظالم کی مخالفت کریں گے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں گے کہ ہم فی الواقع انصاف کے علم بردار اور بھلائی کے داعی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک شبہ اور باقی رہتا ہے، جس کو صاف کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہم خواہ کتنے ہی انصاف کے ساتھ غیر جانب دار بنیں لیکن جب کہ ہمارے نام، لباس اور معاشرت عام مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہیں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود بھی اِن مظالم کے اندر رہ کر ان بے انصافیوں کا تختۂ مشق بننے سے بچ جائیں جو کسی مقام کی غیر مسلم اکثریت غلبہ پانے کی صورت میں عام مسلمانوں پر کر رہی ہو؟

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اگر آپ کسی مقصد عظیم کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں تو اس جدو جہد کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی تمام قوتوں کو صرف اسی ایک مقصد کی خدمت کے لیے وقف رکھیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جو اس مقصد کو نقصان پہنچانے والا ہو۔ اس طرزِ عمل پر ثابت قدمی کے ساتھ قائم رہنے میں جو خطرات اور نقصانات بھی ہوں، بہر حال ان کو برداشت کرنا چاہیے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مسلمان کے لیے اس کے تحفظ کی کوئی گارنٹی اس کے اپنے اخلاق کے سوا نہیں ہے۔ عام مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس وقت جس حالت میں مبتلا کر لیا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے دین کے لیے جینا اور مرنا چھوڑ دیا ہے اور ان اخلاقِ فاضلہ سے بھی کنارہ کشی کر لی ہے جو اہلِ ایمان کے امتیازی اخلاق تھے۔ اسی چیز نے ان کو کمزور بھی کیا اور ان کے وقار کو بھی صدمہ پہنچایا۔ اب اگر اس حالت سے آپ نکل سکتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ انہی غلطیوں میں اور انہی کے نتائج میں اُلجھتے چلے جائیں جو اب تک ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ صرف اس طرح نکل سکتے ہیں کہ جس جس مسلمان کو بھی ہوش آتا جائے، وہ نفسانیت اور دنیا

پرستی سے بالاتر ہوکر دعوت الی الخیر کو اپنا مشغلۂ زندگی بناتا جائے، اور ان اخلاقِ فاضلہ سے اپنے آپ کو سنوارے جو داعیان حق کے شایانِ شاں ہوں۔ جو شخص بھی ایسا کرے گا وہ اپنے گردوپیش کے سارے انسانوں پر، خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں، اپنا ایسا اخلاقی وقار قائم کردے گا جو کسی پولیس یا فوج کی مدد سے قائم نہیں ہوسکتا۔

آپ کہتے ہیں کہ ہم ہندو ریاست میں ہیں اور قلیل التعداد ہیں اور وہاں مسلمانوں کے لیے کوئی عزت اور امن نہیں ہے۔ لیکن کیا آپ بھول گئے ہیں کہ اب سے آٹھ نو سو برس پہلے خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اجمیر کی ہندو ریاست میں جب آکر مقیم ہوئے تھے تو حالات اس سے بہتر تھے یا بدتر؟ اس وقت کس چیز نے ان کی حفاظت کی تھی؟

میرے برادرانِ دینی خواہ میری بات سنیں یا نہ سنیں، مگر میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ تمہارے لیے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہارا جو فرض ہے، اسے ادا کرو۔ (ترجمان القرآن۔ رمضان ۶۵ھ۔ اگست ۴۶ء)

قضیۂ فلسطین میں جماعت کا رویہ:

سوال: بعض اصحاب پوچھتے ہیں کہ فلسطین کی سیاست میں امریکا اور برطانیہ کی خودغرض واسلام دشمنی کے نتائج آشکارا ہیں۔ جماعت اسلامی نے اس معاملے میں کبھی اپنی پالیسی کا اظہار کیوں نہ کیا؟

جواب: ہم وقتی مسائل کو اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ اپنے اصل کام کو چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑ جائیں۔ ہمارے نزدیک برطانیہ اور امریکا سخت ظلم کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فلسطین کے معاملے میں انہوں نے بے انصافی کی حد کردی ہے۔ اہلِ فلسطین سے ہم دردی کرنا ہر انسان کا انسانی فرض ہے، اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ فرض کئی گنا زیادہ سخت ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہم دردی کریں۔ پھر فلسطین کا مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اگر خدا نخواستہ وہاں یہودی ریاست بن گئی تو اس سے مرکزِ اسلام (حجاز) کو بھی متعدد قسم کے خطرات لاحق ہوجائیں گے۔ اس معاملے میں دنیا کے مسلمان مدافعت کے لیے جو کچھ بھی کریں، ہم ان کے

ساتھ ہیں۔لیکن ہمارے نزدیک اصل مسئلہ فلسطین یا ہندوستان یا ایران باتر کا نہیں ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ کفر واسلام کی کش مکش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ صرف اس مسئلے پر صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہوگا، دوسرے مسائل کے حل ہو جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ (ترجمان القرآن، شوال ۶۵ھ، ستمبر ۴۶ء)

نظام اسلامی کے قیام کی صحیح ترتیب:

سوال: جن لوگوں سے پاکستان کے آیندہ نظام کے متعلق گفتگو ہوتی ہے وہ اکثر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ اور دوسرے اہلِ علم اسلامی حکومت کا ایک دستور کیوں نہیں مرتب کرتے تا کہ اسے آئین ساز اسمبلی میں پیش کر کے منظور کرایا جائے؟ اس سوال سے صرف مجھ کو ہی نہیں، دوسرے کارکنوں کو بھی اکثر وبیش تر سابقہ پیش آتا ہے۔ گو ہم اپنی حد تک لوگوں کو بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ آپ اس سوال کا جواب ترجمان القرآن میں دیں، تا کہ وہ بہت سی غلط فہمیاں صاف ہو سکیں جن پر یہ سوال مبنی ہے۔

جواب: آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مفصل جواب تو سر دست نہیں دیا جا سکتا، لیکن مختصر طور پر میں ایک بات عرض کروں گا جس سے امید ہے کہ آپ معاملے کی اصل حقیقت تک پہنچ جائیں گے۔

ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ جہاں نہ معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی ہو، نہ اخلاق اسلامی، جہاں کا سیاسی ومعاشی اور تعلیمی نظام بھی اب تک غیر اسلامی خطوط پر ترقی کرتا رہا ہو، اور جہاں ایک مجرد سیاسی تحریک کی بدولت ایک آزاد ریاست بننے کی یکا یک نوبت آ گئی ہو، وہاں اسلامی نظام کا قیام صرف اتنی سی بات پر اٹکا ہو کہ ہم ایک دستور مرتب کر کے پیش کریں اور برسر اقتدار لوگ اُسے لے کر نافذ کر دیں۔ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ گمان کرے کہ ایک مدرسے یا ایک بنک کو ہسپتال بنا دینے میں بس اتنی کسر ہے کہ چند ڈاکٹر مل کر ایک اچھے ہسپتال کا خاکہ مرتب کر دیں اور وہ مدرسے کے معلّمین یا بنک کے اسٹاف کو دے دیا جائے، تا کہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سارا کام کرتے چلے جائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے خاصے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سادگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ شاید دستور کو انہوں نے کوئی تعویذ سمجھا ہے!

واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے وہ اسلام کے معاملے میں اتنے مخلص اور اپنے ان وعدوں کے بارے میں جو انہوں نے اپنی قوم سے کیے تھے، اتنے صادق ہوں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جو اہلیت ان کے اندر مفقود ہے اسے خود محسوس کر لیں اور ایمان داری کے ساتھ یہ مان لیں کہ پاکستان حاصل کرنے کے بعد ان کا کام ختم ہو گیا ہے اور یہ کہ اب یہاں اسلامی نظام تعمیر کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو اس کے اہل ہوں۔ اس صورت میں معقول طریق کار یہ ہے کہ پہلے ہماری دستور ساز اسمبلی ان بنیادی اُمور کا اعلان کرے جو ایک غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے اُصولاً ضروری ہیں (جنہیں ہم نے اپنے ''مطالبہ'' میں بیان کر دیا ہے)، پھر وہ اسلام کا علم رکھنے والے لوگوں کو دستور سازی کے کام میں شریک کرے اور ان کی مدد سے ایک مناسب ترین دستور بنائے، پھر نئے انتخابات ہوں اور قوم کو موقع دیا جائے کہ وہ زمامِ کار سنبھالنے کے لیے ایسے لوگوں کو منتخب کرے جو اس کی نگاہ میں اسلامی نظام کی تعمیر کے لیے اہل ترین ہوں۔ اس طرح صحیح جمہوری طریق پر اختیارات اہل ہاتھوں میں بہ سہولت منتقل ہو جائیں گے اور وہ حکومت کی طاقت اور ذرائع سے کام لے کر پورے نظام زندگی کی تعمیر جدید اسلامی طرز پر کر سکیں گے

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور و ارادے کو بتدریج اس حد تک نشو و نما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔

ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں۔ اگر اس میں ہم کام یاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جدوجہد کی تھی، وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل ترین اور قریب ترین راستہ ہمارے ہاتھ آ گیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی، تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہو گا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں، اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی

اسلامی نقطۂ نظر سے اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقے پر کام شروع کر دیں گے جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔

امید ہے کہ اس توضیح سے لوگ ہماری پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔ ہم کوئی کام وقت سے پہلے نہیں کرنا چاہتے۔ سرِ دست ہم نے اسلامی نظام کے بنیادی امور کو ایک مطالبے کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اگر اسے قبول کر لیا جائے تو دستور سازی کے کام میں جس حد تک ممکن ہوگا، ہم پوری مدد کریں گے۔ لیکن اگر سرے سے یہ بنیادی امور ہی برسر اقتدار لوگوں کو منظور نہ ہوں، تو پھر دستور کا خاکہ پیش کرنے سے آخر کیا فائدہ متصور ہے؟ (ترجمان القرآن، ذی القعدہ ۱۳۶۷ھ، ستمبر ۱۹۴۸ء)

.....☆☆☆.....

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہمہ جہت، نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ آپ بیک وقت مفسر، محدث، محقق، مدبر، منتظم، مفکر، متکلم اسلام اور غلبہ دین کے لیے عظیم الشان جدوجہد کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ بانی جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے نے آسان اور عام فہم لٹریچر کے ذریعے اسلام کو عقلی دلائل اور قرآن وسنت کی روشنی میں ایک قابل فخر تہذیب اور انسانی معاشروں کے لیے ایک منفرد نظام زندگی کے طور پر پیش کیا۔ اسلام کو دل نشین، مدلل اور جامع انداز میں پیش کرنے کی جو خداداد صلاحیت سید ابوالاعلیٰ مودودی کو حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ آپ کی تصانیف و تالیفات بین الاقوامی زبانوں میں ترجمہ ہوکر مقبولیت عامہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان تحریروں کی بدولت کتنے ہی دہریت اور الحاد کے علم بردار اسلام کے نقیب بنے ہیں۔

رسائل و مسائل 2011-1965

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی دینی و علمی بصیرت کا مخالف، موافق، ہر شخص معترف ہے۔ احکام اسلامی کو صحیح شکل میں جدید حالات پر منطبق کرنے کی جو خداداد صلاحیت آپ کو حاصل ہے اس کی مثال عصر حاضر میں مشکل سے ملے گی۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جدید دور کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے میں آپ کا جو ممتاز مقام ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔

رسائل و مسائل --- اسلامی احکام کو جاننے اور سمجھنے کے لیے بہترین کتاب ہے اس میں ہر سوال کی تسلی بخش جواب ملے گا۔

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۳۔ کورٹ سٹریٹ لوئر مال، لاہور ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان